کاروانِ زندگی

حصّہ پنجم ۵

مصنّف کی سرگزشتِ حیات (آپ بیتی) کا پانچواں حصّہ جس میں دسمبر ۱۹۹۰ء سے دسمبر ۹۳ء تک کے اہم واقعات وحالات، تحریکات وسرگرمیاں، ملّتِ اسلامی ہندی کے وجود اور اُس کے ملّی تشخّص کے بقا وتحفّظ کے لئے پیدا ہونے والے خطرات، اُن کے مقابلہ کے لئے دینی جماعتوں، اور باحمیّت اہلِ فکر کی کوششوں کی روداد، اُن کے دلوں کی دھڑکنوں اور دماغوں کی خلشوں کی تصویر، بیرونی ممالک کے سفروں اور علمی وادبی مجالس کی شرکت کی روداد، بابری مسجد کے قضیہ کے نتیجہ میں ہولناک فرقہ وارانہ فسادات کی جھلکیاں

اس اہم تاریخی دور کا (جس پر یہ حصّہ مشتمل ہے) ایک ایسا واقعاتی وتحلیلی جائزہ — جس سے اس دور کے ہندوستان کا کوئی مؤرخ بے نیاز نہیں ہوسکتا

مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنی ندوی

باردوم

۱۴۱۵ھ ــــ ۱۹۹۴ء

کتابت ــــــــــ ظہیر احمد کاکوروی

طباعت ــــــــــ نظامی پریس لکھنؤ

صفحات ــــــــــ ۳۵۸

قیمت ــــــــــ 60/=

طابع وناشر

مکتبۂ اسلام ۱۷/۵۴ ۲ محمد علی لین
گوئن روڈ۔ لکھنؤ

فہرست عناوین

(کاروانِ زندگی حصۂ پنجم ۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ والصّلاۃ والسّلام علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ناظرین کے سامنے "کاروانِ زندگی" کا پانچواں حصّہ آرہا ہے، کتاب کی چوتھی جلد بھی مصنّف نے معذرت کے ساتھ، اور بعض اضطراری لیکن جائز تقاضوں اور ملک و عہد کے متعدّد واقعات و حقائق اور اُن کے ردِّ عمل و تأثّرات کو محفوظ کردینے کی ضرورت کی بنا پر پیش کرنے کی جرءت کی تھی۔

کتاب کے پیش لفظ میں لکھا تھا کہ:۔

"زیادہ تر تاریخ کی کتابیں ایک لگے بندھے نظام کے ماتحت واقعات نویسی پر اکتفا کرتی ہیں، اور ان کو اس لحاظ سے "عُرفی" و "اصطلاحی" تاریخ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، اُن کے مطالعہ سے اس عہد اور ماحول کے لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں، دماغوں کی خلشیں اور روحوں کے اضطرابات معلوم نہیں کئے جاسکتے، ان مسائل و مصائب اور محسوس کئے جانے والے خطرات سے بھی آگاہی نہیں ہوسکتی، جنھوں نے اس عہد اور ملک کے باشعور اور صاحبِ ضمیر طبقہ کی نیند حرام کررکھی تھی، اور اس کو مسلسل اضطراب میں

بتلا کر دیا تھا، نہ اس کی روئیداد مل سکتی ہے کہ انھوں نے اس صورتِ حال کا کس طرح مقابلہ کیا، اور اس میں کیا اور کس طرح کی تبدیلی لانے کی کوشش کی، یہ "عرقی" تاریخیں اپنی فنّی اور موضوعی قدر و قیمت کے باوجود اس دور کی ذہنی و فکری، اخلاقی و نفسیاتی، اور شعوری و جذباتی عکّاسی سے قاصر ہیں، نہ اُن کے مصنّفین نے اس کا دعویٰ کیا ہے اور نہ اس کو اپنے فرائض میں سمجھتے تھے"۔[1]

مصنّفِ کتاب نے اس کے بعد لکھا تھا کہ :۔

"جہاں تک زمانۂ قدیم کا تعلق ہے، دلوں کی یہ دھڑکنیں، دماغوں کی یہ خلشیں، روح کی بیتابیاں، اس صورتِ حال کا مقابلہ یا مداوا کرنے کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جا رہے تھے، اور کیا جدّ و جہد کی جا رہی تھی؟ اس سب کا اگر کچھ اندازہ ہو سکتا ہے تو اس طرح کہ اس عہد کی معتبر تاریخوں کے ساتھ بزرگانِ دین کے ملفوظات بھی پڑھے جائیں، اُن کی مجالس کے موضوعِ گفتگو اور اُن کے تأثّرات بھی معلوم کئے جائیں، اگر اس عہد کے لکھے ہوئے روزنامچے اور آپ بیتیاں بھی مل سکیں (جو نادر الوجود ہیں) تو اُن کا بھی مطالعہ کیا جائے، بزرگانِ دین اس زمانہ اور ماحول کے حسّاس و درد مند، اور جری و دلیر اہلِ فکر اور اہلِ قلم کی باہمی خط و کتابت اور اُن کے مراسلات پر بھی نظر ڈالی جائے، اسی طرح حسّاس اور صادق البیان سیّاحوں کے سفرنامے بھی پڑھے جائیں جن میں صرف قابلِ دید

[1] پیش لفظ و عرضِ حال "کاروانِ زندگی" حصّہ چہارم صفحہ ۱۰-۱۱

مقامات کی سیر و سیاحت اور اپنے اعزاز و استقبال کی روئیداد نہ ہو، اس عہد، ملک یا شہر کی تصویر کشی اور وہاں کے رہنے والوں کی ترجمانی بھی ہو، اس سب کو ملا کر اس عہد یا ماحول کا صحیح تخیّل اور اس کی تصویر سامنے آسکتی ہے، جو گذر گیا ہے، اور جس میں زندگی اپنی تمام خصوصیات، اطمینان و بے چینی، پسندیدگی و ناپسندیدگی اور اتفاق و محاذ آرائی کے ساتھ موجود تھی، اور اس سب کو سمجھے اور اس کے ساتھ انصاف کئے بغیر کسی عہد یا ماحول کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی، اور نہ اس کے سمجھنے کا دعوا کیا جاسکتا ہے[1]۔"

جہاں تک ہمارے اس عہد کا تعلق ہے، اس میں ان ذرائع معلومات و تأثرات میں جو عہدِ قدیم کے سلسلہ میں دستیاب نہیں ہوسکتے ہیں، اخبارات و رسائل، عمومی جلسوں کی کارروائیوں اور تقریروں اور خانگی مجالس کی گفتگوؤں، تنقیدوں اور جذبات کے اظہار کا اضافہ کیا جاسکتا ہے (بشرطیکہ وہ تحریری طور پر محفوظ یا ان کے ریکارڈ موجود ہوں) لیکن ناظرین کو معلوم ہے کہ یہ ذرائع معلومات و تأثرات اکثر ضائع و تلف ہو جاتے ہیں یا اوراق پارینہ کے ڈھیر میں (اگر ان کو ردّی کہنے سے احتراز کیا جائے) نذرِ آتش یا غرقِ دریا کر دیئے جاتے ہیں۔

اس حقیقت و ضرورت کے پیش نظر "کاروانِ زندگی" کی اس پانچویں جلد کا لکھنا اور اس کے ذریعہ سے اس عہد کی تصویر کا پیش کرنا زیادہ ضروری اور اہم تھا، جو ۱۹۹۰ء کے آخری مہینہ ڈیڑھ مہینے (نومبر، دسمبر ۱۹۹۰ء) سے شروع ہو کر ۱۹۹۳ء

[1] ایضاً ص۱۱-۱۲

کے اختتام تک جاتا ہے کہ ان تین سو برسوں میں ہندوستان اور ہندوستان سے باہر ایسے واقعات، حوادث، اور مسائل و مصائب پیش آئے جن کا تاریخ میں محفوظ ہو جانا اور اُن کے (کم سے کم باحمیت اور حقیقت پسند مسلمانوں کے حلقہ میں) ردِّ عمل اور امکانی جدّوجہد کی مختصر روئیداد کا آجانا ضروری تھا، ورنہ اندیشہ تھا کہ آئندہ نسل ہی نہیں، اسی عہد و نسل کے افراد بلکہ مؤرخ و مصنّف بھی اس سے ناواقف، اس کی اہمیّت سے بے خبر، اور تحریکوں کے قائد و رہنما، اُن سے سبق حاصل کرنے اور فائدہ اٹھانے سے اور ان واقعات کی روشنی میں کام کرنے سے قاصر و بیگانہ رہیں گے، اس لئے اس عہد کی صحیح عکّاسی (اپنے روشن اور تاریک پہلوؤں کے ساتھ) ضروری تھی، اور معذرت و شرمندگی کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ یہ کام تاتاریوں کے اسلامی حکومتوں اور تمدّن و علم کے مرکزوں پر وحشیانہ حملے، ممالک عربیہ و مقاماتِ مقدّسہ پر جنگ صلیبی کی متعصّبانہ و سفّاکانہ یورش، یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء میں برّصغیر ہند پر ایک پردیسی اور ایک مخالف مذہب و تہذیب رکھنے والی استعماری طاقت (برطانیہ) کے قبضہ اور وحشیانہ اور منتقمانہ کارروائیوں اور نسل و ثقافت کشی (RELIGIOUS & CULTURAL GENOCIDE) کی کوششوں کے بارے میں بھی وہ بولتا ہوا بلکہ روتا ہوا ریکارڈ کسی تاریخی کتاب میں نہیں ملتا جو اس کے بعد لکھی گئیں، ان سب وجوہ کی بنا پر ضرورت تھی کہ ۹۱-۱۹۹۳ء کی سرگزشت اور مثبت و منفی کوششوں اور ردِّ عمل کی تصویر، بلکہ دل کی دھڑکنیں اور چہروں کا اُتار چڑھاؤ بھی تحریری و تاریخی شکل میں آجائے۔

جہاں تک مصنّفِ کتاب کا تعلق ہے، اس نے اس موضوع پر ایک تاریخی کتاب لکھنے پر "کاروانِ زندگی" کے نام سے "سوانح حیات" قلم بند اور پیش کرنے کو ترجیح دی،

اس لئے کہ جیسا کہ اس نے "کاروانِ زندگی" کے پہلے حصّہ کے پیش لفظ میں لکھا ہے :-

"بہت سے موضوع، واقعات و حوادث، ادارے و تحریکات، اشخاص اور جماعتیں ہیں، جن کو صرف اپنی سوانح اور سرگزشت میں سمیٹا جا سکتا ہے، اگر ان پر مستقلاً روشنی ڈالی جائے، تو ہر ایک کے لئے الگ کتاب کی ضرورت ہے، پھر اس کی مؤرّخانہ ذمّہ داریاں اور تصنیفی آداب ایسے ہیں، جو ایسے بہت سے حقائق اور مغز کی بات کو سامنے آنے نہیں دیتے، جو "آپ بیتی" اور خود نوشت سوانح میں بے تکلّف آ سکتے ہیں، اس طرح ایک فرد کی سوانح (اگر وہ کسی خیالی دنیا میں نہیں رہتا اور خدا نے اس کو حالات و ماحول کا شعور بھی عطا فرمایا ہے، اور اس سے متأثر ہونے کی صلاحیت بھی اور اس کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے کی لیاقت بھی) اس عہد کا مرقّع اور بولتی ہوئی تصویر بن جاتی ہے، اور اس میں ایک مؤرخ اور مصنّف کو بعض اوقات وہ کام کی باتیں مل جاتی ہیں جو عرفی تاریخوں اور پُرجلال سوانح عمریوں میں نہیں ملتیں۔"[1]

ان معذرتوں، مصلحتوں، وجوہِ جواز، بلکہ ادائے فرض کے تقاضہ اور احساس کی بنا پر، عمر کی پیش رفت، صحت کی کمزوری، مصروفیتوں اور سفروں کی کثرت کے ساتھ "کاروانِ زندگی" کے حصّۂ پنجم کے لکھنے کی جرأت کی گئی، اور اس کو قارئین، مصنّفین و مؤرخین اور دین و ملّت اور ملک کی حفاظت و خدمت کی فکر رکھنے والوں اور اس کے لئے جدّ و جہد کرنے والوں کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے کہ شاید وہ اس کے ذریعہ

---

[1] "کاروانِ زندگی" حصّۂ اول صفحہ ۱۱

کچھ حقائق و تجربات سے آشنا ہو سکیں، جو ان کے لئے اپنے کام کے میدانوں میں مفید اور چشم کشا ثابت ہوں۔

وَمَا التَّوفِيقُ اِلَّا بِاللّٰہ

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ حسنیؒ

۱۶/۷/۱۴۱۴ھ
۳۰/۱۲/۱۹۹۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہمارا معاشرہ کوہ آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہے

۱۹۹۰ء ختم ہو رہا تھا، اور ۱۹۹۱ء کی آمد آمد تھی لیکن ملک کے حالات، رُجحانات اور سروں پر منڈلانے والے خطرات بلکہ زیادہ بگڑنے والی صورتِ حال کی کھلی علامات میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا، اس لئے کہ اس طویل و عریض ملک میں (جس نے زمانۂ ماضی میں ایک اہم تاریخ ساز کردار ادا کیا تھا) حالات کی بہتری کی کوئی علامت نظر نہیں آرہی تھی، جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ملک اور اس کی آبادی سے مُخلصانہ اور بے لوث محبّت اور سیاسی، اقتصادی اور جماعتی مفادات سے بالاتر ہو کر اس کو بچانے کی کوئی فکر کہیں نظر نہیں آرہی تھی، راقم کا ذہن اپنی ساری علمی و دینی مصروفیتوں اور کاوشوں اور غالب ذوق (تقریراً و تحریراً اور اُردو و عربی دونوں زبانوں میں دینی دعوت اور حفاظت و خدمتِ انسانیت کے موضوع پر اظہار خیال کے) باوجود اپنے ذہن و فکر کو اس صورتِ حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے اور اس کی طرف ملک کے صاحبِ ضمیر افراد اور ذمّہ داروں کو متنبّہ کرنے کے فریضہ سے فارغ نہیں سمجھ سکا۔

۱۲ ر دسمبر ۱۹۹۰ء کو دہلی میں حکومت کے زیرِ سرپرستی ہندوؤں اور مسلمانوں کے

ایک مشترک طبقہ کی طرف سے ایک جلسہ ہونے والا تھا، راقم بعض موانع کی بنا پر اس میں عملی شرکت نہیں کر سکا، لیکن اس نے ایک مضمون لکھ کر بھیج دیا جس کو عزیزی ڈاکٹر محمد یونس نگرامی (چیرمین اردو اکیڈمی لکھنؤ) نے پڑھ کر سنایا جس کا عنوان تھا "ہمارا معاشرہ کوہ آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہے" اس کے چار بنیادی اسباب بیان کئے گئے اور کہا گیا کہ جب تک اُن کا ازالہ نہیں کیا جائے گا یہ صورتِ حال قائم رہے گی۔

۱۔ فرقہ وارانہ منافرت۔ ۲ ظلم وسفّاکی ۔ ۳۔ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والوں، اس کے مقابلہ میں صف آرا (CONFRONT) ہو جانے والوں، اور اس کو روکنے کے لئے ہر طرح کا خطرہ مول لینے والوں کی کمی، خاص طور پر اس موقع پر مذہبی پیشواؤں کا میدان میں نہ آنا اور حالات سے مقابلہ نہ کرنا۔ ۴۔ حکومت اور اقتدار کو ہر ذریعہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرنے اور اس کے لئے ہر اصول و معیار اور صداقت و انصاف کو قربان کر دینے کا مزاج، پھر انتخاب (ELECTIONS) کا وہ طریقہ جس میں ہر اصول اور اخلاق کو پسِ پشت ڈال کر اور ملک کے مفاد کو نظر انداز کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کی حمایت وتائید (SUPPORT) حاصل ہو سکے۔

آخر میں کہا گیا کہ میں بغیر کسی معذرت کے صاف کہتا ہوں کہ میں ملکی اور بین الاقوامی تاریخ کا طالب علم اور ایک حقیر مصنّف ہوں، میں نہیں سمجھتا کہ ہمارا ہندوستانی معاشرہ کبھی ایسے خطرہ سے دوچار ہوا ہو جیسا کہ اس دور میں (۳۰-۳۵ برس کے اندر) ہوا ہے، اس وقت جو اصل خطرہ کی چیز ہے، وہ اردو کے ایک شاعر کے اس شعر کے مطابق (جو مولانا آزاد کو بہت پسند تھا) یہ ہے ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے — کہ زندگی ہی عبارت ہے تیرے جینے سے

خلیج کی جنگ اور صدام حسین کی مُہم جوئی

ملک کے اور عالمِ اسلام کے حالات اسی طرح چل رہے تھے جس کی تصویر اور اس پر تأثرات "کاروانِ زندگی" کی چوتھی جلد میں پیش کئے گئے، اپنی ساری سیاسی، اقتصادی، انتظامی و تعلیمی پست حالی اور مسائل و مشکلات کے ساتھ ہندوستان کی ملّتِ اسلامیہ کے چند افراد اسٹیج اور دینی و اصلاحی اداروں اور مجلسوں کی طرف سے اب بھی احترامِ انسانیت، تحفّظِ جان و مال، بقائے باہم کی دعوت دے رہے تھے، اور ظلم و جارحانہ کارروائیوں کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے کہ اچانک اسلامی دنیا ہی میں نہیں، اس محدود و مختصر عربی دنیا میں (جہاں سے دنیا کو صدیوں کے بعد ایسے واضح اور طاقتور طریقے پر احترامِ انسانیت، عدل و مساوات اور ایثار و انصاف کا پیغام ملا تھا جس نے دنیا کی تاریخ کو ایک نیا موڑ اور نسلِ انسانی کو ایک نیا دور عطا کیا تھا) ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہندوستان میں ملّتِ اسلامیہ کے افراد اور اُن میں خاص طور پر احترامِ انسانیت، عدل و مساوات اور ایثار و قربانی کی دعوت دینے والوں کی نہ صرف نگاہیں نیچی کر دیں، سر جھکا دیئے، بلکہ زبانوں کو بولنے کے قابل بھی نہیں رکھا۔

یہ ۲ر اگست ۱۹۹۱ء کو عراق کے (جو نہ صرف ایک عرب اور مسلم ملک ہے بلکہ وہ خلافتِ اسلامی، علومِ اسلامیہ، اسلامی تہذیب کا صدیوں مرکز رہا ہے اور روحانیت و اعلیٰ اخلاق کے مایۂ صد فخر و مستحق عقیدت مشائخ و روحانی پیشواؤں کا مولد و مدفن ہے) کویت پر قبضہ کر لینے اور اس کے ساتھ وہ معاملہ کرنے کا واقعہ ہے جو ایک فاتح اور

غارت گر طاقتور ملک ایک ایسے کمزور ملک کے ساتھ کرتا ہے، جن دونوں کے درمیان، مذہب، زبان، تہذیب اور تعلقات کا کوئی رشتہ نہ ہو، اسی کے ساتھ اس کا بھی خطرہ پیدا ہو گیا اور اس کی بعض علامتیں بھی ظاہر ہوئیں کہ وہ حجاز مقدس کی طرف بھی کوئی فوجی اقدام کرے اور حکومت سعودیہ سے ٹکر لے۔

اس خطرہ اور اس کے نتائج کی ہولناکی کو خاص طور پر اس واقف و باخبر دینی حلقہ نے محسوس کیا جو عالم عربی میں پیدا ہونے والی پچھلی تحریکات اور خاص طور پر قومیت عربیہ (جو البعث العربی کے نام سے معروف ہے) کی تحریک کی تاریخ، اس کے محرکات اور مقاصد اور اس کے فکری سرچشموں سے واقف تھا،[۱] اور جس کو یہ خطرہ تھا (جو اس تحریک کے مقاصد اور اس کے عیسائی قائدین و مفکرین کے بیانات سے واضح ہے) کہ اگر یہ اقدام کامیاب اور جاری رہا تو وہ اسلام کے مرکز اوّلین اور اس کی دعوت کے سرچشمہ، ممالک عربیہ ہی نہیں حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب کو عرب کی اس جاہلیت اولیٰ کی طرف لے جانے کا (لاقدّر اللہ) پیش خیمہ ہو گا، جس میں کفر و ایمان، توحید و تثلیث، دین حنیف (اسلام) اور عیسائیت و یہودیت کا کوئی امتیاز و فرق نہیں تھا، اور اس میں بھی کوئی تعجب کی بات نہ ہو گی کہ وہ اپنی کامیابی کے بعد جاہلیت عربیہ کے ناموروں اور ابطال (HEROES) کو سربلند و نمایاں بنائے اور ان پر فخر کرنا سکھائے اور بات یہاں تک بڑھ سکتی ہے کہ حج کرنے کی آزادی بھی خطرہ میں پڑ جائے (یا حاکم بدہن) نہ صرف منیٰ و عرفات بلکہ خود مکہ معظمہ میں عرب کی قدیم

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنّف کی کتاب "عرب قوم پرستی اسلامی نقطۂ نظر سے خطرناک کیوں؟" شائع کردہ "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" ندوۃ العلماء لکھنؤ، ستمبر ۱۹۶۷ء۔

تاریخ اور دورِ جاہلیت کی کچھ مٹی ہوئی یادگاریں سامنے لائی جائیں، اور یہ بات تو بالکل قرینِ قیاس تھی کہ صدّام حسین کامیابی حاصل کرنے کے بعد مکّہ معظّمہ یا اس کے جوار میں اس طرح اپنے مجسّمے (اسٹیچو) نصب کرا دے جیسے بغداد میں بکثرت اور کویت میں بھی جابجا دیکھے گئے، کویت سے بعض آنے والوں نے بیان کیا کہ وہاں مساجد کی بے حرمتی بھی ہوئی اور تعدّیاں اور لوٹ مار بھی۔

اس سلسلہ میں مصنّف نے رسالہ "تعمیرِ حیات" میں تفصیل سے اظہارِ خیال کیا، جس کے مندرجہ ذیل اہم عنوانات سے اس مسئلہ پر اتنی ذکاوتِ حس، اضطراب و پریشانی اور اس کی مخالفت کے مذہبی دواعی و اسباب کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے، چند عنوانات حسب ذیل ہیں:-

"تحریکِ قومیت کے داعی عیسائی فضلاء ہیں"، "عرب قومیت کی تحریک مشرقِ وسطیٰ کے عیسائیوں کی گہری سازش ہے"، "عرب قومیت کی مخالفت کا اصل محرک"، "ماضی میں اسلام سے عربوں کا رشتہ توڑنے کی کوششوں کی ناکامی قومیتِ عربیہ کی اصل محرّک ہے"۔

ایک مضمون جس کا عنوان ہے "محمد عربی سے ہے عالمِ عربی" علامہ اقبال کے ان دو مبنی بر حقیقت اور ایمان افروز شعروں سے شروع کیا گیا ہے ؎

یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا اس امّت کو
وصالِ مصطفوی، افتراقِ بولہبی

نہیں وجودِ حدود و ثغور سے اس کا
محمدِ عربی سے ہے عالمِ عربی

اسی زمانہ میں جب عراق کے کویت پر حملہ اور غارت گری کے خلاف ہندوستان کے اسی دینی حلقہ کی طرف سے آواز بلند کی جا رہی تھی، جس کا عالمِ عربی کی

تحریکوں، رُجحانات اور خطرات کا براہ راست مطالعہ تھا، اور جس کو وہاں بار بار سفر کرنے کا موقع ملا تھا، لکھنؤ میں مسلم انٹلکچول فورم کی طرف سے دانشوروں کی ایک نمائندہ کانفرنس بلائی گئی اس میں راقم نے پوری صفائی کے ساتھ اظہار خیال کیا اور بہت وضاحت کے ساتھ عراقی حملہ کی مذمت کی، اس نے صفائی سے کہا کہ کویت پر صدام حسین کے اقدام کا سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ اسلام کی اخلاقی شہرت اور انسانی دعوت کو وہ نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی برسوں نہیں ہو سکے گی، مسلمانوں کا سر شرم سے جھک گیا ہے، وہ اغیار کی شکایت اب کس منھ سے کریں جب ایک ہی مذہب کے مدّعی، ایک ہی زبان کے بولنے والے اور ایک پڑوسی ملک نے ایک ایسے پڑوسی ملک پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا جو اس سے رقبہ میں بہت چھوٹا اور تاریخ میں بہت کم عمر اور غیر نمایاں ہے، راقم نے یہ بھی کہا کہ ہمارے اس برّصغیر (ہندوستان و پاکستان) کی ایک بڑی کمزوری یہ رہی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مغربی طاقت کے خلاف زوردار لفظ بول دے[۱] تو وہ ہیرو بن جاتا ہے، اس کی بُرائیوں کے ریکارڈ بھلا دیئے جاتے ہیں، ہر لفظ جس میں "خطر پسندی" اور "مہم جوئی" ہو اس کو سن کر مسلمان دیوانے ہو جاتے ہیں، راقم نے کہا کہ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس سے اسلام کی

---

[۱] صدام حسین نے بضرورت اور بلا ضرورت امریکہ کے بارہ میں کبھی کبھی سخت زبان استعمال کی۔ جہاں تک امریکہ اور ممالک اسلامیہ کے ساتھ اس کے معاندانہ سلوک اور اسرائیل کی حمایت اور اس کے زیر اثر سازشیوں کا تعلق ہے مصنف کتاب اس بارہ میں امریکہ کے لئے اپنے دل و دماغ میں کوئی نرم گوشہ اور تاویل و معذرت کی گنجائش نہیں رکھتا، وہ اس وقت (کمیونزم کی ناکامی اور روس کے انقلاب کے بعد) سب سے زیادہ عالم اسلام اور اس کی ابھرتی ہوئی طاقتوں سے خطرہ محسوس کرتا ہے اور ہر جگہ کی صالح قیادت کو ناکام بنا دیتا ہے۔

دعوت کو نقصان پہنچا ہے۔ "پیامِ انسانیت" کے ایک داعی کی حیثیت سے اب یہ مشکل ہو گیا ہے کہ اس جرأت اور احساس ذمہ داری کے ساتھ کسی سے نہیں کہہ سکتے کہ کسی کی جان نہیں لینا چاہیئے اور کسی کی زمین و جائداد پر قبضہ نہیں کرنا چاہیئے۔

جزیرۃ العرب حرم اکبر[1] بھی ہے، اور اس کا ایک خاص مقام ہے، بڑے شرم کی بات ہے کہ وہاں میزائیل بھی پھینکے گئے، مدینہ منورہ میں خطرے کے سائرن بجے، عراق وہ ملک ہے، جس میں امام ابو حنیفہ رح، امام احمد بن حنبل رح جیسے فقیہ و مجتہد، سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی رح، معروف کرخی رح، بشر حافی رح، حضرت جنید بغدادی رح اور کتنے اولیائے کرام نے علم کے چشمے بہائے اور اپنی روحانیت سے دنیا کو منور کیا، بقول حالیؔ ؎

وہ بلدہ کہ فخر بلاد جہاں تھا ۔۔۔ تر و خشک پر جس کا سکّہ رواں تھا

بڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں ۔۔۔ وہ سوتے ہیں بغداد کے مقبروں میں

اندازہ ہوتا ہے کہ صلیبی عیسائیوں اور صہیونی یہودیوں نے گزشتہ تجربات کی روشنی میں اپنا طریق جنگ (STRATEGY) بدل دیا، انھوں نے جزیرۃ العرب اور پڑوسی عرب ملکوں پر براہ راست اقدام کرنے اور فوجی و عسکری طاقت سے اس کو فتح کرنے کے بجائے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ وہ قومیت عربیہ کے علم برداروں بالخصوص "البعث العربی"[2] سے وابستگی اور شیفتگی رکھنے والے قائدین سے یہ کام لیں اور ان کے لئے

---

[1] یعنی عزت و احترام کی جگہ، اور جہاں صرف دین اسلام کی حکومت بالاتری اور مسلمانوں کی سکونت و آبادی ہو اور انھیں کے معابد (مساجد) ہوں۔

[2] البعث پارٹی کا بڑا داعی اور قائد شام کا ایک عیسائی قائد میشائل عفلق ہے، راقم سطور کو دمشق کے ۱۹۵۱ء۔ ۱۹۵۶ء کے زمانۂ قیام میں اسکے حالات و خیالات سے واقف ہونے کا موقع ملا، اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ صدام حسین نہ صرف "البعث العربی" کے ہم خیال اور پیرو ہیں بلکہ اس کے وکیل و ترجمان اور قائد بھی ہیں۔

ہیرو بننے اور عربوں، مسلمانوں اور بالخصوص فلسطینیوں کی امیدوں کا مستقبل اور مرکز محبت و توجہ بننے کا سامان پیدا کریں جس سے وہ اسلام کے اس مرکز میں داخل و مؤثر بن کر عربوں کے ذہن اور تہذیبی ارتداد، جاہلیتِ اولیٰ کی طرف بازگشت اور دین نیز عقیدہ و عمل میں ضعف و تزلزل پیدا کر سکیں اور کفر سے نفرت اور جاہلیت سے عار محسوس کرنے کو زائل کر سکیں، بلکہ دورِ جاہلیت ہی کو اپنا قابلِ فخر زمانہ سمجھنے لگیں، یہ منصوبہ بڑا نازک، مخفی اور عمیق ہے، اس کو سمجھنے کے لئے عالم اسلام اور عالمِ عربی کی پچھلی تحریکات، کوششوں اور سازشوں کی تاریخ سے واقفیت، اور عربی کے جدید لٹریچر پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے جس کا (اضطراراً کہا جاتا ہے) ہندوستان میں بہت کم سامان و ذرائع ہیں، اور ہمارے دینی حلقوں نے اس کو اتنی اہمیت نہیں دی۔

جلالۃ الملک فہد بن عبدالعزیز کے نام ایک مخلصانہ اور دعوتی خط

دین کے ایک داعی اور ایک ایسے بے غرض، صاحبِ فکر و دردمند انسان کا (جس کے پیش نظر صرف اظہارِ حق، فلاحِ مسلمین اور اسلام کی تعلیمات اور کتاب و سنّت کی رہنمائی کی روشنی میں اصلاحِ حال کا جذبہ اور "كُونُوْا قَوّٰامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ" کے فرمانِ خداوندی پر عمل کرنے کے سوا کوئی مقصد نہ ہو) ایسے طرزِ عمل کی گنجائش نہیں جس میں صرف کوئی ایک شخصیت یا کوئی ایک معاشرہ اور ملک ہی مرکزِ توجّہ اور موضوعِ تنقید و احتساب ہو، اور دعوت صرف یک رخی "اتجاہٌ واحدٌ" اور (ONE WAY TRAFFIC) کا مصداق نہ بن جائے۔

اس بنا پر عراق کے طرزِ عمل اور صدّام حسین کے بعض خیالات اور ایک چھوٹی

عرب ریاست اور اسلامی علاقہ (کویت) پر حملہ کرنے کے خلاف آواز بلند کرنے اور احتجاج و تنقید کے ساتھ (جو اپنے ذاتی مطالعہ اور معلومات کی بناء پر اس وقت ایک دینی فریضہ اور شرعی احتساب معلوم ہوتا تھا) راقم نے اس کی بھی ضرورت سمجھی کہ مملکتِ عربیہ سعودیہ کے سربراہ کو (جن کو اللہ تعالیٰ نے حرمین شریفین کی تولیت اور خدمت و حفاظت کا شرف بھی بخشا ہے، اور اسلامی سیرت اور طرزِ حکمرانی کا نمونہ پیش کرنے کا نادر موقعہ عطا کیا ہے) مخلصانہ اور بے غرضانہ طریقہ پر ایک دعوتی مکتوب ارسال کیا جائے، جس میں وقت کی نزاکت کی طرف توجہ دلائی جائے، اور اخلاص و انابت الی اللہ امکانی حد تک مملکت اور معاشرہ کو مثالی اور معیاری اسلامی معاشرہ بنانے کے عزم و جدّوجہد کی طرف متوجہ کیا جائے، انابت الی اللہ اور خدا سے معاملہ صاف کرنے اور ان کمزوریوں اور خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی طرف بھی توجہ دلائی جائے، جو خدا کی نصرت اور حمایت سے دور کرتی ہیں، نیز خدا سے اپنا اور اس مملکت کا (جس کا خدا نے امین بنایا ہے) معاملہ صاف کرنے کی طرف توجہ دلائی جائے، اور اس سلسلہ میں خلیفۂ راشد سیدنا عمر ابن عبد العزیزؒ اور مجاہدِ اعظم سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے نمونوں کو پیش نظر رکھا جائے۔

راقم نے مکتوب الیہ کی جلالتِ شان، علوئے مقام، اور ان کی بہت سی خوبیوں اور کارناموں کو سامنے رکھتے ہوئے، اور اس کی رعایت کرتے ہوئے اُن کے نام ایک خط لکھا جس میں ان سب چیزوں کی پوری رعایت تھی، اور اس کو خاص طور پر ان تک پہونچانے کی کوشش کی، ملک نے اس خط کو بہت غور و توجہ سے پڑھا، اور اپنے دستخط کے ساتھ اس کا جواب اس شریفانہ اور حقیقت پسندانہ انداز کے ساتھ دیا،

جو ملک فیصل مرحوم کی یاد تازہ کرتا تھا، سعودی سفارت خانہ نے خاص اہتمام سے یہ شاہی مکتوب، مکتوب الیہ کو پہونچایا۔

یہاں پران دونوں خطوط کے ترجمے[1] نقل کئے جاتے ہیں جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ راقم نے اپنا دعوتی فرض اور دینی احتساب کس غیر جانبداری اور فرض شناسی کے ساتھ انجام دیا، وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت وإلیہ أنیب۔

ملک فہد کے نام راقم کا مکتوب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت خادم الحرمین الشریفین ملک فہد بن عبد العزیز! حفظہ اللہ وتولاہ وحماہ'

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'، امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔

اس وقت عالم اسلام جس سنگین اور المناک صورت حال سے دوچار ہے، جزیرۃ العرب، حرمین شریفین کو خصوصاً اور اسلامی ملکوں کو عموماً جن چیلنجوں اور خطرات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اندیشوں اور خطرات کے انھیں احساسات سے مجبور ہو کر راقم الحروف یہ مکتوب اور اپنی بعض تصنیفات آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے' یہ مخلصانہ عریضہ ایسی شخصیت کے نام لکھا جا رہا ہے' جو اس راقم سطور کے نزدیک اس صورتِ حال کا سامنا کرنے اور اس سے نمٹنے کی سب سے زیادہ اہلیت رکھتی ہے' اگر ممکن ہوتا تو راقم سطور اپنے مضطرب وبے تاب دل، اور احساس کرب سے دردمند دماغ کو اس مخلصانہ عریضہ کے صفحات پر نکال کر رکھ دیتا، اگر روشنائی کے بجائے خونِ جگر اور

---

[1] یہ ترجمے عزیز گرامی مولوی نذر الحفیظ ندوی استاد دار العلوم ندوۃ العلماء کے قلم سے ہیں۔

آنسوؤں سے یہ تحریر رقم کی جاسکتی، اور بذاتِ خود حاضر ہوکر زبانی گفتگو کے ذریعہ مافی الضمیر کو ادا کرنا اس وقت ممکن ہوتا تو اس سے بھی دریغ نہ کرتا، لیکن اس وقت ہمارے ملک کے حالات ایسے سنگین ہیں، اور بعض دشواریاں ایسی حائل ہیں کہ بذاتِ خود حاضری سے قاصر ہوں، اس لئے اللہ تعالیٰ پر توکل اور معزز مکتوب الیہ کی فراست پر اعتماد کرتے ہوئے، یہ عریضہ تحریر کیا جا رہا ہے کہ آپ کو اس وقت کے نازک حالات اور وقت کے سنگین تقاضوں کا خود علم ہے، اور ان امیدوں اور آرزوؤں کا بھی اندازہ ہے، جو ذاتِ گرامی سے وابستہ کرلی گئی ہیں۔

اس وقت عالمِ اسلام عموماً اور جزیرۃ العرب اور بلادِ مقدسہ خصوصاً ایسے سنگین اور فیصلہ کن مرحلہ سے گزر رہے ہیں، جس کا مقابلہ کرنے اور اس کے ازالہ کی کوشش میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر کی گنجائش نہیں، اور نہ کسی امکانی جدّوجہد سے گریز ممکن ہے، صورتِ حال اس حد تک سنگین ہے جس کی تصویر آیت قرآنی: اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ o وَقِیْلَ مَنْ ﷺ رَاقٍ o[1] (جب جان گلے تک پہونچ جائے اور لوگ کہنے لگیں (اس وقت) کون جھاڑ پھونک کرنے والا ہے؟) سے بہتر کھینچی نہیں جاسکتی۔

راقم الحروف آپ کے بیش قیمت اوقات اور گراں بار ذمہ داریوں کا لحاظ کرتے ہوئے امکانی حد تک اختصار کے ساتھ چند معروضات پیش کرتا ہے کہ آپ کی ذہانت و ذکاوت، دینِ اسلام سے آپ کی صحیح معرفت، قرآن مجید کے مطالعہ و غور و فکر، حدیث شریف اور سیرتِ مبارکہ، قوموں اور معاشروں کی تاریخ سے جو واقفیت آپ کو ہے اس کی بنا پر زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔

---

[1] سورۃ القیٰمۃ - آیت ۲۵-۲۶

۱۔ کتاب وسنّت کی ہدایت اور دنیا کی تبدیلیوں اور انقلابات کی تاریخ کی روشنی میں سب سے مؤثر اور مفید چیز ہے، اللہ کے ساتھ صدق و اخلاص کا معاملہ، اس کی طرف رجوع وانابت، ساتھ ہی فرد اور معاشرہ کی زندگی میں ہر ممکن اصلاح، معاشرہ سے منکرات، اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت سے محروم کرنے والے اعمال واخلاق کا ازالہ، اور سماجی، سیاسی، انتظامی اور انفرادی زندگی سے تساہلات (سہل انگاریوں) اور تضادات کا دور کرنا، قرآن وحدیث اس پر شاہد ہیں، سیرت مبارکہ، خلفائے راشدین اور پابند دین اور خدا پرست بادشاہوں کی زندگی میں اس کے بے شمار نمونے موجود ہیں، اُن کی تفصیل اور واقعات واسماء کے تذکرے وتعیین کی یہاں ضرورت نہیں، خلاصہ یہ کہ انابت اِلی اللہ، اصلاح اُمّت وازالہ منکرات کی جدّوجہد، اللہ کی رحمت کو متوجہ کرنے، مصیبتوں اور دشواریوں کے وقت قوموں اور معاشروں کو بُرے نتائج سے محفوظ رکھنے کی موثّر ترین تدبیر ہے، جن کا عام ذرائع واسباب فوجی قوت یا بڑی طاقتوں کی تائید وحمایت مقابلہ نہیں کر سکتی۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس وقت تمام اسلامی ملکوں اور قوموں کے اندر دو ایسے خلا پائے جاتے ہیں، جنھوں نے مسلمانوں کے وجود، دعوتِ اسلامی کی پیش رفت وترقی، انسانوں کے قلب وعقل کو مسخّر کرنے بلکہ اس دعوت کے متعلق غور وفکر کرنے پر آمادگی میں بڑی زبردست رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں، اس سے آگے بڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس خلا نے مسلمانوں میں تہذیبی ارتداد اور عقائد وسلوک میں انحراف اور فساد کا خطرہ پیدا کر دیا ہے، اس لئے فوری طور پر اس خلا کو پُر کرنا ضروری ہے۔

پہلا بنیادی خلا ایسے مثالی معاشرہ (سوسائٹی) کا فقدان ہے جو اللہ کے نزدیک

پسندیدہ ہو، اور عقائد و اخلاق سے لے کر معاملات اور زندگی کے تمام شعبوں میں وہ اسلامی تعلیمات کا آئینہ دار ہو، انسان اس فضا اور ماحول میں امن وسکون اور طمانیتِ قلبی محسوس کرے، ایمانی خوشبو اس کے مشامِ جان کو معطّر کردے، حقیقی سعادت سے آشنا ہو اور یہ محسوس کرے کہ یہ معاشرہ خوشیوں اور خوش بختیوں کا گہوارہ اور ایسی جنّت ہے، جہاں وہ اسلامی تعلیمات، اعلیٰ اخلاقی قدروں کو کارگر، قیادت میں سرگرم عمل، اور اسلام کو چلتے پھرتے اور بولتے دیکھ رہا ہے، مسجد سے لے کر بازار، عدالت سے لے کر گھروں تک اور عقائد سے لے کر معاملات تک میں اسلام کی حکمرانی اور اسی کی چھاپ ہے، افسوس ہے کہ یہ مثالی معاشرہ ایک تاریخی یادگار اور قصّۂ ماضی بن کر رہ گیا ہے، جو تاریخ کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے، اس وقت ایسے اسلامی معاشرہ کو دوبارہ بحال کرنا اسلام ہی کی نہیں پوری دنیا کی اوّلین اور بنیادی ضرورت ہے۔

یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ سعودی حکومت ہی ایسے اسلامی معاشرہ کو قائم کرنے کی زیادہ اہل اور اس پر قادر ہے کہ اس کا خمیر ہی اسلامی دعوت سے تیار ہوا ہے، اور اس کا نشو ونما بھی اسی ماحول میں ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کی فتح ونصرت بھی اس کے ہم رکاب رہی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے بلاد مقدسہ اور حرمین شریفین کی تولیت وتگرانی کا شرف بھی اس کو عطا کیا ہے، جہاں حج کی بدولت ہر سال دنیا کے گوشہ گوشہ سے مسلمان آیا کرتے ہیں، اس لئے تمام قوموں کی نگاہیں سعودی عرب کی حکومت پر لگی ہوئی ہیں۔

۳۔ عالمِ اسلام کا دوسرا خلا کسی ایسی طاقت ور اور مومنانہ دعوت وقیادت کا فقدان ہے، جس کے اندر مردانگی کا جوہر، بلند نگاہی، عالی ہمتی، دور اندیشی و پیش بینی

کے ساتھ، ان بڑی طاقتوں کا سامنا کرنے کی صلاحیت اور قدرت بھی ہو، جنھوں نے بغیر کسی جواز و استحقاق کے نوعِ انسانی کی زمامِ قیادت اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے، اور جو اسلامی ملکوں اور قوموں کی قسمتوں کی مالک بن بیٹھی ہیں، اسی کے ساتھ اس اسلامی قیادت میں ایثار و قربانی، جرءت و شجاعت کی روح، صبر و استقلال کے جذبہ اور شوق سے سرشار رہونا، نیز زہد و تقشّف کے ساتھ (اگر ضرورت ہو اور حالات کا تقاضہ بھی ہو) خطرات میں کود پڑنے کی ہمت اور طاقت بھی رہنی چاہئے، کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ قوی ایمان، بے مثال جرءت و شجاعت اور جرءت مندانہ اقدامات سے متاثر ہوتا ہے، اور اس کا ثنا خواں بن جاتا ہے، بڑی طاقتوں کو للکارنے (خواہ کھوکھلے نعروں اور پروپیگنڈوں کے لئے ہو) کا بھی نفسیاتی اثر پڑتا ہے، اور لوگوں کے عقیدے اور رجحانات اس سے متأثر ہوتے ہیں، پھر اس طرح کا مظاہرہ کرنے والے اگر الحاد و گمراہی کے علمبردار ہوئے (چہ جائیکہ وہ اپنے طور طریقہ میں انحراف کا شکار رہوں) اور اُن کا تعلق کسی ملحدانہ فکر یا فلسفہ یا کسی صلیبی سازش سے ہے، (جیسا کہ بعث پارٹی کا معاملہ ہے) تو یہ چیز عوام کے فکر و عقیدہ میں تزلزل پیدا کر دیتی ہے، اور وہ بعض اوقات الحاد کا شکار ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ لوگ خاص طور سے (نوجوانوں کا اولوالعزم طبقہ جوان عالمی طاقتوں کو ناپسند کرتا ہے، جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر سازش اور منصوبہ بندی اور ہر کوشش میں مؤیّد اور مددگار ہوتی ہیں) ہر اس شخص کا گرم جوشی سے استقبال کرتا ہے، جو بہادری کے ساتھ ان طاقتوں کے سامنے آئے، خواہ وہ کھوکھلا چیلنج ہو یا صرف زبانی جمع خرچ ہو، یہ چیز اُن کے عقیدہ پر بھی اثر انداز ہوتی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ کسی معقول تدبیر و انتظام کا اپنی

جگہ نہ ہونا، یا کسی ضروری چیز کا خلا غیر طبعی ہے، اور وہ زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہ سکتا۔

اس خلا کو پُر کرنا بہت ضروری ہے، اس طرح بڑی طاقتیں جس طرح عالمی سیاست میں دخل اندازی کرتی ہیں، اور اسلامی ملکوں کی سیاست وقیادت پر اثر انداز ہوتی ہیں، اُن کی قوت و تاثیر سے غصہ و جھنجھلاہٹ کے شکار، اور اکتائے ہوئے نوجوانوں کو دور رکھنا اور بجائے مُلحد و بے دین قائدین اور اصحاب اقتدار کے مخلص و دیندار اور قلب سلیم رکھنے والے قائدین وحکّام کی طرف اُن کو متوجہ کرنا وقت کا اہم تقاضہ ہے، چونکہ مملکت سعودیہ عربیہ فاسد عقائد اور شرک و بدعت کی بُرائیوں سے پاک وصاف اور صحیح اسلامی عقیدہ کی حامل ہے، اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرمین شریفین کی خدمت اور تولیت کا شرف بھی عطا فرمایا ہے، اس لئے وہی اس بنیادی خلا کو آسانی سے پُر کرسکتی ہے، اور آپ جیسی شخصیت جس کو اللہ تعالیٰ نے شرافتِ وطن و شرافتِ منصب دونوں نعمتیں عطا فرمائی ہیں، یہ کام انجام دے سکتی ہے، اس لئے کہ آپ کے خاندان کی قدیم و جدید تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ پر توکل کیا ہے، اور اس کی کتاب کو حَکَم بنایا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنّت اور طریقہ پر عمل پیرا ہونے کا اہتمام کیا ہے۔

عالمِ اسلام کی نگاہیں اس وقت ایسے شخص پر لگی ہوئی ہیں، جو سیدنا عمر ابن عبدالعزیز کا رول ادا کرے، جنھوں نے پہلی صدی ہجری کے اواخر میں صرف ڈھائی سال کی مختصر مدّت میں اپنے اخلاص، فیصلہ کن عزم وارادہ، زہد و تقشّف، سادہ مثالی زندگی، اعلیٰ اخلاقی قدروں پر مضبوطی اور استقلال سے جمے رہنے کی بدولت،

وسیع ترین اسلامی معاشرہ کو تبدیل کر کے رکھ دیا، اور صالح حکومت قائم کرنے، اس کو نفس اور خواہشات کی غلامی اور تعیش پسند قوموں کی تقلید اور پیروی سے نکال کر معتدل اور متوازن اسلامی طرز معیشت اختیار کرنے اور آخرت کو ترجیح دینے میں کامیاب ہو گئے۔

عالم اسلام کے لئے دوسری مثالی شخصیت مجاہد اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی کی ہے، جنھوں نے چھٹی صدی ہجری میں صلیبیوں کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی، اور محض اپنے گہرے اور طاقتور ایمان، غیر متزلزل یقین، جہاد کے والہانہ عشق، اپنی پاکیزہ اسلامی سیرت، زاہدانہ زندگی، اور قائدانہ وحکیمانہ طرزِ عمل کے ذریعہ بیت المقدس اور فلسطین کو بازیاب کرنے اور وسیع اسلامی ممالک اور بلاد مقدسہ اور عرب ملکوں کو دشمنوں سے محفوظ کرنے میں کامیاب رہے۔

خادم الحرمین الشریفین! شاید مشیت خداوندی نے آپ کی ذات کو اس طرز کے غیر معمولی کارنامہ کو انجام دینے کے لئے تیار کیا ہے، اس لئے کہ آپ کا نشو ونما اسلام کے گہوارہ میں ہوا ہے، اور رجبالوں کی سرزمین اور شیر صفت مردان کار کے وطن میں آپ پلے بڑھے ہیں، اگر عزم مصمم، ارادۂ قوی اور توفیق الٰہی شامل حال ہو تو یہ کام دشوار نہیں، یہ کارنامہ جس دن انجام پائے گا وہ دن اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں درخشاں اور تاباں دن ہوگا، اور سعادت و خوش بختی آپ کے قدم چومے گی۔

آپ کی صحت و درازیٔ عمر اور آل سعود کے لئے دعاگو

ابوالحسن علی ندوی

۱۷ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ
۶ر دسمبر ۱۹۹۰ء

ملکِ معظم نے اس خط کا جو جواب دیا اور جو اہتمام کے ساتھ مکتوب الیہ کو پہونچایا گیا، وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

ملک فہد کا جواب اور راقم کے نام اُن کا گرامی نامہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مملکت سعودی عرب

فضیلۃ الشیخ ابوالحسن علی الحسنی الندوی ایسلمہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

امید ہے مزاج بعافیت ہوگا۔

مکتوب گرامی موصول ہوا جس میں آپ نے مسلمانوں کی موجودہ صورت حال اور مستقبل میں ان کو درپیش خطرات اور چیلنجوں کے متعلق اپنے مخلصانہ احساسات و جذبات کا اظہار فرمایا ہے، اس کے ساتھ آپ نے مملکتِ سعودیہ اور میری ذات کے بارے میں جو توقعات ظاہر کی ہیں، ان کے لئے ہم آپ کے شکرگزار ہیں، ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ قرآن وسنّت اور سیرت مبارکہ کی ہدایت کی روشنی میں پوری دنیا میں اسلام کی سربلندی کی راہ میں مسلمانوں کی جس خدمت کا عہد سعودی حکومت نے کر رکھا ہے، اس محکم اور غیر متزلزل پالیسی پر ہم گامزن رہیں گے اور انشاء اللہ مقدور بھر کسی کوشش اور جدّ وجہد سے دریغ نہ کریں گے۔

ہم کو اس کا پورا احساس وادراک ہے کہ جب تک کتاب وسنّت اور سیرت مبارکہ سے صحیح رہنمائی حاصل نہ کی جائیگی، اور خلفائے راشدین کی سیرت، تابعین عظام،

مُصلحین و مُجدّدینِ اُمّت اور اسلامی تاریخ کی چیدہ و برگزیدہ ہستیوں کے طرزِ عمل کو اُسوہ نہیں بنایا جائیگا، اُس وقت تک یہ ملک حقیقی اسلامی زندگی سے آشنا نہیں ہوسکتا اور نہ عزّت و سربلندی ہی سے وہ سرفراز اور کامیابی و ترقی سے ہم کنار ہوسکتا ہے، اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ آج کل مسلمانوں کو جو حوادث و مصائب اور بُحران درپیش ہے، حقیقت میں اس بات کا امتحان اور ابتلاء و آزمائش ہے کہ وہ کس حد تک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر کاربند اور اس کے پابند ہیں۔

ایسے سنگین حالات میں جب کہ اُمّت مسلمہ کو ان چیلنجوں اور خطرات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، ہم اللہ تبارک و تعالیٰ سے دست بہ دعا ہیں اور ہمیں اس کی ذات سے قوی امید بھی ہے کہ فتح و نصرت کے جو وعدے اس نے مسلمانوں سے کئے انھیں وہ پورا فرمائے گا، اور دشمنوں کی تمام چالوں اور تدبیروں کو ناکام بنا کر اس اُمّت کو راہِ حق پر ثبات و استحکام عطا فرمائیگا۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کا بھائی

فہد بن عبد العزیز آل سعود

ملک المملکۃ العربیۃ السعودیۃ

ریاض ۱۲ شعبان ۱۴۱۱ھ

۲۶ فروری ۱۹۹۱ء

ایک عظیم حادثہ

۲۰ مارچ ۱۹۹۱ء ۴ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ کی شب تھی کہ لکھنؤ سے

رائے بریلی کے ایک دوست کے یہاں جن کے یہاں ٹیلیفون تھا، یہ صاعقہ اثر اطلاع دی گئی کہ ۳ رمضان ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۹ مارچ ۱۹۹۱ء کو عین تراویح کے درمیان امیر شریعت بہار واڑیسہ اور بانی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور اس کے جنرل سکریٹری مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی رح نے سفر آخرت اختیار کیا، راقم سطور نے اس پر جو بیان اخبارات میں بھیجا[1]، وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:۔

"یہ خبر بجلی بن کر دل ودماغ پر گری کہ مولانا سید منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار واڑیسہ وجنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا انتقال ہوگیا۔

مولانا کی وفات سے نہ صرف امارت شرعیہ بہار واڑیسہ جیسی فعال، مؤثر ومبارک تحریک وتنظیم (جس کی نظیر ملنی مشکل ہے) اور ریاستہائے بہار واڑیسہ کی دینی وملی قیادت میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا، جس کا بظاہر پُر ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے' اور نہ صرف پرسنل لا بورڈ جیسا فعال اور ضروری ادارہ اپنے بانی ومحرک اور روح رواں شخصیت سے محروم ہوا، بلکہ ہندوستان کی دینی، ملی وفکری قیادت میں ایک ایسا خلا پیدا ہوا جس کا قحط الرجال کے اس دور میں پُر ہونا بہت دشوار معلوم ہوتا ہے' مولانا کی شخصیت اپنی ریاست اور ملک ہندوستان ہی میں نہیں اس عہد کے عالم اسلام کی ممتاز ترین شخصیتوں میں تھی، اللہ تعالیٰ نے علم واخلاص، عزم وقوت ارادی، اصابت رائے، توازن واجتماعیت

[1] مولانا پر مستقل تعزیتی وتعارفی مضمون مصنّف کی کتاب "پرانے چراغ" کے تیسرے حصہ میں ملاحظہ ہو۔

کی ان کی ذات میں ایسی متعدد خصوصیتیں پیدا کردی تھیں جن کا ایک شخص میں بہت مشکل سے اجتماع ہوتا ہے، جس کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے متعدد یگانہ دینی و ملّی تاریخی کام لئے، جن کی نظیر ملنا مشکل ہے، راقم اس عظیم حادثہ پر پوری ملت کو تعزیت پیش کرتا ہے اور مولانا مرحوم کے رفع درجات کے لئے اور ان کے بعد ان کے عظیم کاموں اور اداروں کی بقا کے لئے دعا کرتا ہے۔"

مولانا سید منت اللہ صاحب کے متعدد اوصاف و کمالات ہیں جن کی طرف تعزیتی مضامین میں اشارہ کیا گیا ہے دو بڑے امتیازی کمالات یا تفردات تھے، ایک یہ کہ معاصر علمائے ہند اور دینی جماعتوں کے قائدین میں ان کو تحفظ شریعت اور اسلام کے عائلی قانون کے بارہ میں سب سے زیادہ خطرہ کا احساس اور اس کی حفاظت کی ضرورت کا جذبہ تھا، دوسرے یہ کہ مختلف المزاج اور متفاوت الاستعداد لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کی ان میں ایسی صلاحیت تھی جس میں ان کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

راجیو گاندھی کا قتل

۲۱ مئی ۱۹۹۱ء کو اچانک وزیر اعظم ہند راجیو گاندھی کے قتل کی اطلاع ملی[1]، یہ اس خاندان کا تیسرا حادثہ تھا[2]، اس افسوسناک اور اچانک اطلاع سے جہاں ہندوستان کے حال و مستقبل کے بارہ میں اندیشے پیدا ہوئے وہاں مسلم پرسنل لا بورڈ

---

[1] اس وقت راجیو جی وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر فائز نہ تھے، چندر شیکھر جی اس وقت وزیر اعظم تھے۔

[2] مسز اندرا گاندھی کے قتل، سنجے کے ایک حادثہ میں موت کو شامل کر کے کہا جارہا ہے۔

کے سلسلہ میں ان سے بار بار کی ملاقاتیں، ان کا شریفانہ طرزِ عمل اور ان کی اس حقیقت پسندی اور اخلاقی جرأت کی یاد تے دل میں چٹکیاں لیں جو انھوں نے نفقۂ مطلّقہ کے سلسلہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف پارلیمنٹ سے نئے مطلّقہ بل کے پاس کرانے میں دکھائی تھی، جو پرسنل لا بورڈ کے نمائندہ وفد کی نمائندگی اور ملّت اسلامیہ ہندیہ کے اجتماعی مطالبہ، جذبہ اور اظہار خیال کے مطابق تھی، اور جس کی مثالیں (ہندو اکثریت کی مخالفت اور انگریزی ہندی پریس کے پروپیگنڈے اور اس کی اس طرح مخالفت کرنے کی حالت میں کہ گویا اس بل کا پاس ہو جانا ملک پر کسی بیرونی حملہ کے مرادف یا اس پر بجلی گرنے کے ہم معنی ہے) ذمّہ دارانِ حکومت کے فیصلوں میں بہت کم ملے گی۔

اس موقع پر اس کا اظہار کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، میں نے اس کا التزام رکھا اور پوری پابندی کی کہ میں راجیو جی سے تنہا نہ ملوں، مولانا منّت اللہ صاحب رحمانی کی معیت میں ملاقات ہو کہ وہ زیادہ تجربہ کار اور مسئلہ پر حاوی ہیں، دوسری بات جس کا ہم دونوں نے التزام کیا وہ یہ کہ نفقۂ مطلّقہ کے مسئلہ اور پرسنل لا کے موضوع کے علاوہ ہم کسی دوسرے مسئلہ یا ملک میں پیش آنے والے واقعہ پر گفتگو نہ کریں، اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ راجیو جی کو اطمینان ہو گیا کہ ہم لوگ کوئی سیاسی استحصال یا عمومی قیادت کا مظاہرہ نہیں کرتے، ان کی ذہانت کی بات تھی کہ انھوں نے پہلی ہی ملاقات میں سمجھ لیا کہ یہ لوگ سیاسی لیڈر نہیں ہیں، عالمِ دین ہیں، اور ان کو مذہبی احساس و حمیّت اور اپنے مطالعہ و علم کی ذمّہ داری یہاں لائی ہے۔

خلیجی جنگ کے بعد اُمّتِ اسلامیہ کا مستقبل، چند خامیاں جن کا دُور کرنا ضروری ہے

عراق کے کویت پر حملہ کرنے اور قبضہ کر لینے کی صدائے بازگشت (اکثر جگہ ناپسندیدگی اور احتجاج کے ساتھ) عرب اور مسلم ممالک میں سنی گئی، اسی کی بناء پر حکومتِ مصر کی وزارت اوقاف اور شئون اسلامیہ کی مجلس اعلیٰ نے ۲۵، ۲۶، ۲۷ / اپریل ۱۹۹۱ء کی تاریخوں میں قاہرہ میں ایک کانفرنس کے انعقاد کا انتظام کیا، جس میں خلیج کی جنگ اور اس سے پیدا شدہ حالات و نتائج کا حقیقت پسندانہ اور منصفانہ جائزہ لیا جائے، راقم کو بھی اس کی شرکت کے لئے دعوت موصول ہوئی، لیکن وہ کچھ اپنی مشغولیت اور صحت کی بناء پر اور کچھ اس بناء پر کہ ۱۹۵۱ء میں قاہرہ کے اس طویل قیام کے بعد جو تقریباً ۵ مہینوں پر ممتد تھا[1] مصر نہیں جا سکا تھا، اس طویل عرصہ میں اس کی کتابوں کی وہاں خاص اشاعت اور ان کو مقبولیت حاصل ہوئی تھی، اور اس کے روابط وہاں کے علمی و دینی حلقوں سے نہ صرف قائم بلکہ رو بہ ترقی تھے، اس کو اندازہ تھا کہ وہاں اس کو سخت مشغولیت اور ذمّہ داریوں کا سامنا کرنا پڑے گا، بکثرت فرمائشوں اور تقاضوں کی تکمیل کرنی پڑے گی، اور مختلف تنظیموں، تحریکوں اور صحافتی حلقوں کی تسلی و تسکین کا سامان بہم پہنچانا ہوگا، جس کی نہ اس کی صحت متحمل ہے اور نہ عمر و مزاج، اس لئے اس نے مناسب سمجھا کہ وہ اپنے جانے کے بجائے ایک مفصل اور واضح مقالہ بھیج دے جس میں حالات کا

---

[1] اس کی مفصل رپورٹ اور روزنامچہ راقم کی عربی کتاب "مذکرات سائح فی الشرق العربی" اور اس کے اردو ترجمہ "شرق اوسط کی ڈائری" میں آچکا ہے۔

حقیقت پسندانہ اور دیانتدارانہ جائزہ لیا گیا ہو، ان سے سبق حاصل کرنے اور ان خامیوں کو دور کرنے کی طرف توجہ دلائی جائے، جو ایسے اقدامات کو ہر وقت شہ دینے کے لئے اور ان کے لئے راستہ ہموار کرنے کے لئے تیار رہتی ہیں۔

راقم نے اس طویل اور واضح مقالہ میں بڑی صفائی کے ساتھ ان خامیوں اور شگافوں کی طرف اشارہ کیا ہے، جن کا باقی رہنا ہر زمانہ میں اور ہر ملک میں ان المیوں (TRAGEDIES) کا باعث ہو سکتا ہے جس کا ایک نمونہ عراق کا کویت پر حملہ ہے، ساتھ ہی اس کا بھی اعتراف کیا گیا کہ ان حقائق پر غور کرنے اور عالم اسلامی بالخصوص عالمِ عربی کو اس طرح کے المیوں سے بچانے کے لئے مصر مناسب ترین جگہ ہے کہ اس نے تاریخ اسلام اور ممالک عربیہ کی تاریخ میں بڑے نازک موقعوں پر اسلام کی عزّت اور مسلمانوں کی حفاظت کا تاریخی کردار ادا کیا ہے اور اسی بنا پر اس کو "کنانۃ الاسلام" (اسلام کا ترکش) کا قابلِ فخر خطاب اور لقب دیا گیا ہے۔

ان میں تاریخ کے دو نازک ترین مرحلے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، ایک صلیبی حملوں (CRUSADES) کے موقع پر جب بیت المقدس صلیبیوں کے قبضہ میں چلا گیا تھا، اور تمام مقامات مقدسہ اور (خاکم بدہن) حرمین شریفین بھی خطرہ میں پڑ گئے تھے، الملک العادل نورالدین زنگی کے سپہ سالار اور ان کی طرف سے مصر کے حاکم صلاح الدین ایوبی کے ذریعہ قدس اور فلسطین کی بازیافت اور پورے جزیرۃ العرب کا خطرہ سے باہر نکل جانا بالواسطہ مصر ہی کے نامۂ اعمال میں شامل ہے[1]، دوسرے یورشِ تاتار

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو لین پول (LANE POOL) کی کتاب "سلطان صلاح الدین" (SALADIN) صفحہ ۹۸

کے موقع پر جب دنیائے اسلام کی چولیں ہل گئی تھیں، اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ہراس اور یاس کا عالم طاری تھا اور ضرب المثل کے طور پر یہ فقرہ مشہور تھا کہ "ہر بات پر یقین کر لینا مگر اس پر کبھی یقین نہ کرنا کہ تاتاریوں نے کہیں شکست کھائی" اس وقت مصر ہی کے حاکم الملک المظفر سیف الدین قطز نے اس ناقابلِ قیاس اور ناقابلِ یقین واقعہ کو عملاً کر دکھایا اور تاتاریوں کو پہلی مرتبہ ۲۵ رمضان المبارک ۶۵۸ھ عین جالوت کے مقام پر شکست فاش دی، تاتاریوں کا قتل عام ہوا، لوگ اُن کو آسانی سے پکڑ لیتے اور لوٹتے تھے[1]، اس معرکہ کے بعد بھی الملک الظاہر بیبرس نے متعدد بار تاتاریوں کو شکست دی اور سارے ملک شام سے اُن کو بے دخل کر دیا۔

مصر کی نفسیاتِ انسانی کی رعایت سے اس تمہید کے بعد ان خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کی گئی ہے، جو ایسے اقدامات کی محرّک اور بعض اوقات حمایت و تائید کا سبب بنتی ہیں، ان میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ پُرجوش نعروں، بلند بانگ دعووں، اور سحر انگیز وعدوں سے (نعرہ لگانے والوں کے افکار و عقائد اور ان کے ماضی اور مقاصد و اعمال سے قطع نظر کرتے ہوئے) فریب کھانے کا مزاج اور مستقل صلاحیت ہے۔

۲۔ کسی بڑی طاقت کے للکارنے اور جھوٹے مظاہرہ سے اس حد تک متأثر ہونا کہ عقل و ہوش کو بھی بالائے طاق رکھ دیا جائے اور حقائق سے آنکھیں بند کر لی جائیں[2]۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الکامل لابن الأثیر ج ۱۲ [2] راقم نے اس کا ایک نفسیاتی سبب بھی بیان کیا، وہ یہ کہ اس امت میں عرصہ سے ایسی طاقتور اور جرأت مند قیادت کا فقدان ہے جس کے اندر جہاد کی روح کارفرما ہو، دنیا کی رہنمائی کا منصب اور اس کی ذمّہ داریوں کا شعور ہو اور وہ بڑی حد تک مغربی یا مشرقی بڑی طاقتوں کے سہارے سے بے نیاز ہو۔

۳۔ اسلامی ممالک میں مثبت فعّال و متحرک اور طاقتور دینی تحریک کے قیام و استحکام پر توجہ دینا بھی ضروری ہے، اور اگر کوئی ایسی تحریک موجود ہو تو اس سے خطرہ محسوس کرنے اور اس کو ختم یا کمزور کرنے کی کوشش کے بجائے اس کی قدر اور ہمّت افزائی کرنی چاہیئے اس لئے کہ اسلامی معاشرہ کی تشکیل و تکمیل اور اس کے استحکام و بقا کے لئے ایک ایسی اسلامی دعوتی تحریک بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے، جو مردانگی، جرأت و ہمّت، بلند ہمتی اور پیش بینی کی صفات سے متّصف ہو۔[1]

۴۔ اسلام ہی عرب کی اساس اور بنیاد ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالم عربی کی روح اور اس کے قائد و امام ہیں، ایمان کی طاقت ہی عربوں کی اصل طاقت ہے، جس نے تاریخ میں معجزانہ کردار ادا کیا۔

۵۔ ممکن حد تک ناز و نعمت اور عیش و عشرت کی زندگی سے دور رہنا، ترقی و تمدّن کے مظاہر میں مبالغہ اور ایسے اعمال و اخلاق سے پرہیز لازم ہے، جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند نہیں اور تائید و نصرتِ الٰہی سے مانع بن سکتے ہوں۔[2]

۶۔ اس مرحلہ پر اس امر کی ضرورت بھی واضح ہو کر سامنے آگئی ہے کہ عرب اور

---

[1] اس میں بعض طاقتور اسلامی تحریکات (مثلاً اخوان المسلمین کی تحریک) کو ختم کر دینے کی اس غلطی کی طرف اشارہ ہے جو مصر سے (جمال عبدالناصر اور انور السادات کی حکومت و قیادت کے زمانہ میں) سرزد ہوئی، جس کا اب کوئی بدل نہیں۔

[2] مضمون میں ممالک عربیہ و اسلامیہ کی تاریخ کے حوالہ سے اس کے شواہد پیش کئے گئے ہیں، اور بتایا گیا ہے کہ قرآن کے الفاظ میں "بطر" و "ترف" کی زندگی میں ایسے المناک واقعے پیش آئے اور سلطنتوں کا زوال ہوا۔

اسلامی حکومتوں اور قوموں کی اپنی ایک مؤثر اور فعّال تنظیم ہونی چاہیئے، جو اُن کی بین الاقوامی، سیاسی اور دفاعی ضرورتوں کی دیکھ ریکھ میں اقوام متحدہ (UNITED NATIONS) کی جگہ لے سکے۔

یہ مضمون لکھ کر بھیج دیا گیا، جو وہاں مؤتمر میں پیش کیا گیا اور غالباً سنایا بھی گیا۔[1]

نرسمہا راؤجی ہندوستان کے نئے پرائم منسٹر

۱۷ ارجون ۱۹۹۱ء کو نرسمہا راؤجی نے وزارتِ عظمٰی کا چارج لیا، اور وہ کانگریس کے صدر اور ہندوستان کے پرائم منسٹر منتخب ہوئے، ان کا وطنی تعلق حیدرآباد سے ہے، انھوں نے جیسا کہ بعض واقفین سے معلوم ہوا جامعہ عثمانیہ (عثمانیہ یونیورسٹی) حیدرآباد میں تعلیم مکمل کی اور معلوم ہوا کہ اردو فارسی سے واقف ہیں، اور اردو میں بلا تکلف لکھتے بولتے ہیں۔

میں نے اپنے اس معمول کے مطابق جو ملک کے نئے منتخب وزیر اعظم کے ملک کی اعلیٰ ذمّہ داری سنبھالنے کے موقع پر اپنے معروضات اور مُخلصانہ مشوروں کے پیش کرتے کا رہا ہے، اُن کے نام یکم جولائی ۱۹۹۱ء کو ایک مفصل خط لکھا جو یہاں بجنسہ درج کیا جاتا ہے کہ اس سے نہ صرف لکھنے والے ہی کے خیالات اور صورتِ حال کی تصویر کشی اور اندیشوں کا اظہار ہوتا ہے، بلکہ ملک کی بھی وہ تصویر سامنے آجاتی ہے جو اس وقت اور اس کے بعد تک ملک کی رہی اور اس کا تسلسل باقی ہے۔

---

[1] مقالہ کا ترجمہ "خلیجی جنگ کے بعد امتِ اسلامیہ کا مستقبل" کے عنوان سے مولوی عبد النور صاحب ندوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قلم سے "تعمیر حیات" کے شمارہ ۱۰ ارجون ۱۹۹۱ء میں مکمل شائع ہوا۔

عالی مرتبت جناب نرسمہا راؤ جی وزیر اعظم ہندوستان!

آداب وتسلیمات کے بعد میں سب سے پہلے آپ کو ملک وقوم کے لحاظ سے اور خدمتِ انسانیت اور حفاظتِ وطن کے روشن و وسیع امکانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے وزارتِ عُظمیٰ کے اہم منصب پر فائز ہوتے اور ملک کی خدمت اور اس کی حفاظت وترقی کے موقعہ کے ملنے پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں، لیکن معافی چاہتے ہوئے یہ عرض کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ آپ یہ ذمہ داری ایسے موقع پر سنبھال رہے ہیں جب ملک "قعرِ مذلّت" میں گر گیا ہے، اس کو ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، جو ملکوں کو کبھی کبھی صدیوں میں پیش آتے ہیں، اس موقع پر سب سے پہلے (ایک مذہبی انسان کی حیثیت سے) یہ عرض کروں گا کہ خدا کی مدد اور رہنمائی کی ضرورت ہے جو انسانوں کا پیدا کرنے والا اور ان پر ماں باپ سے زیادہ شفقت کرنے والا ہے، اور قادر و توانا بھی ہے، اس کے بعد خلوص اور سچی حُبُّ الوطنی، قوتِ فیصلہ، وسیع تجربہ اور دوسرے مُحبّانِ وطن کے اتحاد و تعاون کی۔

میں اس نازک موقع پر مذہب، اخلاقیات اور تاریخ وسیاست کا ایک وسیع مطالعہ کرنے والے مُصنّف اور ایک ایسے محبِّ وطن کی حیثیت سے (جو ان معروضات پیش کرنے اور اس عریضہ کے ذریعہ ملک کی سب سے بڑی ذمّہ دار شخصیت سے تعلق ورابطہ قائم کرنے کے ذریعہ کوئی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، ذاتی اور جماعتی غرض نہیں رکھتا) آپ کی خدمت میں مخلصانہ اور بے غرضانہ طریقہ پر کچھ مشورے اور حقائق پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں، امید ہے کہ آپ اپنا تھوڑا سا قیمتی وقت نکال کر اس عرض داشت پر سرسری نظر ڈالیں گے، میں نے اردو کو اپنے اظہارِ خیال کے لئے اس لئے

ترجیح دی کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اردو کا اچھا ذوق رکھتے ہیں اور بے تکلف اس کو پڑھتے اور سمجھتے ہیں، اور میں خود اس زبان میں زیادہ بے تکلفی سے اظہارِ خیال کر سکتا ہوں۔

میں اس وقت آپ کا قیمتی وقت جزئی مسائل، ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت (مسلمانوں) کی شکایات و ضروریات کے تذکرہ میں صرف نہیں کروں گا، میں اس وقت جو کچھ عرض کروں گا وہ ہندوستان کے عمومی مفاد میں اور اصولی انداز میں ہوگا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے اس ملک کے بقاء، ترقی، عزت و استحکام اور اس کا معاصر دنیا اور خطرناک و پیچیدہ عالمی صورتِ حال میں اپنا شایانِ شان کردار ادا کرنے کے لئے صحیح، محفوظ، باعزت اور بے خطر راستہ وہی ہے، جو تحریک آزادی کے مخلص دانشور اور بلند قامت وقیمت رہنماؤں گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور ان کے ساتھیوں نے تجویز کیا تھا، اور وہ سچے 'سیکولرزم' صحیح جمہوریت اور ہندو مسلم اتحاد کا راستہ ہے، خواہ وہ کتنا طویل اور مشکل ہو، اس کے علاوہ جو راستہ تجویز کیا جائے گا، اس سے خواہ عارضی و وقتی طور پر کامیابی حاصل ہو، وہ ملک کے لئے تباہ کن اور ان قربانیوں پر پانی پھیرنے والا ہے، جو جنگ آزادی میں عمل میں آئیں، اور ملک کو ایسی مشکلات و مسائل سے دوچار کرنے والا ہے جن کا کوئی حل نہیں ہے۔

پہلی چیز جس کو میں مذہب، انسانی تاریخ، فلسفہ اور اخلاق کا ایک طالب علم ہونے کے ناطہ عرض کرنا چاہتا ہوں اور مجھے اندیشہ ہے کہ شاید دوسرا شخص جس پر سیاسی طرزِ فکر غالب ہے نہ کہے گا، وہ یہ کہ اس ملک کے لئے دو خطرے بڑے تشویشناک

ہیں اور آپ کی پہلی توجہ کے مستحق ہیں، ایک ظلم و تشدد کا رجحان، انسانی جان و مال اور عزّت و آبرو کی بے قیمتی (خواہ اس کا تعلق کسی فرقہ سے ہو) جس کا ظہور فرقہ وارانہ فسادات، طبقاتی اونچ نیچ کی بنا پر پورے پورے خاندانوں اور محلوں کی صفائی، تھوڑے سے مالی فائدہ کے لئے انسان کی جان لے لینا، سفّاکانہ جرائم اور مظالم کی کثرت اور سب کے آخر میں لیکن سب سے زیادہ شرمناک حقیقت مطلوب و متوقع جہیز نہ لانے پر نئی بیاہی دلہنوں کو جلا دینا یا زہر دے کر مار دینا اور ان سے پیچھا چھڑانا ہے۔

جو لوگ مذہب پر یقین رکھتے ہیں، اُن کے لئے تو یہ سمجھنا بہت آسان ہے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا اور چلانے والا جو ماں سے زیادہ محبّت کرنے والا اور مہربان ہے، اس عمل سے خوش نہیں ہو سکتا، اور اس کو زیادہ دن برداشت نہیں کرے گا اور اس کے نتیجہ میں ہزاروں کوششوں اور قابلیتوں کے باوجود کوئی ملک پنپ نہیں سکتا اور وہ معاشرہ زیادہ دن باقی نہیں رہ سکتا، لیکن جو لوگ مذاہب پر اعتقاد نہیں رکھتے، وہ اس تاریخی حقیقت سے واقف ہیں کہ اس سے کم درجہ کے ظلم اور سفّاکی کی وجہ سے بڑی بڑی شہنشاہیاں اور وہ تہذیبیں جن کا کسی زمانہ میں ڈنکا بجتا تھا، اور آج بھی تاریخ و ادب کے صفحات پر اس کے تابندہ نقوش ہیں، خاتمہ اور زوال کا نشانہ بنیں، وہ ہے ایک ہی فرقہ سے مطالبات اور اس پر تنقید کا سلسلہ، اپنے کو بالکل بدل دینے اور اپنے ملّی و تہذیبی و مذہبی تشخّصات سے دست بردار ہو جانے کا مسلسل مطالبہ سیکڑوں اور ہزاروں برس کی سوئی ہوئی بلکہ مری ہوئی تاریخ کو دوبارہ جگانا اور زندہ کرنا، جو تبدیلیاں صدیوں پہلے (اچھی یا بری) ہوئیں اور اُن کو اس ملک کے حقیقت پسند، فراخ دل اور

غیرت مند شہریوں نے صدیوں گوارا کیا، ان کے سفر کو پہلے قدم سے شروع کرنا اور ان کی تلافی کی کوشش، اس ملک کو ان نئے مسائل و مشکلات سے دوچار کرے گی جن کا مقابلہ کرنے کی اس ملک کو نہ فرصت ہے نہ ضرورت، اور اس طرح حکومت، انتظامیہ اور دانشور طبقہ کی توانائی بے محل صرف ہوگی، جس کی ملک کو اپنے تعمیری کاموں، سالمیت و استحکام میں ضرورت ہے، اس لئے اس شگاف کو جبکہ وہ معمولی توجہ اور مسالہ سے بند ہو سکتا ہے، اس سے پیشتر بند کر دیا جائے جب وہ ہاتھیوں سے بھی بند نہیں ہو سکے گا، ملک کے اس عمومی و بنیادی مفاد کی خاطر کسی کی ناراضگی یا الیکشن کے نتائج پر اثر پڑنے یا کسی ریاستی و مقامی انتظامیہ کی ناگواری کا خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ ملک ان سب چیزوں سے زیادہ عزیز، اور اصول، مصالح و فوائد پر مقدم ہے، اور یہ محض اصول پسندی ہی کا تقاضہ نہیں ہے، دوربین حقیقت پسند اور گہری سیاست کا بھی تقاضہ ہے، آپ کی غیر معمولی ذہانت، معاملہ فہمی اور اشاروں سے پورے مضمون اور مسئلہ کو سمجھ لینے کی خداداد صلاحیت کے پیش نظر میں اس سے زیادہ شرح و تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

تیسری چیز جو فوری توجہ کی مستحق اور تشویش کا باعث ہے، وہ اخلاقی و انتظامی انتشار (CORRUPTION) ہے، جو اس حد تک پہنچ گیا ہے، کہ اس کی وجہ سے بڑی بڑی حکومتیں زوال کا شکار ہو گئیں، اور داستانِ پارینہ بن کر رہ گئیں، اس صورتِ حال کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے، سیاسی مسائل اور انتخابی مہم سے زیادہ اس کے خلاف طوفانی مہم چلانے کی ضرورت ہے، اس کے لئے گاؤں گاؤں، محلہ محلہ جانے کی ضرورت ہے، سخت قوانین عبرت ناک

سزاؤں، ابلاغِ عامّہ (PUBLIC MEDIA) کے ذرائع سے کام لینے اور انتظامیہ (ADMINISTRATION) کو سخت سے سخت قدم اُٹھانے کی ضرورت ہے ورنہ "نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری"۔

اس سلسلہ کی دوسری چیز ہندو احیائیت (HINDU REVIVALISM) کی تحریک، ہندو پریشد، شیوسینا، آر ایس ایس اور فرقہ پرستی اور جارحیت و تشدّد کے کھلے رُجحانات کے سلسلہ میں ادنیٰ سی رعایت لچک اور نرمی ہے، جس سے وقتی طور پر خواہ کچھ فائدہ پہنچ جائے یا پریشانی سے بچا جاسکے، ملک کو زمین دوز اور دھماکہ خیز سرنگوں پر چھوڑ دینا ہے، جو بالآخر ملک کو لے ڈوبے گی، گاندھی جی اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے کہ فرقہ وارانہ منافرت، تشدّد اور جارحیت، پہلے ملک کے دو عنصروں (ہندو مسلم فرقوں) کے درمیان اپنا کام کرے گی، پھر بھی ذیلی مذہبی اختلافات، طبقات اور برادریوں کی صف آرائی اور نسلی، لسانی، صوبائی و علاقائی تعصّبات کی شکل میں ظاہر ہوگی، اور جب یہ کام بھی ختم ہوجائے گا تو وہ آگ کی طرح (جب اس کو جلانے کے لئے ایندھن نہ ملے تو اپنے کو کھانے لگتی ہے) ملک کو اور امن پسند شہریوں کو اپنا لقمہ بنالے گی اور یہ ملک تباہ ہوکر رہ جائے گا۔

یہ اس جارحانہ احیائیت (AGGRESSIVE REVIVALISM) مجھے اس ملک کی تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملی، آپ اس سلسلہ میں سرکاری رپورٹوں اور ملک کے نظم و نسق کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور ترقی کو نہ دیکھئے، عام شہریوں، متوسط درجہ کے آدمیوں، اور ان لوگوں سے پوچھئے جن کا عدالتوں، دفاتر،

ریلوے، ہوائی سروس، پولیس، تھانوں، ٹیلیفون، اسپتالوں، سرکاری ٹھیکوں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے کام پڑتا رہتا ہے، رشوت کے بغیر ادنیٰ درجہ کا کام نہیں ہوسکتا، پیسہ کے ذریعہ ہر کام کرایا جاسکتا ہے، ہر مجرم کو چھڑایا جاسکتا ہے، ہر شریف انسان کو پھانسا جاسکتا ہے، ہر طرح کا غلط فیصلہ حاصل کیا جاسکتا ہے، ہر جگہ فساد کرایا جاسکتا ہے، یہاں تک کہ ملک کے راز بھی بیچے جاسکتے ہیں، دواؤں اور غذاؤں میں ملاوٹ ہورہی ہے، طبّی امداد ملنی مشکل ہورہی ہے، مریضوں کے لئے جو انتظامات ہیں وہ بیکار جارہے ہیں، سنگدلی اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے، ریلوے، ہوائی سروس میں رشوت کی گرم بازاری سے حکومت کو روزانہ لاکھوں کروروں روپے کا نقصان ہورہا ہے، اس سب کی جڑ میں پیسہ کی حد سے بڑھی ہوئی محبت، خدا کا خوف دل سے نکل جانا اور انسان سے ہمدردی، ملک سے وفاداری اور اس کے مفاد کو ترجیح دینے اور اس کے نقصان کا خیال رکھنے کے جذبہ کا ختم ہوجانا ہے، ایسی صورت میں ملک صنعتی طور پر، سیاسی طور پر اور خارجی تعلقات کی بنیاد پر ترقی اور تعلیم کی اشاعت اور خواندگی کا تناسب بڑھ جانے کے باوجود تیزی سے زوال کی طرف جارہا ہے، لوگ زندگی سے عاجز ہیں اور آخری شرم وناکامی کی بات یہ ہے کہ انگریزوں کے دورِ غلامی کو یاد کرتے اور اس کی تمنّا کرتے ہیں، جب انتظامیہ چوکس تھی، ریلیں وقت پر چلتی اور پہنچتی تھیں، ہسپتال اطمینان و خوشی اور خدمت وراحت کے ٹھکانے تھے، نوجوان اپنی محنت ولیاقت سے پاس ہوتے تھے، تقرّریاں اور ترقیاں قابلیت اور استحقاق کی بناء پر ہوتی تھیں، اب یہ سب چیزیں خواب وخیال ہوگئیں۔

یہ تینوں چیزیں فوری توجہ کی مستحق ہیں، اور انھیں کی بنیاد پر مستحکم اور دیرپا حکومت قائم ہو سکتی ہے، اس سلسلہ میں اتنا عرض کرتا چلوں کہ اس میں طریقِ انتخاب، ووٹرس کو ہر حال میں خوش رکھنے، حلقہ ہائے انتخاب کے نمائندوں کی ہر بات ماننے، پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ممبران کو ہر طرح کی ایسی رعایت دینے کو خاص دخل ہے کہ وہ جو غلط کام کرا سکیں ان کو کھلی چھوٹ ہے، اور پارلیمنٹ کی ممبری ایک ایسی سونے کی چڑیا یا قدیم زمانہ کا افسانوی پرندہ "ہُما" ہے کہ جس کے سر پر بیٹھ جائے اس کو بادشاہی مل جائے۔

آخر میں ایک بات ایک مذہبی انسان اور تاریخِ عالم اور سیاسیات قدیم و جدید کے ایک طالب علم و مصنّف کی حیثیت سے اور کہنا چاہتا ہوں کہ تاریخ و تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ سب سے بڑی سیاست "خلوص" ہے، آخر میں اسی کی فتح اور اسی کے حامل کو کامیابی حاصل ہوتی ہے، اور وہی وہ ہتھیار ہے جو دشمنوں کو دوست اور دوستوں کو فدائی بناتا ہے، اور بالآخر کامیابی دلاتا ہے، یہی وہ خلوص ہے، جس کا ماں کی مامتا میں، پیغمبروں اور بے لوث درویشوں کی شفقت میں، ملکوں کو آزاد کرانے والوں اور اپنے خاندان اور عزیزوں کو بھول کر ملک و قوم کی خاطر بیگانوں کو ترجیح دینے والوں اور ذاتی و خاندانی سربلندی کے بجائے ملک کی طاقت و عزّت کو مقدم رکھنے والوں کی بلند نگاہی میں اظہار ہوا ہے، اور اب بھی ہندوستان جیسے عظیم ملک اور مختلف المذاہب اور مختلف الاقوام معاشرہ اور نئے نئے مسائل کا مقابلہ کرنے والے عہد کو یہی "خلوص" بچا سکتا ہے، اور ہمیں آپ سے اسی کی امید اور اسی کی ضرورت ہے۔

انسانی اخلاق اور سچی حُبّ الوطنی کی بنیاد رابطۂ عوام (MASS CONTACT) کی کوشش ہے، جس میں فرقہ وارانہ رواداری، احترام انسانیت اور بقائے باہم (CO-EXISTENSE) کی اپیل کی جائے یہ تحریک اور کوشش شہروں کے ساتھ قصبات، دیہاتوں اور گھر گھر پھیلائی جائے اور پوری سرگرمی اور طاقت کے ساتھ چلائی جائے۔

فرقہ وارانہ منافرت کا زہر ایک دوسرے کی طرف سے غلط فہمیاں اور بدگمانیاں غیر ملکی حکمرانوں نے منصوبہ بند طریقہ پر پھیلائیں اور بقول ایک انگریز مؤرخ و مصنّف[1] کے کہ "اس تاریخی کتاب میں ایسا مواد جمع کر دیا ہے کہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کے دل کبھی مل نہیں سکتے" پھر تنگ نظر اور غلط اندیش تاریخ نویسوں اور نصابِ تعلیم مرتّب کرنے والے مصنفین اور محکمۂ تعلیم نے اس کام کو آگے بڑھایا اور اسی روش پر چلے اس کا نتیجہ ہے کہ ہماری نئی نسل اور تعلیم یافتہ طبقہ کا ذہن ہندوستان کے سابق حکمرانوں بلکہ ملک کی سب سے بڑی اقلّیت مسلمانوں کے بارے میں غلط تصوّرات بلکہ معاندانہ جذبات رکھتا ہے اور وہ زہر اُن کی پوری زندگی اور کردار میں سرایت کر گیا ہے، ضرورت ہے کہ نصابِ تعلیم کی فوراً اصلاح کی جائے، نصابی تاریخی کتابوں اور مضامین سے یہ مواد نکالا جائے، اس کے بغیر صاف ذہن کی نئی نسل تیار نہیں ہو سکتی جس کی اس ملک کو ضرورت ہے۔

ہندوستان کا پریس حتیٰ کہ "ذرائع ابلاغ" (PUBLIC MEDIA) خبریں دینے اور تبصرہ کرنے میں اکثر غیر ذمّہ دارانہ روش اختیار کرتے ہیں، اور ان کی وجہ سے پبلک کا ذہن متاثر بلکہ مشتعل ہوتا ہے، اور بجائے قرب و اعتماد حاصل ہونے کے

---

[1] (ELLIOT)

نفرت و حقارت اور انتقامی جذبہ پیدا ہوتا ہے، وہ رائی کا پربت بناتے ہیں اور واقعہ کی یکطرفہ تصویر دکھاتے ہیں، جب تک پریس اور ذرائع ابلاغ پر قابو نہیں پایا جائے گا اور ان کا صحیح استعمال نہیں ہوگا ملک کی آبادی کے مختلف عناصر کی یہ دوری اور ایک دوسرے کے خلاف بداندیشی اور بدگمانی دور نہیں ہوگی۔

انگریزوں نے (چونکہ وہ سات سمندر پار سے آکر اس ملک پر حکومت کر رہے تھے، جس کا ان کو کوئی استحقاق نہ تھا، اور وہ اپنی حکومت کو صرف خوف و رُعب کے ذریعہ قائم رکھ سکتے تھے) انھوں نے پولیس کی شکل میں ایک ایجنسی قائم کی جو لوگوں پر حکومت کا خوف اور رُعب قائم کر سکے، اور وہ ہمیشہ اس سے لرزہ براندام رہیں، اور اپنی عزّت و عافیت کی خیر منائیں، انھوں نے نہ صرف اس میں کام کرنے والوں کی اخلاقی تربیت سے اعراض کیا بلکہ اس کو اس کے برعکس ایسی تعلیم دی، اور اس کو اس کی کامیابی کا معیار قرار دیا کہ جس سے ہر شریف آدمی اور باعزّت انسان ڈرتا ہے۔

جب خود ہندوستانی اور اہلِ ملک، ملک کی حکومت و انتظامیہ پر فائز ہیں، تو ان کو پولیس کی انسانی اخلاقی تربیت کرنی چاہیے، ان میں خدمت و اعانت وہمدردی کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے، اور پولیس کو ایک ایسے شریفانہ ادارہ اور ہمدرد انسان اور اپنے ہم وطنوں کے خادم کی شکل میں تبدیل کر دینے کی کوشش کرنا چاہیے کہ لوگوں کا ان کے بارہ میں تصوّر و تاثّر بدلے، اور وہ ان کو اپنا محافظ و معاون سمجھیں، ان کے دائرۂ اثر میں کوئی فرقہ کسی فرقہ کے ساتھ، کوئی فرد کسی فرد کے ساتھ زیادتی نہ کر سکے اور وہ فرقہ وارانہ فسادات اور ظلم و تعدّی کے راستہ میں (خواہ وہ کسی فریق کی طرف سے ہو) سدِّ سکندری بن جائیں۔

اسی کے ساتھ مسلمانوں کے پرسنل لا میں مداخلت اور کسی ایسے اقدام اور قانون سازی سے احتیاط اور خاموشی برتی جائے جس کو مسلمان اپنے دین میں مداخلت اور دستورِ ہند کی دی ہوئی آزادی کی تنسیخ کے مرادف سمجھیں، آنجہانی راجیوجی کے زمانہ میں نفقۂ مطلّقہ کے سلسلہ میں سپریم کورٹ نے ایک فیصلہ دیا جس کی مخالفت میں مسلمانوں نے ایسا ملک گیر احتجاج کیا جس کی (جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے) ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد مشکل سے مثال ملے گی، آنجہانی راجیوجی نے اس موقعہ پر حقیقت پسندی اور اخلاقی جرأت سے کام لیا اور پارلیمنٹ میں نفقہ طور پر مسلمانوں کے مطالبہ اور مرضی کے مطابق وہ بل پاس ہوگیا جس سے ان کے مذہب و شریعت کے مطابق قانون بنا اور سپریم کورٹ کا فیصلہ منسوخ ہوگیا، میری مخلصانہ درخواست ہے کہ آئندہ بھی کسی انتہا پسند فریق کے اثر میں آکر کوئی ایسی غلطی نہ کی جائے جس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں جو اپنے مذہب و قانون (شریعت) کے بارہ میں بڑے حسّاس اور غیور واقع ہوئے ہیں کوئی ردّ عمل پیدا ہو۔

آخر میں پھر آداب و تسلیمات اور نیک دعائیں اور نیک خواہشات۔

مخلص
سید ابوالحسن علی ندوی

لکھنؤ

یکم جولائی ۱۹۹۱ء

اشتراکیت کا روس میں زوال اور ترکستان میں انقلاب کے آثار

جولائی ۱۹۹۱ء میں روس میں اشتراکیت کے زوال کے واضح آثار ظاہر ہوئے، اور اس کی امید اور علامتیں بھی نظر آئیں کہ ترکستان کا وہ مردم خیز مجاہد ملت اور ائمہ ساز اور ماہر دین آفریں خطہ جس نے علوم دینیہ میں امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاریؒ، فقیہ اکبر امام مرغینانی صاحب ہدایہ اور بانی سلسلہ عالیہ نقشبندیہ خواجہ بہاء الدین نقشبند جیسے نادرۂ روزگار پیشوا پیدا کئے، وہ پھر آزادی کی سانس لے سکے گا، اور اگر عالم اسلام کو نئے تحائف اور نادرۂ روزگار افراد نہیں پیش کر سکے گا تو اسلام کی تعلیمات پر آزادی کے ساتھ عمل کر سکے گا اور نئی نسل کو اسلام کی تعلیمات اور اس کی سیرت اور خصوصیات پر اٹھا سکے گا۔ والغیب عند اللہ۔

اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر کی ایک تقریر

سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز (آکسفورڈ یونیورسٹی) کی میٹنگ سے فارغ ہو کر (جس کے راقم الحروف صدر اور مولوی محمد رابع ندوی رکن انتظامی ہیں) راقم اور اس کے رفیق عزیز مولوی محمد رابع ندوی کو اسلامک فونڈیشن واقع لیسٹر (LEICESTER) میں دعوت دی گئی، دونوں نے ۳ ستمبر ۱۹۹۱ء کو وہاں کے ایک جلسہ میں جس میں اہل علم اور دعوتی و تحقیقی کام کرنے والوں کا ایک وسیع مجمع تھا، شرکت کی، قاری نے اپنی قراءت میں سورۂ ابراہیم کی آیت "أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۝ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ" (سورۂ ابراہیم ۲۴-۲۵)

پڑھی اور ایسا معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ناچیز مقرر کی رعایت سے الہامی طور پر اس آیت کے انتخاب کی توفیق عطا فرمائی اور مقرر کو جو خالی الذہن تھا، تقریر کے لئے ایک اعلیٰ مضمون اور ایک رہنمائی مل گئی، اس نے پہلے عربی میں پھر اردو میں اس آیت کی رہنمائی میں مفصل تقریر کی جس کا عنوان تھا، "دین حق و دعوت اسلام ایک فلک بوس و صدا بہار درخت ہے"[1]۔

ایک عارف باللہ کی وفات

۳ ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ ہجری کی اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۱ء عیسوی کی تاریخ تھی کہ اچانک بھوپال میں (جہاں راقم رابطۂ ادب اسلامی کے جلسہ میں شرکت کے لئے گیا ہوا تھا) اچانک ٹیلیفون سے حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوری کی وفات کی اطلاع ملی، جو دل و دماغ پر بجلی بن کر گری، مولانا بیک واسطہ اویسِ زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے سلسلہ میں صاحبِ ارشاد اور صاحبِ اجازت تھے، آپ نے ۹۳ سال کی عمر میں وفات پائی، اور اس سے ایک ایسا روحانی و دینی خلا پیدا ہو گیا، جس کا اس دور قحط الرجال میں پُر ہونا بہت دشوار نظر آتا ہے، اس بات سے دل کو تھوڑی سی تسکین ہوئی کہ ایک ہی ہفتہ پہلے یہ راقم اپنے چند عزیزوں کے ساتھ الہ آباد جا کر (جہاں آپ مستقل مقیم تھے) زیارت و عیادت کر آیا تھا، اور حضرت کی اس نگاہِ شفقت اور التفاتِ خاص سے ممنون و مشرف ہوا تھا، جو شروع سے اس راقم کے ساتھ رہا ہے۔

---

[1] تقریر طبع شدہ "تعمیر حیات" شمارہ ۱۰ فروری ۱۹۹۲ء جسے "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ" نے الگ سے رسالہ کی شکل میں شائع کیا۔

بہر تسکیں دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر
جو بوقت ناز کچھ جنبش ترے ابرو میں تھی[1]

ہندوستان کی سالمیت سیکولرزم پر قائم رہ سکتی ہے

۶؍اکتوبر ۱۹۹۱ء کو آل انڈیا مسلم انٹلکچول فورم کے زیر اہتمام لکھنؤ میں ایک سیمینار راقم کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں وزیر پرواز مسٹر مادھو راؤ سندھیا نے شرکت کی، راقم نے سیکولرزم کو اس پودے سے تعبیر کیا جو سانپ اور زہریلے کیڑے مکوڑوں کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا، راقم نے ایک رئیس کا قصہ سنایا کہ اس کے پاس ایک وسیع اور سرسبز باغ تھا، اس نے انتقال کے وقت اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ اس باغ میں ہر طرح کا تصرّف اور تبدیلی کرنا لیکن اس پودے کو اپنی جگہ پر باقی رکھنا، اس نے اس کا راز اور وجہ نہیں بتائی، جب خزاں کا دور آیا اور پھولوں کے درخت اور پودے مرجھا گئے تو اس رئیس کے فرزند نے سب جھاڑ جھنکاڑ دور کردیے اور اس پودے کو بھی اکھاڑ کر پھینک دیا، یہ کرنا تھا کہ ایک سانپ بل سے نکل آیا اور اس نے اس کو ڈس لیا، بعد میں معلوم ہوا کہ اس پودے کی یہ خاصیت تھی کہ یہ جہاں ہوتا ہے وہاں سانپ نہیں آسکتا، یہی معاملہ ہمارے ملک کا ہے کہ اگر سیکولرزم (SECULARISM) (نامذہبیت) عدم تشدد کا پودا یہاں سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا تو پھر تشدّد (NON-VIOLENCE) اور مذہبی تعصب کا اژدہا نکل آئے گا، اور وہ کوئی رعایت نہیں کرے گا۔

---

[1] مولانا کے حالات و کمالات اور آپ کی کتاب "عرفان محبت" پر مفصل تذکرہ و مضمون "پرانے چراغ" کے جلد سوم میں دیکھا جاسکتا ہے۔

راقم نے یہ بھی کہا کہ یہ بڑی خطرناک بات ہوگی کہ تاریخ کو الٹا سفر کرایا جائے، تاریخ ایک سوتا ہوا شیر ہے، اگر اس کو جگا دیا گیا اور یہ اٹھ گیا تو دو ہزار برس تک کسی اور طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں ملے گی، اور ملک میں جو تبدیلیاں وقتاً فوقتاً آتی رہیں، انھیں کو ختم کرنے میں ساری توانائی اور ملک کے وسائل اور اس کو ترقی دینے کے مواقع اس کی نذر ہو جائیں گے، اس جلسہ میں مرکزی وزراء مسٹر غلام نبی آزاد، مسٹر سلمان خورشید اور مادھو راؤ سندھیا جی نے بھی تائیدی تقریریں کیں۔

خلفائے اربعہ کی ترتیب خلافت میں حکمت قدرت الٰہی کی کارفرمائی

حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے اقدام میں امت کے لئے رہنمائی ہے

۱۵ محرم الحرام ۱۴۱۲ھ مطابق ۲۸ جولائی ۱۹۹۱ء کو مولانا عبدالشکور ہال واقع احاطہ شوکت علی لکھنؤ میں ان جلسوں کی آخری نشست تھی، جو شہدائے اسلام کے عنوان سے ہر سال محرم کے مہینہ میں دارالمبلغین لکھنؤ کے زیر اہتمام منعقد ہوتے ہیں، اس جلسہ میں راقم نے غیر جانبدارانہ تاریخی مطالعہ کا نتیجہ اور ایک نئے انداز سے دعوت فکر دی، وہ یہ کہ خلفائے اربعہ جس ترتیب سے مسند خلافت پر آئے وہ محض کوئی اتفاقی واقعہ اور کوشش و خواہش کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ وہ ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ کا مصداق تھا، ہر خلیفۂ راشد نے اپنے وقت کا وہ تقاضا پورا کیا اور اسلام کی حفاظت و تقویت، ملت کی قیادت اور غلبہ کا وہ کارنامہ انجام دیا جو اس وقت ضروری تھا، اور جس کے لئے موزوں ترین شخصیت اسی خلیفہ کی ذات تھی، جو مسند آرائے خلافت تھی، اور جس کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا۔

پھر حضرات حسنین رضی اللہ عنہما میں سے ہر ایک کا اقدام ملت کے مفاد میں تھا اور اُن کے حسبِ شان۔[1]

رابطۂ ادب اسلامی کا اجلاس بھوپال میں

رابطۂ ادب اسلامی کی ساتویں علمی مجلس مذاکرہ ۵ تا ۷ ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۳ تا ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو بھوپال میں دار العلوم تاج المساجد کے زیر اہتمام منعقد ہوئی، ان نشستوں میں دعوتی و اصلاحی ادب کے موضوع پر ان فضلاء نے مقالات پڑھے جن کا تعلق بھوپال، لکھنؤ، علی گڑھ، دہلی، سورت، اورنگ آباد کالی کٹ، حیدرآباد، الہ آباد، بنارس، پونہ، اور ناگپور کی دانشگاہوں اور علمی و ادبی مراکز سے تھا، حجاز سے رابطۂ عالمِ اسلامی کے نمائندہ کی حیثیت سے شیخ محمد بن ناصر العبودی اس جلسہ میں شرکت کے لئے تشریف لائے دار العلوم تاج المساجد کے ذمّہ داروں و اساتذہ اور مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب مرحوم کے خاندان کے عزیز و فاضل افراد نے پورا تعاون کیا اور جلسہ کو کامیاب بنانے کی پوری کوشش کی۔

راقم نے اپنی تقریر میں "کَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ" سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ ادب کی انقلاب آفرینی اور غیر معمولی تاثیر اور بقائے دوام کے لئے سوز و ساز اور جذب و خلوص ضروری ہے، اس نے کہا کہ شاعری ہو یا خطابت، مکاتیب و رسائل ہوں یا دوسرے اصنافِ ادب ان میں

[1] یہ تقریر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی طرف سے علیحدہ رسالہ کی شکل میں شائع ہو گئی ہے۔

کلمہ تو خوب ملے گا لیکن کلمہ کے ساتھ طیّبہ نہیں، کلمۂ طیّبہ کی تمثیل کے لئے دنیا کی بے شمار مخلوقات تھیں مگر قرآن پاک نے اس کو درخت سے تشبیہ دے کر اس کے فیض رسانی کی طرف اشارہ کیا جس کے نتیجہ میں بڑے بڑے عالم ربّانی اور صحیح الفکر لوگ پیدا ہوئے، اور تمام قباحتوں اور جاہلی رسوم و رواج کا خاتمہ ہوا، آج بھی کلمہ کے اعلان نے ہمیں یہاں جمع کیا ہے، اور یہی ہمارے لئے سب سے مستحکم رشتہ ہے۔

یہ بھی عرض کیا گیا کہ ان غلط فہمیوں کو دور ہونا چاہیئے کہ ہمارے عہد کے داعیوں کو زبان و بیان کی ضرورت نہیں، جو لوگ زبان کی اصلاح کو پیشہ ورانہ شئے سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں، ان کے سامنے حضرت حسن بصریؒ، سیدنا عبد القادر جیلانیؒ، شیخ مجدّد سرہندیؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ وغیرہ کی مثال سامنے رہنی چاہیئے۔

جامعات اور دانش گاہوں کے فاضل اساتذہ اور نمائندوں نے بھی تیز عربی مدارس کے بعض اساتذہ نے بھی فاضلانہ اور فکر انگیز مقالات پڑھے، آخر میں صدارتی تقریر میں کہا گیا کہ :-

"یہ بھی تاریخ کا عجیب مُعمّہ ہے کہ جس طبقہ کو سب سے زیادہ حقیقت شناس فراخ دل اور متوازن ہونا چاہیئے تھا، اسی طبقہ نے کوتاہ نظری اور تنگ دلی کا مظاہرہ کر کے خود کو حرف و نقش میں قید کر لیا ہے، جن لوگوں کا قلب و جگر جمال و کمال سے آراستہ ہونا چاہیئے تھا، انھوں نے ہی ادب کو چند محدود اصطلاحات اور مقاصد تک محدود کر لیا ہے، اقبال نے صحیح کہا ہے ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

بھوپال کے رابطۂ ادب اسلامی کے اجلاس سے فارغ ہو کر راقم سطور (اپنے چند رفقاء کے ساتھ جن میں رابطۂ عالمِ اسلامی کے نائب سکریٹری جنرل اور راقم کے قدیم دوست شیخ محمد ناصر العبودی قابلِ ذکر ہیں) نے اندور کا رخ کیا، جو ہمارے عزیز رفیق و شریک کار مولوی قاضی معین اللہ صاحب ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء کا وطن اور تاریخی شہر ہے، اور وہیں مولوی ابوالبرکات ندوی فاروقی کی (جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے اس وقت طالب علم تھے، جب العبودی صاحب جامعہ کے رجسٹرار تھے) نظامت میں ایک عربی دینی مدرسہ بھی قائم ہے، عبودی صاحب کو وہ مدرسہ بھی دکھانا تھا، اور مانڈو کی سیر بھی کرانا تھا، جو ہندوستان کے سرسبز ترین پہاڑوں اور تاریخی و اسلامی آثار سے مملوء ہے، ایک قدیم مسلم ریاست (خلجی بادشاہوں) کا دارالسلطنت اور بعض سلاسل طریقت کے مشائخ کبار اور علماء کا مرکز بھی رہا ہے، یہ سفر حسبِ توقع بہت دلچسپ، خوش گوار اور مفید رہا۔

جامعہ سلفیہ بنارس کی سیرت کانفرنس اور اس کا خطبہ

۲۷/۲۸ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو جامعہ سلفیہ (مرکزی دارالعلوم) بنارس کے زیرِ اہتمام سیرت طیبہ پر ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں راقم بھی مدعو تھا، یہ خیال کر کے کہ اس کانفرنس میں (حکومت سعودیہ و ممالک عربیہ سے روابط اور تعلقات کی بناء پر) مصر و حجاز سے بہت سے فضلاء آئیں گے راقم نے اپنا مضمون عربی میں تیار کیا، جس کا خلاصۂ عنوان یہ تھا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا سب سے بڑا کارنامہ اور اُن کی خصوصی علمی، انقلابی کوشش یہ ہے کہ ذات و صفاتِ الٰہی کی معرفت اور

حقائقِ دین کے علم کا ذریعہ صرف نبوت ہے اور اس کے علاوہ سب ذرائع معلومات مشکوک اور ظن وتخمین سے مملوء ہیں۔[1]

شیخ الاسلام نے ایک بات اور بڑے کام کی کہی ہے جس کی قدر علماءِ کلام وماہرینِ نفسیات ہی کر سکتے ہیں کہ فلسفۂ یونان کا زیادہ تر زور نفی پر ہے، وہ جب نفی پر آتے ہیں، تو بڑا وسیع میدان سامنے کر دیتے ہیں، اور جب "اثبات" کا موقع آتا ہے تو ایک دو لفظ بول کر خاموش ہو جاتے ہیں، صفات اور افعالِ الٰہی کے بارہ میں ان کا یہی رویہ ہے، خالقِ عالم یہ نہیں ہے، یہ نہیں ہے، یہ نہیں ہے، لیکن وہ کیا ہے اور کیسا ہے؟ یہاں پر ایک ہی دو باتوں پر اکتفا کرتے ہیں، حالانکہ زندگی اثبات پر چلتی ہے، نفی پر نہیں، اس کے برخلاف صُحُفِ سماوی اور کلامِ انبیاء میں نفی مجمل ہے، اور اثبات مفصل، نفی کا موقع آیا تو فرما دیا کہ "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" اس کے برخلاف اثبات سے سارا قرآن مجید بھرا ہوا ہے اور کہا گیا "وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا۔"

افسوس ہے کہ بعض موانع اور وقت کی کمی کی وجہ سے سوائے شیخ عبداللہ بن عبدالمحسن ترکی اور اُن کے معاون ورفیقِ سفر استاذ عبدالحلیم عویس کے کوئی عرب فاضل نہیں آسکا، راقم نے بنارس کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کی شرکت کی وجہ سے شب میں "پیامِ انسانیت" پر ایک تقریر بھی کی جو وقت کی ایک اہم ضرورت اور قابلِ توجہ مسئلہ ہے۔

---

[1] یہ مقالہ ایک رسالہ کی شکل میں "مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام" کی طرف سے شائع ہو گیا ہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس دہلی

۲۳/۲۴ نومبر ۱۹۹۱ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا دسواں سالانہ اجلاس جامعہ نگر اوکھلا میں منعقد ہوا، راقم نے مفصل خطبۂ صدارت پڑھا جو علٰحدہ سے شائع ہو گیا ہے، اس میں عائلی قانون کی وحدت کی ضرورت پر جو مبالغانہ اور غیر دانشمندانہ زور دیا جا رہا ہے، اس پر تنقید اور جرح کی گئی اور اس سلسلہ میں مشہور برطانوی ماہر قانون بوڈر ہیمر (BODER HEIMER) کے فلسفۂ قانون کے مضمون کا ایک اقتباس پیش کیا گیا، جو حقیقت پسندی سے کام لینے کے لئے کافی ہے:-

"کسی قانونی نظام سے جس کا منشا زندگی میں یکسانیت پیدا کرنا ہو اگر لوگوں کے ایک بڑے طبقہ میں یہ تأثر پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا تو اس قانون کو ٹوٹنے یا اس سے بچنے سے محفوظ رکھنا حکومت کے ذمہ داروں کے لئے انتہائی مشکل ہوگا، لوگ کسی ایسے قانون کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکتے، جسے وہ نامناسب یا ناقابلِ برداشت سمجھتے ہوں، جو حکومت اس قسم کے نظامِ قانون کو برقرار رکھنے پر مصر ہو تو اُسے اس کو نافذ کرتے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا، اس لئے کوئی نظام جس کی بنیاد انصاف پر نہ ہو غیر محفوظ اور پُر خطر ہوگا۔"

کرناٹک کا ایک سفر اور پیامِ انسانیت کے دو اہم جلسے

ریاست کرناٹک میں بھٹکل، نوائط کا ایک اہم مرکز ہے، جو اپنی بہت سی دینی، نسلی،

تہذیبی اور ثقافتی خصوصیات کی بناء پر پورے علاقہ میں ایک امتیاز و احترام کا مرکز ہے، ان میں اب بھی بہت سی عربی النسل خاندانوں کی خصوصیات باقی ہیں، عرصہ سے وہاں ندوۃ العلماء کی سرپرستی میں جامعہ اسلامیہ کے نام سے ایک تعلیم گاہ قائم ہے، جس کے اساتذہ تمام تر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل اور تربیت یافتہ ہیں، راقم کے محترم دوست جناب محی الدین منیری صاحب (جو زمانۂ سابق میں بمبئی کی کمیٹی خادم الحجاج کے ایک بڑے سرگرم اور مستعد کارکن تھے) اب اس کے نگراں و ناظم ہیں، راقم اپنے خصوصی رفقاء کے ساتھ بارہا وہاں کا سفر کر چکا ہے، اور وہاں اس کے خطابات کا مجموعہ الگ سے بھی شائع ہو چکا ہے، نومبر ۱۹۹۱ء کے آخر میں پھر وہاں کا سفر اختیار کرنا پڑا، اس موقع پر "پیام انسانیت" کے دو اہم جلسے بھی ہوئے جن میں ۲۹ر نومبر ۱۹۹۱ء کا بھٹکل کا جلسہ تھا اور یکم دسمبر ۱۹۹۲ء کا منگلور کا جلسہ شامل ہے، یہ دونوں جلسے بڑے کامیاب ہوئے، خصوصیت کے ساتھ بھٹکل کا جلسہ بڑے وسیع پیمانہ پر اور بڑی سنجیدگی اور توجہ کی فضا میں انجام کو پہنچا، وہاں کے لوگوں کا بیان ہے کہ اس سے پہلے کبھی کسی جلسہ میں اتنی بڑی تعداد میں غیر مسلم جمع نہیں ہوئے ہندؤں کے اہم دھرم ادھکاری دھرم استھل اڑتی کے ذمہ دار، اور اس کے بڑے مندر کے پجاری ہیگڑے مہاراج بھی جلسہ میں شریک ہوئے، ان میں سے بعض ایسی شخصیتیں تھیں، جو اپنے آشرم سے بہت کم نکلتی ہیں، لوگوں کا اندازہ ہے کہ پچاس ہزار کا مجمع تھا، اور گوش برآواز تھا، اردو تقریر کا ترجمہ کنڑی زبان میں ہوا تو سننے والوں کا بڑا تأثر محسوس ہوا۔

منگلور کے جلسہ میں کرشنا مشن کے سوامی کے علاوہ کیتھلک طرز کے جرمن نژاد

پادری صاحب بھی تھے، پورا ہال تعلیم یافتہ، مہذب، متین اور سنجیدہ طبقہ سے بھرا ہوا تھا، باہر راہ داریاں بھی پُر ہوگئیں۔

۱۹۹۲ء کی آمد

اب یہاں سے ۱۹۹۲ء کا آغاز ہوتا ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں (خاص طور پر جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے) ۱۸۵۷ء سے مشابہت اور مماثلت رکھتا ہے، اس میں بعض ایسے واقعات پیش آنے والے ہیں جو آزاد، کثیر المذاہب اور متنوع ثقافتوں کے مرکز ہندوستان کی فضا پر بڑے اثر ڈالنے والے کثیر اور پیچیدہ مسائل پیدا کرنے والے اور ہندوستان سے باہر کی دنیا میں ہندوستان کی سالمیت اور صلح پسندی اور اس کے بعید النظر و عالی دماغ رہنماؤں اور اس کو آزاد کرانے والے سورماؤں کی کوششوں کے بارہ میں بڑے شکوک پیدا کرنے والے ہیں، جنتری کا جب یہ ورق الٹتا ہے تو کانوں میں ورق کے الٹنے کی ہلکی آواز کے ساتھ ایک غیبی صدا آتی ہے۔ ؎

اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی

مرادآباد کی دینی تعلیمی کانفرنس

۱۲ جنوری ۱۹۹۲ء کو انجمن تعلیمات دین مرادآباد کے زیر اہتمام دینی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں راقم کے علاوہ جو دینی تعلیمی کونسل کا صدر بھی ہے محترمی سید حامد سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھی شریک ہوئے، راقم نے مفصل مطبوعہ خطبۂ صدارت پڑھا اہلِ مرادآباد میں جن میں مولانا معاذ الاسلام صاحب سنبھلی

صدر مدرس مدرسہ عربیہ مرادآباد اور الحاج اکرام باری صاحب تاجر ظروف مرادآباد پیش پیش تھے، دینی تعلیمی کونسل کے سکریٹری اور روح رواں ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی سعودی عرب گئے ہوئے تھے اس لئے وہ شریک نہیں ہو سکے۔

مسجد اقصیٰ کے جلاوطن امام کی دار العلوم آمد اور خطاب

۱۲ر شعبان ۱۴۱۲ھ ۱۷؍ فروری کی، ار تاریخ (۱۹۹۲ء) کو اچانک معلوم ہوا کہ مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) کے سابق امام و خطیب اور فلسطینی تحریک کے سرگرم علم بردار ڈاکٹر محمد صیام دار العلوم آرہے ہیں، دار العلوم میں ان کے شایان شان استقبال کیا گیا، اور دار العلوم کی وسیع مسجد میں مسلمانوں نے بڑی مسرّت اور فخر کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی، شہری خاصی تعداد میں جمع ہو گئے تھے، بعد نماز انھوں نے مجمع سے خطاب کیا، راقم نے ان کی آمد کی مناسبت سے کہا کہ ان کی آمد اور ان کا یہاں نماز پڑھانا بیت المقدس کی باد بہاری اور نفحاتِ رحمت کا ایک جھونکا ہے، ڈاکٹر صیام نے پُرجوش لہجہ میں تقریر کی، وہ فلسطینی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی تھے، فلسطین سے اخراج کے بعد سے وہ سوڈان میں مقیم ہیں، اور تحریک کی قیادت کرتے ہیں۔

نماز سے پہلے ندوۃ العلماء کے وسیع سبزہ زار پر رابطۂ ادب اسلامی کی طرف سے ان کو استقبالیہ دیا گیا، اپنی جوابی تقریر میں انھوں نے راقم، سید قطب اور مولانا مودودی کو خراج تحسین پیش کیا اور ان کے طرز فکر اور طریق کار کی تحسین کی، اس موقع پر راقم کی اس تاریخی تقریر کا جو اس نے رابطۂ عالم اسلامی (مکہ معظمہ) کے ہال میں یا سر عرفات کی موجودگی میں کی تھی، ٹیپ سنایا گیا، جس میں ان کو صلاح الدین ایوبی کی طرح خالص مسلمانوں پر

اعتماد کرنے، ایمانی جذبہ، شوق شہادت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے مقصد سے کام لینے کی تلقین کی گئی تھی، اور کہا گیا تھا کہ صرف اسی کے ذریعہ فلسطین کا مسئلہ حل اور مسجد اقصیٰ کی بازیابی ہو سکتی ہے، اور یہی مسلمانوں کی سب سے بڑی طاقت ہے" اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○ (النساء: ۱۰۴) (اگر تم کو دکھ پہونچا تو وہ بھی تو دکھ اٹھائے ہوئے ہیں جیسے تم دکھ اٹھائے ہوئے ہو، اور تم اللہ سے وہ امید لگائے ہوئے ہو جو وہ نہیں رکھتے، اور اللہ تو ہے ہی بڑا علم والا بڑا حکمت والا)۔

اس تقریر کے بعد جمعیۃ الشباب الاسلامی کے ناظم مولوی سید سلمان حسینی ندوی نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا اور مولوی سید محمد رابع ندوی نے مہمان عزیز و محترم کو کچھ کتابوں کا تحفہ۔

مُحدّثِ جلیل و فاضلِ کبیر مولانا حبیب الرحمن اعظمی کی وفات

۱۱ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ ۱۷ مارچ ۱۹۹۲ء کی تاریخ تھی کہ محدث جلیل و فاضل کبیر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی وفات کی اچانک اطلاع ملی، راقم نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا کہ علوم دینیہ بالخصوص فنِّ حدیث کے سلسلہ میں جو عظیم علمی خسارہ ہوا ہے اور جو خلاء پیدا ہوا ہے اس کا احساس بہت سے لوگوں سے زیادہ اس عاجز کو ہے جس کی برصغیر ہندو پاک ہی نہیں بلکہ ممالک عربیہ اور مرکز اسلام پر بھی نظر ہے، اور وہاں کے علماء، اساتذہ، مصنّفین و محقّقین سے بہت سے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ واقفیت ہے، علم حدیث خاص طور پر عالمی و علمی پیمانہ پر جس انحطاط و تنزّل کا شکار ہے، اور اس فن شریف کی واقفیت میں جو سطحیت اور رسمیت پیدا ہو گئی ہے، اور

خاص طور پر حدیث و روایات صحیحہ اور فقہ حنفی کے درمیان تطبیق اور اس علمی حقیقت کے ثابت کرتے ہیں کہ مذہب حنفی حدیث کے خلاف نہیں ہے اور امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ اور خلفائے کبار محض قیاس و ذہانت پر اعتماد نہیں کرتے تھے ان کا ماخذ استنباط احکام میں آیات و احادیث ہی ہوتی تھیں، اس موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت مولانا کے ارتحال سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ اور بھی قابل افسوس ہے، اور اس کا پُر ہونا بظاہر اسباب بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔

بہار اور نیپال کے سفر

یکم مارچ ۱۹۹۲ء کو امارت شرعیہ بہار اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی دعوت پر مولانا برہان الدین صاحب استاذ تفسیر و حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء کی معیت میں پٹنہ کا سفر ہوا، وہاں ڈاکٹر احمد عبدالحی صاحب کے دولت خانہ پر قیام رہا یکم مارچ ۱۹۹۲ء کو گاندھی میدان پٹنہ میں ایک وسیع میدان میں اصلاح معاشرہ کے عنوان سے ایک عظیم جلسہ ہوا، اس عنوان اور موضوع پر اس سے پہلے اتنا عظیم جلسہ یاد نہیں آتا، شاید ۱۵-۲۰ ہزار کا مجمع ہو، اس نے بڑی توجہ سے تقریریں اور خطابات سنیں، اس جلسہ میں راقم سطور، مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب اور مولانا برہان الدین صاحب نے تقریریں کیں۔

پٹنہ سے آسنسول جانا ہوا جہاں مفید مجالس اور خطابات ہوئے آسنسول سے لکھنؤ واپسی ہوگئی۔

۳ مئی ۱۹۹۲ء اور شوال ۱۴۱۲ھ کے اواخر میں خانقاہ رحمانی مونگیر کے جامعہ کی

ایک عمارت کی تقریب سنگ بنیاد میں شرکت کے لئے مولانا محمد ولی رحمانی صاحب کی دعوت پر اور اس مرکز علمی و دینی و خانقاہ سے قدیم تعلق کی بنیاد پر مونگیر جانا ہوا، اس سے فارغ ہو کر ایک دن کے لئے بھاگلپور میں مولوی شرف عالم صاحب ندوی کے دولت خانہ پر (جو اس وقت حج پر گئے ہوئے تھے) قیام رہا اور وہاں اصلاح معاشرہ کے ایک عظیم جلسہ اور پیام انسانیت کے ایک محدود لیکن ممتاز حاضرین پر مشتمل جلسہ میں شرکت اور تقریر کا پروگرام رہا، اگلے دن نیپال کی طرف کو روانگی ہوئی جہاں ۳ ر ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ ۵ رمئی ۱۹۹۲ء کو دار العلوم نور الاسلام جلپا پور سنسری نیپال۔ جو مولوی ایوب صاحب ندوی فارغ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور دوسرے ندوی فضلاء (مولوی عباس ندوی، مولوی حیدر ندوی وغیرہ) کے زیر اہتمام و تدریس عرصہ سے چل رہا ہے اور اچھا کام کر رہا ہے، میں اساتذہ، طلبہ اور اطراف و جوانب کے خواص و عوام کے ایک بڑے مجمع کو خطاب کیا گیا[1]، افسوس ہے کہ وقت کی کمی اور ملک کے حالات و مسائل کی اہمیت و سنگینی کی وجہ سے نیپال کے دوسرے مقامات پر جانا نہیں ہو سکا، اور ایک ہی شب گزار کر اگلے ہی دن کٹیہار کے راستہ سے بذریعہ ٹرین لکھنؤ واپسی ہو گئی، دار العلوم نور الاسلام میں عزیز گرامی قدر مولوی قاری سید رشید الحسن (نبیرہ زادہ نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم) پر اچانک نظر پڑی جو کراچی سے یہاں آئے ہوئے تھے۔

---

[1] یہ تقریر "نیپال میں طلبائے علوم دینیہ اور عامۃ المسلمین سے خطاب" کے عنوان سے دار العلوم نور الاسلام جلپا پور کے شعبہ نشر و اشاعت کی طرف سے شائع ہو گئی ہے۔

مولانا محمد مسعود شمیم مکیؒ کی وفات

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کے حادثۂ وفات سے چند روز پہلے شعبان ۱۴۱۲ھ کے اواخر میں غالباً یکم مارچ ۱۹۹۲ء کو ایک اور حادثہ پیش آیا وہ مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے مہتمم و ناظم اور اس کے بانی حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کے خاندان کے چشم و چراغ مولانا محمد سلیم صاحب ناظم مدرسہ کے لائق فرزند مولانا محمد شمیم مکیؒ کا حادثۂ وفات ہے، جو شعبان ۱۴۱۲ھ کے اواخر (یکم مارچ ۱۹۹۲ء) کو پیش آیا، راقم اس وقت پٹنہ میں تھا، وہیں سے تعزیت کا تار ارسال کیا، ان کے ساتھ گزرے ہوئے اوقات اور ان کی خاطریں اور محبتیں یاد آئیں، اللہ تعالیٰ ان کے درجے بلند فرمائے اور مدرسہ کو ہر طرح کے ابتلاء سے محفوظ رکھے۔

نواب عبید الرحمٰن خاں شروانی کی وفات

۵ مئی ۱۹۹۲ء یا ۷ مئی ۱۹۹۲ء کو اچانک مخدوم و محترم نواب عبید الرحمٰن خاں صاحب شروانی کی وفات کی اطلاع ملی اور ایسا محسوس ہوا کہ اپنے ہی خاندان کے ایک بزرگ شفیق اور سرپرست فرد کے ارتحال کا واقعہ پیش آیا، ان کے والد ماجد فخر زمانہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی یاد نے دل میں چٹکیاں لیں، ان کے کمالات، ان کی شفقتیں اور ندوۃ العلماء اور والد ماجد مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب سے ان کے مخلصانہ اور شریفانہ تعلقات اور ندوہ اور اس کے بانیوں اور معماروں سے ان کے ذہنی، فکری، علمی و روحانی روابط تصویر کی طرح

آنکھوں کے سامنے پھر گئے، نواب عبید الرحمٰن خاں صاحب شروانی نے ان تعلقات وروابط کو سینہ سے لگائے رکھا اور اپنے والد نامدار کی طرح ادارہ سے اس کے خادموں سے اور خاص طور سے اس عاجز راقم سطور سے ایک بزرگ فردِ خاندان کی طرح تعلق قائم رکھا، دار المصنفین اعظم گڑھ اور دار العلوم ندوۃ العلماء کی مجالسِ انتظامی میں وہ بڑے اہتمام سے شرکت فرماتے تھے اور اپنے قیمتی مشوروں اور تعاون سے مدد ورہنمائی فرماتے، علی گڑھ جانا ہوتا تو حبیب منزل (نواب صاحب کا دولت خانہ) میں حاضری باعث مسرت وعزت ہوتی اور پرانی یادیں تازہ ہوتیں، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کی خاندانی خصوصیات اور روایات (جن کے حامل ووارث اب ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شروانی (اطال اللہ بقاءہ) ہیں) برقرار رکھے۔

اس حادثہ کے ساتھ اپنے ایک محبّ ومخلص وفاضل دوست اور عربی کے ایک قادر الکلام شاعر، مدّاحِ رسولؐ وداعی إلی اللہ محترم عمر بہاء الدین الامیری کے حادثۂ وفات کی بھی اطلاع ملی جو ایک سے زائد بار لکھنؤ بھی تشریف لا چکے تھے، اور رابطۂ ادب اسلامی کے جلسوں میں یہاں، مدینہ طیبہ اور ریاض میں برابر دلچسپی اور سرگرم حصہ لیتے رہتے تھے۔

ایک اعزاز کے قبول کرنے سے معذرت

میں اپنے وطن رائے بریلی میں تھا کہ ایک دن ۲۰ یا ۲۱ جنوری ۱۹۹۲ء کو ڈپٹی کمشنر کا ایک چپراسی عشا کے قریب پہنچا کہ وزیر اعظم نرسمہا راؤ آپ سے ٹیلیفون پر

بات کرنا چاہتے ہیں، آپ یہاں آنے کی تکلیف گوارا کریں اور ان سے بات کرلیں، رات کا وقت تھا اور مجھے کچھ "تھذرلنگ" بھی تھا، میں نے کہا کہ میں کل ۹ بجے آسکوں گا، اس وقت معذور ہوں، اگلے دن وہاں سے کوئی پیام نہیں آیا۔

اس کے دو[۲] تین[۳] دن بعد ۲۴ جنوری ۱۹۹۲ء کو میرا کانپور جانا ہوا، جہاں ہندی کے ایک نئے نکلنے والے اخبار सदभाव दूत کے افتتاحی جلسہ میں شریک ہونا اور اس کا افتتاح کرنا تھا، جلسہ دن میں شہر کے ایک ہال میں ہوا، اور رات کا کھانا (DINNER) اخبار کے دفتر اور پریس میں تھا، وہاں اچانک شہر کے پولیس افسر کا آدمی پہنچا کہ پرائم منسٹر صاحب آپ سے ٹیلیفون پر بات کرنا چاہتے ہیں، آپ یہاں زحمت فرمائیں، ہمارے میزبان نے کہا کہ آپ کہہ دیجئے کہ یہاں (S.T.D) ٹیلیفون ہے، یہیں بات ہو سکتی ہے، چنانچہ ٹیلیفون پر یہ کہہ دیا گیا، چند منٹ کے بعد ان کا ٹیلیفون آیا، انھوں نے فرمایا کہ حکومت آپ کو "پدم بھوشن" کا اعزازی خطاب دینا چاہتی ہے، آپ اس کو قبول کرلیں، حکومت کی اس میں کوئی سیاسی غرض نہیں ہے، راقم نے جواب میں کہا کہ مجھے اس سے معاف رکھا جائے، یہ میرے اصول اور روایات کے خلاف ہے، انھوں نے ایک دوبار تہذیب و احترام کے ساتھ دہرایا لیکن میرا جواب وہی رہا، آخر میں وہ خاموش ہوگئے اور ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع ہوا۔[۱]

اتحاد ملت کانفرنس بمبئی میں شرکت

لکھنؤ میں ایک جلسہ کے موقع پر مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب نے ایک ایسی تنظیم

---

[۱] اس سے پہلے چندر شیکھر جی نے بھی اپنے زمانۂ وزارتِ عظمیٰ میں ایک خط کے ذریعہ اس کی پیشکش کی تھی، راقم نے خط ہی کے ذریعہ معذرت کردی تھی، جس کو انھوں نے قبول فرما لیا تھا۔

قائم کرنے کی ضرورت اور اس کے لئے آمادگی کا اظہار کیا جو مسلمانوں کے ان ملّی مسائل کو اجتماعی طور پر جو حکومت سے تعلق رکھتے ہیں، حکومت کے سامنے اور جو ملّت اس کے ملّی مسائل اور پیش آمدہ خطرات کا مقابلہ کرنے سے تعلق رکھتے ہیں ان کو ملت کے سامنے ایسے مؤثر طریقہ پر پیش کرے کہ وہ ملّت کی متحدہ آواز اور اس کی حقیقی خیالات و تأثرات کی ترجمانی سمجھی جائے، اور ایک اجتماعی قیادت و رہنمائی اور ایک متفقہ و قابلِ اعتنا وکالت کا فرض انجام دے، انھوں نے اس کو مئی کے مہینہ میں دہلی میں منعقد کرنے کا خیال ظاہر کیا، راقم نے اس خلا کو محسوس کرتے ہوئے جو مجلس مشاورت کے اندرونی انتشار اور کچھ تعطل کا نتیجہ تھا، اس تجویز سے اصولاً اتفاق کیا اور ایک ایسے اجتماعی پلیٹ فارم کے قیام کو اتنی عظیم اور کثیر المسائل ملّت اور اتنے طویل و عریض ملک اور جلد بدلتے ہوئے حالات میں کوئی غلط اقدام باور نہیں کیا، اور اس کا خیال ہوا کہ یہ دونوں "مجلس مشاورت" اور "اتحاد ملّت کانفرنس" (جس کے نتیجہ میں ملّی کونسل وجود میں آئی) کوئی تضاد اور سیاسی محاذ آرائی نہیں ہوگی، اس میں شرکت کی آمادگی ظاہر کی، البتہ یہ مشورہ دیا کہ یہ کانفرنس بجائے دہلی کے بمبئی میں منعقد ہو تاکہ معنوی اور مقصدی لحاظ ہی سے نہیں مقام اور جائے وقوع کے لحاظ سے بھی دونوں مجلسوں میں ٹکراؤ نہ محسوس کیا جائے، انھوں نے اپنے رفیق کار ڈاکٹر منظور عالم صاحب اور دوسرے رفقائے کار سے مشورہ کرنے کے بعد قبول کر لیا اور راقم سے ایک رہنما اور بنیادی مقالہ لکھنے کی فرمائش کی، میں نے اس شرط کو قبول کر لیا کہ وہ خطبۂ صدارت نہیں ہوگا اور نہ میں صدارت کے فرائض انجام دوں گا، کیونکہ میں مجلس مشاورت کے بانی ارکان میں ہوں، اور اب بھی اس سے غیر متعلق نہیں ہوں انھوں نے اس کو منظور کر لیا۔

اس قرارداد کے مطابق بمبئی میں ۲۳ ر ۲۴ رمئی ۱۹۹۲ء کو اتحاد ملت کانفرنس کے نام سے وسیع اجلاس منعقد ہوئے، میں نے اپنا مقالہ پڑھا جس کا عنوان "ملک و ملت دونوں خطرہ میں" تھا پڑھا، اس کے سرورق پر غلطی سے خطبۂ صدارت چھپا ہوا تھا، میں نے قاضی صاحب سے اس کی تردید کروائی، صدارت کے لئے مولانا مفتی ابوالسعود صاحب امیر شریعت بنگلور و بانی و مہتمم جامعہ سبیل الرشاد کا انتخاب ہوا، اور انھوں نے صدارت کے فرائض انجام دیئے[1]، اس مقالہ میں اصولی اور احتسابی انداز سے ملک و ملت دونوں کے مسائل و خطرات اور ان کی کمزوریوں، غلط اندیشیوں کا معروضی جائزہ لیا گیا ہے، اور ان کے ازالہ کے لئے تعمیری و مثبت انداز میں مشورے دیئے گئے ہیں۔

یوپی میں بی۔ جے۔ پی برسرِ حکومت و اقتدار

۲۴ رجون ۱۹۹۱ء کو بھارتیہ جنتا پارٹی (جس کو مختصراً (B. J. P.) اور بھاجپا کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، الیکشن جیت کر یوپی میں برسر اقتدار آگئی، یہ فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ یوپی کا صوبہ اپنی بہت سی خصوصیات، قدیم تاریخ، ممتاز ذہانت، تحریک آزادی کا خاص مرکز ہوتے اور مختلف قائدانہ صلاحیتوں کے حامل ہونے کی بنا پر نہ صرف یہ کہ ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد سے ۱۹۹۱ء راجیو گاندھی اور چندر شیکھر جی کے وزارت عظمی تک ہندوستان کو مسلسل وزیر اعظم مہیا کرتا رہا، اور اب بھی اس کو ہندوستان کے ذہن، ثقافت (کلچر) تہذیب کی تشکیل اور اس کے

[1] یہ مقالہ علیحدہ سے بھی شائع ہو گیا ہے، اور "تعمیر حیات" ۲۵ رجون ۱۹۹۲ء کے شمارہ میں بھی شائع ہوا ہے۔

مستقبل اور مذہبی خیالات پر اثر انداز ہونے کی امتیازی صلاحیت حاصل ہے، اس بنا پر یہاں کسی ایسی پارٹی یا سیاسی مکتبِ فکر کا برسرِ اقتدار آنا اور انتظام، ذہنی تشکیل و تربیت اور قانون سازی کے ذرائع پر حاوی ہو جانے کے واقعہ کو سرسری نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا اور اس کو کسی اور صوبہ (STATE) کی حکومت کی تبدیلی پر قیاس نہیں کیا جا سکتا،[۱] اس سے ملک کے حال و مستقبل پر اور نئی نسل کے ذہن پر گہرے اور انقلاب انگیز اثرات پڑنے کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے، خاص طور پر جب برسرِ اقتدار پارٹی ملک کے مستقبل، تعلیم، زبان و ثقافت، تاریخ، اکثریت کے مذہب کی بالاتری، رہنمائی اور معابد اور قدیم مذہبی مقاماتِ عقیدت کے بارہ میں خاص فکر، عقیدہ اور عزم و منصوبہ کی حامل ہو جیسا کہ (B. J. P.) کے لیڈروں کے بیانات و اعلانات، یعنی منشور اور مستقبل کے منصوبوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔

اسی لئے اس پارٹی کے برسرِ اقتدار آجانے کو ہندوستان کے کسی اسٹیٹ میں کسی غیر کانگریسی پارٹی کے الیکشن جیت کر برسرِ اقتدار آجانے اور حکومت بنانے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، اور اس کو ایک ایسے ملک میں جہاں حکومتیں الیکشن سے بنتی اور ٹوٹتی ہیں، ایک ضابطہ کی چیز اور (FORMAL) واقعہ اور عبوری مرحلہ نہیں کہا جا سکتا، اس کو ایک اسٹیٹ یو۔پی ہی میں نہیں پورے ملک میں ایک نئے طوفان (STORM) اور ایک ذہنی و سیاسی انقلاب (REVOLUTION) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

---

[۱] یہ ملحوظ رہے کہ (B. J. P.) صرف اتر پردیش ہی میں نہیں بلکہ تین اور ریاستوں مدھیہ پردیش، راجستھان اور ہماچل پردیش میں بھی حکومت بنانے کی پوزیشن میں آگئی اور چاروں ریاستوں میں (B. J. P.) برسرِ اقتدار ہو گئی۔

اس اہم سیاسی تبدیلی اور زلزلہ انگیز واقعہ کے تذکرہ سے پہلے راقم نے ان جزئی واقعات، مجالس، تقاریر و بیانات، اسفار اور ممتاز شخصیتوں کی رحلت و وفات کا تذکرہ کر دینا مناسب سمجھا جو جون ۱۹۹۱ء تک پیش آئے تا کہ وہ اتر پردیش بلکہ پورے ملک میں ایک نئے طوفان یا زلزلہ کی تصویر کشی میں حائل نہ ہوں۔

بی۔ جے۔ پی کے برسر اقتدار آنے سے پہلے یو پی میں ملائم سنگھ یادو جی وزارت اعلیٰ کے عہدہ پر فائز تھے، جو پارٹی کے لیڈر تھے، ملائم سنگھ یادو جی کے اقدامات اور فیصلوں سے خواہ سو فیصدی اتفاق نہ کیا جا سکے اور حکمتِ عملی و سیاسی مصلحت اندیشی کے نقطۂ نظر سے ان میں کچھ بحث کی گنجائش ہو، اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے بعض مستحق اعتراف اور قابلِ تعریف جرأت مندانہ اقدامات کئے، جن میں اجودھیا کی بابری مسجد کی حفاظت و تحفّظ کا کام، اس پر یورش کرنے والوں کے خلاف سخت تعزیری اقدامات (جن میں اسلحہ اور فوج و پولیس کے ذریعہ ان کے حملہ اور غلبہ کو ناکام بنانے کی کارروائی بھی شامل ہے) اسی طرح یو پی کے باہر سے خاص طور پر بہار کی طرف سے یلغار کرنے والوں کو روکنے کا اقدام بھی جس میں انھوں نے بہار کے وزیر اعلیٰ لالو پرشاد جی کے ساتھ تعاون کیا، پھر اپنے اعلانات اور پبلک جلسوں میں بھی مسجد کی برقراری اور اقلیت کے خلاف جارحانہ کوششوں کی بالاعلان مذمّت بھی داخل ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خالص سیاسی و انتظامی نقطۂ نظر سے ان سے کچھ غیر سیاسی حکمتِ عملی یا جذباتیت کا اظہار ہوا ہو، کسی لیڈر یا وزیر اعلیٰ کی سو فی صدی برسرِ صواب اور وقت کے تقاضوں کو حکمت کے ساتھ پورا کرنے کی ضمانت نہیں کی جا سکتی، مگر اس میں شبہ نہیں کہ عرصہ سے کم سے کم اتر پردیش کو ایسا

آزاد خیال، غیر متعصب اور اقلیت کا خیال رکھنے والا وزیر اعلیٰ نہیں ملا[1]۔

مگر افسوس ہے کہ اس موقع پر ملائم سنگھ جی یادو وزیر اعلیٰ اتر پردیش اور وی پی سنگھ جی وزیر اعظم ہندوستان میں جو تعاون اور باہمی اعتماد ہونا چاہئے تھا وہ (اس کے کچھ بھی انتظامی، سیاسی، جماعتی اسباب ہوں) نہیں ہو سکا، راقم نے وی پی سنگھ جی کو اس بارہ میں اپنی دہلی کی اس ملاقات میں جو ۱۹۹۰ء میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے جلسہ اور بابری مسجد کے قضیہ کے سلسلے میں ہوئی تھی توجہ دلائی تھی، اور انھوں نے کہا تھا کہ ہم ایسا کریں گے لیکن افسوس ہے کہ اس نازک موقع پر ان چار رہنما شخصیتوں اور ہم خیال قائدین وی پی سنگھ جی، چندر شیکھر جی، لالو پرشاد اور ملائم سنگھ جی میں مذہبی تعصب، جارحیت کے رجحان اور آئین کے بنیادی اصولوں (جمہوریت، لامذہبیت اور عدم تشدد) کے خلاف بغاوت کا جو طوفان اٹھ رہا تھا، اس کو دبانے اور ملک کو اس سے محفوظ رکھنے میں ان چاروں رہنماؤں اور ان کی پارٹیوں میں جو تعاون اور اشتراکِ عمل ہونا چاہئے تھا، اور اس اٹھتے ہوئے طوفان کا پوری جرأت اور منصوبہ بندی کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہئے تھا، اور خالص ملک کے مفاد میں اپنے یا اپنی پارٹیوں کے جزئی اختلاف کو نظر انداز کر دینا چاہئے تھا وہ نہیں ہو سکا۔

فرقہ واریت کا یہ اٹھتا ہوا طوفان ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک کی ان سب کوششوں اور کارناموں پر پانی پھیرنے کے لئے کافی تھا جو آزادی کے اعلیٰ درجہ کے حقیقت پسند، بالغ نظر اور بے لوث رہنماؤں نے انجام دیئے تھے، اس سلسلے میں سب سے

---

[1] اس کلیہ میں کسی حد تک آنجہانی ہیم وتی نندن بہوگنا جی سابق وزیر اعلیٰ یوپی کا استثناء کیا جا سکتا ہے۔

مؤثر کوشش اور اقدام انڈین نیشنل کانگریس کر سکتی تھی جس کی بنیاد جمہوریت، نا مذہبیت، اور عدم تشدد کے اصولوں پر تھی اور جس کا عوام سے سب سے زیادہ رابطہ رہا تھا، مگر افسوس ہے کہ وہ عرصہ سے بجائے ایک تحریک (MOVEMENT) کے قائم و سرگرم رہنے کے انتظامیہ (ADMINISTRATION) میں محدود ہو کر رہ گئی تھی اور سب جانتے ہیں کہ انتظامیہ سے عام طور پر (جابیجا) شکایات ہوتی ہیں، وہ کسی تحریک، تبدیلی خیال اور تربیت عوام کا کام نہیں کر سکتا، اس کے نتیجہ میں جون ۱۹۹۱ء کے الیکشن میں (B. J. P.) برسر اقتدار آگئی اور اس نے حکومت بنالی۔

(B. J. P.) نے برسر اقتدار آنے کے بعد ہی نہ صرف اتر پردیش کو بلکہ پورے ہندوستان کو ہندو راشٹر بنانے کا کھلے طریقہ پر بار بار اعلان کیا اور یہ کہ یہاں اکثریت (ہندوؤں) کی نہ صرف دستوری حکومت (CONSTITUTIONAL) ہوگی بلکہ مذہبی (RELIGIOUS) ثقافتی (CULTURAL) لسانی (LINGUISTIC) اور اس سے آگے بڑھ کر دیومالائی (MYTHOLOGICAL) ہوگی، اس کے لئے ہندوستان کی ایک نئی تاریخ مرتب کی جائے گی، جس میں مسلمانوں کو باہر سے آنے والا حملہ آور اور لٹیرا ثابت کیا جائے گا جس نے یہاں مندر گرائے اور مسجدیں بنائیں اور اسلامی قانون نافذ کیا، تعلیم کا نظام بدلنا ہوگا جس کا ذریعۂ تعلیم اور اس کا رسم الخط (SCRIPT) خالص ہندی ہوگا، مختصراً اس پورے منصوبہ کو جدید اصطلاح میں ثقافتی نسل کشی (CULTURAL GENOCIDE) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، ان عزائم اور منصوبوں کی (جن کا یہاں تذکرہ کیا گیا ہے) تصدیق کے لئے جون ۱۹۹۲ء کے بعد کے اعلانات، بیانات، انگریزی، ہندی اخباروں کے مضامین کو دیکھنا ہوگا جو اس زمانہ میں اخبارات میں

نکلتے رہے، اور ریڈیو سے بھی نشر ہوتے رہے، اس میں صاف صاف اس کا بھی اظہار کیا گیا کہ مسلمانوں کو قومی دھارے کا جزء بننا ہوگا، ذات پات کا نظام برقرار رہے گا، یہاں کی قدیم تہذیب، کلچر زبان اور مذہبی عقیدت کے مراکز کو وہی مقام دیا جائے گا، جو اس کو قدیم زمانہ سے حاصل تھا۔

یہاں پر اس طرزِ فکر و عزائم کا اندازہ کرنے کے لئے (کتاب کی گنجائش اور مندرجات کے تنوّع اور کثرت کا لحاظ کرتے ہوئے) چند اقتباسات پر اکتفا کیا جاتا ہے جس سے (B. J. P.) کے طرز فکر اور طریق کار پر روشنی پڑتی ہے، اور جس کے اظہار میں کسی مصلحت اندیشی اور تردد سے کام نہیں لیا گیا۔

ہندو احیائیت (HINDU REVIVALISM) اور ہندوستان کا ہندو راشٹر ہونا باہر سے آئی ہوئی قوموں اور ہندو مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب اور تہذیبیں رکھنے والوں کی اگر نسلی نہیں تو معنوی نسل کشی (CULTURAL GENOCIDE) کا فلسفہ اور منصوبہ حقیقتاً گرو گول والکر (GURU GOLWALKER) کی تعلیم اور کتابوں سے ماخوذ ہے[1]، اور ویشو ہندو پریشد، بجرنگ دل، بھارتی جنتا پارٹی، اسی فلسفہ اور تحریک پر عقیدہ رکھتی ہیں۔

گرو گول والکر کے خیال میں ہندوستان ہمیشہ سے ہندو راشٹر ہے اور اس کو ایسے ہی رہنا چاہئے، اس تصور میں ایک "بیرونی دشمن" کا نظریہ، اس کی نفرت اور اس سے مقابلہ کا خیال بنیادی حیثیت رکھتا ہے، یہ بیرونی دشمن مسلمان ہیں، وہ کہتے ہیں:۔

---

[1] گرو گول والکر کی دو کتابیں اس سلسلہ میں رہنما فلسفہ اور نظام کی حیثیت رکھتی ہیں ایک (WE OR OUR NATION DEFINED) اور دوسری (BUNCH OF THOUGHT)

"اس میں کوئی شبہ کی بات نہیں کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ملک ہے،
اور جو لوگ ہندو عنصر، ہندو مذہب، تہذیب اور زبان سے تعلق نہیں
رکھتے وہ حقیقی قومی زندگی سے الگ ہیں، جو ان چیزوں کو عزیز نہیں رکھتے،
وہ یا تو غدار ہیں یا دشمن ہیں، یا احمق"۔

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں:۔

"یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ جہاں تک قوم (NATION) کا تعلق
ہے، جو لوگ ان پانچ شرطوں کو پورا نہیں کرتے، ان کے لئے قومی زندگی میں
کوئی جگہ نہیں۔ ۱۔ وہ اس سے ہم آہنگ ہو جائیں، اپنی علیحدگی کو ختم
کردیں۔ ۲۔ ہندو مذہب اختیار کریں۔ ۳۔ ان کی ثقافت اپنائیں۔
۴۔ قومی زبان اختیار کریں۔ ۵۔ اور قومی عنصر میں ضم ہو جائیں جب تک
وہ ایسا نہیں کرتے، وہ غیر ملکی رہیں گے"۔[1]

اس کے ساتھ شیو سینا کے لیڈر بال ٹھاکرے کے اعلانات و بیانات بھی سامنے
رکھنے چاہئیں جن کے اثرات صرف مہاراشٹرا اور گجرات کی ہندو اکثریت ہی پر نہیں
ملک کی انتہا پسند اکثریت کے افراد اور جماعتوں پر بھی ہیں، اور مہاراشٹرا کے اور
مہاراشٹرا کے مسلم کُش فسادات کے دور میں ان کی بڑی ذمہ داری ہے۔

بال ٹھاکرے کے نظریات کیا ہیں؟ ۱۹۸۴ء کے فسادات اور خونی ہنگاموں کے
بعد بال ٹھاکرے نے کہا تھا:۔

"تقسیم کے بعد ہندو ہندستان کے مالک ہیں اور مسلمان دوسرے درجہ کے شہری"

[1] ماخوذ از (FRONT LINE) ص۴۵ ۱۹۳۹ء ۱۲ مارچ۔

مسلمانوں کے لئے آبرو مندانہ بات یہ ہے کہ وہ سب مذہب تبدیل کر کے ہندو ہو جائیں، ورنہ اگر میں اقتدار میں آگیا تو ۴۸ گھنٹوں میں انھیں سیدھا کر دوں گا۔"

(بحوالہ اردو روزنامہ ناسک اور جنٹلمین بمبئی مئی ۱۹۸۴ء)

اس ملک کو ہندو مذہب کا ملک ہونا چاہیے میں اس کے لئے بیج بو رہا ہوں اور ہم اس کی فصل بھی کاٹ لیں گے۔" (انڈیا ٹوڈے ۱۵؍جون ۱۹۸۴ء)

"مسلمانوں کو مسلسل لانڈی کے نام سے پکارتے ہوئے ٹھاکرے نے کہا تھا کہ ان کی آبادی کینسر کی طرح بڑھتی جارہی ہے جس کا واحد علاج آپریشن ہے۔"

(سنڈے آبزرور ۲۰؍مئی ۱۹۸۴ء)

"ٹھاکرے کو ایک روڈ کا نام "نرگس دت" کے نام منسوب کرنے پر بھی سخت اعتراض ہے، چنانچہ اس نے ۱۷؍مئی کو آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا تھا۔"

(انڈین اکسپریس ۲۱؍مئی ۱۹۸۴ء)

"۱۷؍جون ۱۹۸۴ء کو جو جلوس نکالے گئے تھے اس میں اشتعال انگیز نعروں کے ساتھ ایک پوسٹر یہ بھی تھا۔" قرآن چھوڑ دو یا ہندوستان چھوڑ دو۔"

(پیپلز ڈیموکریسی)

اپنے نظریات کے پس منظر میں جنوری ۱۹۸۴ء میں بال ٹھاکرے کی طرف سے آل مہاراشٹر شیو سینا کانفرنس بلائی گئی تھی جس میں شیو سینا، ہندو سبھا، ماسور اشرم ہندو سینا اور ہندو ایکتا سمّیلن پر مشتمل ایک وسیع تنظیم ہندو مہا سنگھ کی تشکیل کا اہم فیصلہ کیا گیا تھا، اس کے بعد سے اس کی سرگرمیاں بڑھ گئی ہیں، یہ تاریخی حقیقت بھی درج ریکارڈ ہے کہ ۱۹۷۰ء کے فسادات کے بعد شیو جینتی کے جلوس پر

پابندی نافذ کردی گئی تھی لیکن وسنت پاٹل کی حکومت نے دوبارہ اس کی اجازت دے دی اور اس کے بعد ٹھاکرے نے وسیع پیمانہ پر ایک جلوس "عظیم فتح" کے نام سے نکالا تھا اس کے بعد اس کی تباہی اور ہلاکت خیزی بڑھتی جا رہی ہے، جس کے مظاہرے اس وقت بھی ہو رہے ہیں۔[1]

(B. J. P.) نے اپنے مقاصد کے حصول، اپنی پارٹی کو ہندو اکثریت میں مستحکم و مقبول بنانے کے لئے اجودھیا میں واقع بابری مسجد کو منہدم کر کے مندر اور رام جی کی یادگار اور جائے پیدائش میں تبدیل کر دینے کے منصوبہ کو اپنے پروگرام میں اوّلیت دی، اس کو ایک قومی مطالبہ بنا دیا، قومی مطالبہ ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی اصل قوم اور اکثریت کی عزت و وقار کا مسئلہ بنا دیا، اور اس کے لئے ایک زبردست ملک گیر تحریک چلائی، یوپی کے باہر بھی دوسری ریاستوں میں مذہبی جوش بلکہ مذہبی و قومی غیرت کو بیدار بلکہ بیزار بنانے کی منصوبہ بند اور پُرجوش تحریک چلائی، جس کے نتیجہ میں ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کے بے رحمانہ طریقہ پر شکست و ریخت اور اس کے انہدام بلکہ انعدام کا وہ واقعہ پیش آیا جو ہندوستان ہی نہیں بلکہ ملکوں کی تاریخ میں، مذہبی غضبناکی اور جذباتی بحران کی ایک مثال ہے، جس کی نظیر صدیوں کی تاریخ میں اور ملکوں اور قوموں کے کردار میں ملنی مشکل ہے، یہ واقعہ واقعات کی ترتیب اور زمانہ کے تعیّن کے ساتھ اپنی جگہ پر آئے گا۔

---

[1] جہاں تک آر۔ایس۔ایس کا تعلق ہے، اس کے لئے صلاح الدین عثمان صاحب کی کتاب آر۔ایس۔ایس تعلیمات و مقاصد، مطبوعہ نظامی آفسٹ پریس لکھنؤ ۱۹۹۳ء کا مطالعہ مفید ہوگا، خاص طور پر باب ۶ آر۔ایس۔ایس کے تین مقاصد ص ۸۹ تا ۱۰۴

اس سے پہلے نومبر کے آخر تک کے اہم واقعات، دوروں اور سفروں کی مختصر روئداد پیش کی جاتی ہے، جو تاریخی اور زمانی لحاظ سے اس سے پہلے قابل ذکر ہے۔

انگلستان کا سفر اور وہاں کی مصروفیتیں اور خطابات

ہر سال کے معمول کے مطابق ستمبر ۱۹۹۲ء کے پہلے ہفتہ میں "سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز" آکسفورڈ یونیورسٹی کے جلسۂ انتظامی میں شرکت کے لئے (جس کی صدارت کا شرف راقم کو حاصل ہے) اپنے رفیق عزیز اور رکن مرکز اسلامی مولوی محمد رابع ندوی کی معیت میں ۸ ستمبر کو ہم لندن پہنچے، وہاں سنٹر کی مجلس انتظامی میں جو ۱۰ ستمبر کو منعقد ہوئی (جس میں بلاد عربیہ اور ممالک اسلامیہ کی متعدد سربرآوردہ شخصیتیں ارکان کی حیثیت سے شریک ہوئیں جن کا تذکرہ کتاب کی چوتھی جلدمیں بار بار آچکا ہے) شرکت وصدارت کا فرض انجام دیا، مسائل پر غور وفکر ہوا جن میں ایک بڑی مسرّت خیز اور بشارت آمیز بلکہ عزّت افزا اور ایمان افروز یہ اطلاع اور خوش خبری تھی کہ حکومت ازبکستان سے ایک معاہدہ کے تحت امام المُحدِّثین اور "بعد کتاب اللہ اصحّ الکتب" (صحیح بخاری) کے مُرتّب وجامع امام بخاریؒ کی شایانِ شان ایک یادگار قائم کرنے کے منصوبہ کو آکسفورڈ سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز عملی جامہ پہنائے گا، اور اس منصوبہ پر عملدرآمد کی افتتاحی تقریب میں (جو مناسب موسم اور زمانہ میں ہوگی) سنٹر کا ایک وفد، صدر وارکان مرکز کی معیّت میں جائے گا اور امام بخاریؒ کی آخری آرام گاہ سے متصل ان کی مسجد اور مدرسہ کے احیاء وتعمیر کی سعادت حاصل کی جائے گی، اس یادگار کی تعمیر کے لئے عالم اسلام کے بعض معیاری وممتاز

نقشہ سازوں سے نقشہ تیار کرایا جا رہا ہے، آکسفورڈ اسلامک سنٹر اس وقت منجملہ اور کاموں کے دو اہم پراجکٹوں پر کام کر رہا ہے ایک تو اسلامی تاریخی اٹلس کی تیاری، دوسرے ایک جامع اور وسیع اسلامی تاریخ مرتب کرنے کا منصوبہ۔

سنٹر کی مصروفیتوں اور ضروری مجالس میں شرکت کے بعد ۱۸ ستمبر کو اسلامک فاؤنڈیشن پارک فیلڈ لیسٹر شائر (برطانیہ) جانا ہوا، جہاں پچھلے سال بھی جانا ہوا تھا اور جس کی طرف سے ادارہ کے افتتاح اور نقل مکانی کے موقع پر بھی اس کے ذمہ داروں بالخصوص ڈاکٹر خورشید احمد اور ڈاکٹر مناظر احسن صاحب کی طرف سے ہندوستان دعوت بھیجی گئی تھی، مگر آنا نہیں ہو سکا تھا، اب اس موقع پر وہاں کے بعض عزیز کارکن آکسفورڈ لینے آئے تاکہ اس جلسہ میں خطاب ہو جو راقم ہی کی تقریر سننے کے لئے بلایا گیا تھا، اور اس میں لیسٹر شہر اور قرب وجوار کے مقامات کے منتخب لوگ شریک ہو رہے تھے۔

راقم فاونڈیشن میں پہنچا تو دیکھا کہ ہال بھرا ہوا ہے اور اس میں ہندوستانیوں پاکستانیوں اور برطانیہ میں رہنے والے مسلمانوں کے علاوہ مختلف عرب ممالک کے فضلاء، طلبائے جامعات اور تحقیقی کام کرنے والے عرب نوجوان بھی اچھی تعداد میں جمع ہیں، کچھ داعیوں کے اخلاص وفکر، کچھ موقع کی اہمیت و مرکزیت، اور کچھ عرب فضلاء کی شرکت اور سب سے بڑھ کر توفیق الٰہی نے قلب میں ایک انشراح کی کیفیت اور ذہن میں ایک اہم اور فکر افروز مضمون پیدا کر دیا جس کی بنیاد قرآن مجید کی ایک معجزانہ آیت تھی، جو اتفاقی طور پر راستہ میں ذہن میں آئی تھی اور یہ خیال ہو گیا تھا کہ اس کو بنیاد بنا کر تقریر کی جائے گی، راقم نے پہلے عربی میں پھر اردو میں خطاب کیا اس کا

خلاصہ انگریزی میں بھی پیش کیا گیا، سامعین بہت متأثر اور کیّف نظر آتے تھے یہ تقریر بجنسہٖ یہاں پیش کی جاتی ہے کہ مختصر اور مؤقّت رسالوں کی بقا اور حفاظت کی ضمانت نہیں، شاید کتاب میں آجانے کی وجہ سے یہ تقریر بہت سے قائدین، داعیانِ دین بلکہ قائدین کے لئے بھی چشم کشا اور کام کے لئے مہمیز ثابت ہو۔[1]

اُمّتِ مسلمہ کا فرضِ منصبی اور اس کے انقلابی اثرات

الحمد للّٰہ والصّلاۃ والسّلام علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم۔

حضرات!

میں قرآن مجید کا ایک حقیر طالب علم ہوں اور آپ سب جانتے ہیں کہ قرآن مجید روزانہ پڑھا جاتا ہے اور حسب توفیق بار بار اور زیادہ سے زیادہ پڑھا جاتا ہے، قاعدہ یہ ہے کہ جب آدمی کسی چیز کو حیرت سے دیکھتا ہے اور اس سے وہ متعجب ہوتا ہے تو اس کا یہ تعجب ہمیشہ قائم نہیں رہتا وہ زائل بھی ہو جاتا ہے لیکن میں اپنا حال آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں (اور اسی سے میں نے اپنی بات کہنے کا مضمون اخذ کیا ہے) کہ جب میں قرآن مجید میں سورۂ انفال کی یہ آیت کریمہ پڑھتا ہوں:۔

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ (سورۃ الانفال ۷۳)

(تو مومنو!) اگر تم یہ کام نہ کروگے تو ملک میں فتنہ برپا ہو جائے گا اور بڑا فساد مچے گا۔

---

[1] تقریر کا ترجمہ عزیز گرامی عبدالرحیم قدوائی (نبیرہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ) نے بہت اچھی انگریزی میں کیا ہے، اور وہ فاؤنڈیشن کی طرف سے شائع ہو گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان مہاجرین اور انصار کو مخاطب فرمایا ہے، جو مشرّف بہ اسلام تھے، جہاں تک ان مہاجرین کا تعلق ہے جو مکّہ مکرمہ سے ہجرت کرکے مدینہ طیّبہ آئے تھے، وہ چند سو کی تعداد میں تھے، آپ جانتے ہیں کہ ہجرت کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے، ہجرت میں آدمی کو گھر بار چھوڑنا پڑتا ہے، اعزّہ واقرباء سے دور ہونا پڑتا ہے، اور ان سہولتوں کو خیرباد کہنا پڑتا ہے جو موروثی اور مقامی طور پر اس کو حاصل ہوتی ہیں، ظاہر ہے کہ ان مہاجرین کی تعداد محدود تھی، اور جن لوگوں نے مدینۂ طیّبہ میں اسلام قبول کیا تھا، ان کی تعداد بھی اس وقت تک کچھ زیادہ نہ تھی، حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ مدینۂ طیّبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے تین ۳ مرتبہ مسلمانوں کو شمار کیا گیا، پہلی مرتبہ شمار کرنے میں مسلمانوں کی تعداد پانچ سو ۵۰۰، دوسری مرتبہ چھ سو ۶۰۰، سات سو ۷۰۰ کے درمیان تھی، تیسری مرتبہ شمار میں مسلمان ڈیڑھ ہزار ۱۵۰۰ تھے، اس تعداد پر مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اطمینان کی سانس لی کہ اب ہم ڈیڑھ ہزار ۱۵۰۰ ہوگئے ہیں، اب ہمیں کیا ڈر ہے؟ ہم نے تو وہ زمانہ دیکھا ہے جب ہم میں سے کوئی اکیلا نماز پڑھتا تھا، پھر بھی دشمنوں کا ڈر لگا رہتا تھا۔[1]

گویا یہ مٹھی بھر انسانوں کی آبادی تھی جس نے اسلام قبول کیا تھا، اور جس نے اس کی ذمّہ داری قبول کی تھی کہ اس کے چاروں طرف انسانی آبادی کا جو سمندر پھیلا ہوا ہے، اس میں وہ ہدایت و تبلیغ کا کام کرے گی، اس کا آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ساری دنیا میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جنھوں نے اسلام کا نام بھی نہیں سنا تھا، قبول کرنے کا کیا ذکر، پھر اس وقت دنیا کی دو ۲ عظیم الشّان سلطنتیں تھیں جن کو (EMPIRE) کہنا چاہئے، وہ صرف امپائر ہی نہیں تھیں، اور ان کی حیثیت محض انتظامیہ اور حکومت ہی کی نہیں تھی،

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ کتاب الجہاد باب کتابۃ الامام للناس۔

ان کے ساتھ مستقل تہذیب تھی، مستقل تمدّن، طرزِ زندگی اور معیار و اقدار (IDEALS & VALUES) تھے، متمدّن دنیا کا سب سے بڑا حصّہ جس پر یہ دونوں شہنشاہیاں بلاواسطہ یا بالواسطہ قابض تھیں، وہیں سے وہ تہذیب لیتے تھے، وہیں سے فیشن اخذ کرتے تھے، وہیں سے قانون لیتے تھے، آپ کو معلوم ہے کہ (ROMAN LAW) دنیا میں کتنی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اور ایرانی تہذیب ہندوستان اور دور دراز ملکوں تک پہنچ گئی تھی۔

حضرات! میں جب اس آیت پر پہنچتا ہوں تو ہمیشہ تصویرِ حیرت بن کر رہ جاتا ہوں، سوچنے لگتا ہوں کہ یا اللہ یہ کس سے کہا جا رہا ہے، کب کہا جا رہا ہے، اور کہاں کہا جا رہا ہے؟ یہ آخری مسلم شماری جس میں مسلمان ڈیڑھ ہزار نکلے بعض شُرّاحِ حدیث اور محققین کی تحقیق میں جنگ اُحد کے موقعہ پر ہوئی جو ۳ھ میں پیش آئی اور بعض کے نزدیک جنگ خندق (جس کو غزوۃ الاحزاب بھی کہا جاتا ہے) کے موقعہ پر ہوئی جو ۵ھ میں پیش آئی اس طرح یہ مدّت زیادہ سے زیادہ پانچ سال کی ہوتی ہے جس میں مسلمانوں کے شمار کرنے کا یہ کام ہوا اس طرح یہ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو ہزار مسلمان تھے جن سے کہا جا رہا ہے کہ تم اپنی شیرازہ بندی کرو اور ایک نئی وحدت (UNIT) قائم کرو جس کی اساس ایمان پر ہو، قرآن پر ہو، صحیح عقیدہ پر ہو اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سرپرستی میں ہو۔

یہ وحدت اس لئے قائم کرنے کے لئے کہا جا رہا ہے کہ تم اس وحدت کے ذریعہ دنیا میں اسلام کا پیغام پہنچاؤ اور دنیا کو "جاہلیت" (من مانی آزادی اور نفس پرستی) کی زندگی سے نکال کر دنیا کو اسلام (خدا پرستی اور کامل خود سپردگی) کی دعوت دو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو دنیا میں فتنۂ کبریٰ اور فسادِ عظیم برپا ہوگا۔

میں اس موقع پر سوچتا ہوں کہ جن سے کہا جا رہا ہے اور جو اس آیت کے مخاطب ہیں،

ان میں اور ان پر جس کام کی اور دنیا کی جس آبادی کی ذمہ داری ڈالی جارہی ہے، دونوں میں کیا تناسب تھا؟ لیکن فارسی میں ایک محاورہ ہے، اور ہم اس کو عربی میں بھی ادا کردیا کرتے ہیں کہ "بقامت کہتر وبقیمت بہتر" یعنی قد وقامت کے لحاظ سے چھوٹا لیکن قیمت کے لحاظ سے کہیں بڑا اور بہتر، میں نے اپنی عربی تقریر میں بھی اس کو اس طرح ادا کیا تھا کہ العبرة بالقيمة لا بالقامة" یہ اس جماعت سے کہا جارہا ہے جو بقامت کہتر تھی، لیکن بقیمت بہتر، اصل چیز جو فیصلہ کن ہے وہ "قیمت" ہے "قامت" نہیں، چنانچہ اس کہتر قامت اور بہتر قیمت نے اپنی انقلاب انگیزی اور عہد آفرینی ثابت کردی، ایرانی سلطنت کا چراغ گل ہوگیا، صرف سلطنت کا نہیں ایرانی تہذیب کا، اُن کے معیاروں اور اُن کی قدروں (IDEAL & VALUES) کا جو حقیقی طور پر حکومت کرتے اور زندگی کی تشکیل کرتے ہیں، جن کو عربی میں المُثُل والقِيَم کہتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری دور یا زیادہ سے زیادہ خلافتِ راشدہ کے اختتام تک دنیا کا متمدّن ترین حصّہ جو مہذب اور ترقی پسند انسانوں کے لئے نمونہ اور معیار (IDEAL) کا درجہ رکھتا تھا، وہ بدل گیا تھا یا برابر بدل رہا تھا، معیار بدل گئے تھے، سوچنے کے طریقے بدل گئے تھے، ایران اور روم کی ذہنی وفکری غلامی سے آزاد ہورہے تھے،....

مُہذّب اور ترقی یافتہ کہلانا، احترام اور وقعت کی نگاہ سے دیکھا جانا معیار نہیں رہا تھا، حکمِ خداوندی کی تعمیل اور سنّتِ نبویؐ کی پیروی اور عہدِ رسالت اور اس کے معتبر نمایندوں سے مشابہت، تہذیب میں، معاشرت میں، رسوم وعادات میں اور لباس ومظاہر میں تعریف اور قدر کی چیز سمجھی جانے لگی تھی، اس کی مثالیں آپ کو بڑے بڑے دولتمندوں اور با اقتدار لوگوں کی زندگی میں، تاریخ کی کتابوں میں ملیں گی۔

آپ کو معلوم ہے کہ زندگی کے آلات و وسائل تو بدلتے رہتے ہیں، تمدن کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں لیکن ذلت و عزت کے پیمانے علم و جہالت کے معیار اور علامتیں بہت دیر اور بہت مشکل سے بدلتی ہیں، اس میں بعض اوقات صدیاں لگ جاتی ہیں، اگر آپ تہذیب انسانی کی تاریخ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض پیمانے صدیوں تک حکومت کرتے رہے لیکن یہاں سوچنے کے طریقے بدل گئے، کرنا تو الگ چیز ہے، کرتے ہیں تو بہت جلد تغیر آجاتا ہے، لیکن سوچنے کا طریقہ بہت بڑی طاقت ہے، اور وہی زندگی پر حکمرانی کرتا ہے، ہم بھی بہت سے اسلامی ممالک میں دیکھتے ہیں کہ مغربی اقتدار اور تہذیب کے اثر کے پیمانے نہیں بدلے پیمانوں میں ناپنے والی چیزیں بدل گئیں، عزت و شرافت، خوش نصیبی و بدنصیبی، علم و جہالت ترقی و پسماندگی کے وہی معیار ہیں جو باہر کی حکومت کرنے والی قوموں اور تہذیبوں نے عطا کئے ہیں۔

اب آپ ان حقائق کی روشنی میں دیکھئے کہ کس پر اور کس وقت ساری دنیا میں انقلاب لانے کی اور اس کو خدا پرستی، خدا ترسی، انسان دوستی، ایثار و قربانی اور ہدایت ربانی کے راستہ پر چلنے اور چلانے کی عالمگیر ذمہ داری ڈالی جارہی ہے، اور اس ذمہ داری کے ادا کرنے اور اس کے سلسلہ میں کامیابی حاصل کرنے میں اس "ثقافت کہتر و لقیمت بہتر" جماعت کو کتنی بڑی کامیابی حاصل ہوئی اس کے لئے آپ چھٹی صدی عیسوی کے بعد کی مختلف زبانوں (اور خاص طور پر انگریزی) میں لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ فرمائیے۔[1]

حضرات! میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے اس مرکز (ISLAMIC FOUNDATION)

[1] اس سلسلہ میں بغیر کسی تواضع کے خاکسار اپنی دو کتابوں کا حوالہ دیتا ہے جن میں اس موضوع پر خاصا مواد جمع کر دیا گیا ہے "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" (ISLAM & THE WORLD) دوسری "نبیِ رحمتؐ" (MOHAMMAD RASULULLAH)

کے قیام کے لئے صحیح جگہ کا انتخاب کیا، آپ یہاں مغربی تہذیب کے سینہ پر بیٹھ گئے، اگر یہاں سے یا کسی بڑے مغربی ملک، یا مغربی تہذیب کے بڑے مرکز سے انقلاب شروع ہوا تو وہ طاقت میں اور گہرائی میں، وسعت میں بھی اور حجم میں بھی، قابلِ لحاظ ہوگا، خدا کرے وہ دن آئے کہ ان ملکوں میں بھی لوگوں میں حق کی طلب اور اپنی زندگی کے خلا کا احساس پیدا ہو، اور کہیں کہ آپ ہم کو اس تاریکی کی زندگی، نفس پرستی کی زندگی اور کوتاہ نظری کی زندگی سے نکالئے یہاں پر یہ نکتہ یاد رہے کہ قرآن مجید میں تاریکی کے لئے اکثر جمع کا صیغہ "ظُلمات" آتا ہے اور روشنی کے لئے واحد کا صیغہ "النُّور" آتا ہے "يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ" وغیرہ وغیرہ، اس سے معلوم ہوا کہ ظُلمتیں بے شمار ہیں اور نور ایک ہے، وہ کہیں کہ ہمیں یہ دولت آپ ہی کے یہاں سے مل سکتی ہے۔

اور یہ بات جب ہی حاصل ہوگی جب آپ کی زندگی اور اخلاق میں نشانِ امتیازی ہوگی، میں نے ایک واقعہ آکسفورڈ کی جامع مسجد میں ایک بڑے مجمع میں سنایا تھا، آپ کو بھی سنا دوں کہ اس میں ہر مرتبہ ایک نئی لذّت محسوس ہوتی ہے، وہ یہ کہ جب حضرت سید احمد شہیدؒ نے پشاور فتح کیا اور کئی ہفتے گزر گئے فوجِ مجاہدین وہاں پڑی ہوئی تھی تو ایک پٹھان نے ایک ہندوستانی کا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ میاں ایک بات تم سے پوچھتا ہوں، ٹھیک ٹھیک بتانا، اس نے کہا کہئے، اس نے کہا کہ کیا تم ہندوستانیوں کی دور کی نگاہ کمزور ہوتی ہے، تم دور کی چیز نہیں دیکھ سکتے؟ فوجِ مجاہدین کے اس سپاہی نے کہا نہیں ہم خوب دیکھتے ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہئے تو آپ کو بتا دیں کہ ہمارے سامنے وہ دور کی چیز کیا ہے؟ اس نے کہا نہیں کوئی بات ضرور ہے، ہندوستانیوں کی دور کی نگاہ فطری طور پر کمزور ہوتی ہے، ہندوستانی نے کہا اگر آپ یہ بتائیے کہ آپ کو اس کے پوچھنے کی ضرورت کیا پیش آئی؟

وہاں کے پٹھان باشندہ نے کہا کہ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کئی ہفتہ سے آپ کی فوج یہاں پڑی ہوئی ہے، اور آپ میں سے بعض کئی کئی مہینے سے اور بعض کئی کئی سال سے اپنا گھر چھوڑے ہوئے ہیں، شادی شدہ ہیں یا شادی کی عمر ہے لیکن ہم نے آپ میں سے کسی کو کسی نامحرم کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہوئے نہیں دیکھا تو ہم نے کہا کہ ایک ہو دو ہوں تو ہو سکتا ہے لیکن سب کے سب کیوں نہیں دیکھتے؟ اُدھر جوانی ہے اِدھر حُسن ہے لیکن کسی کو بدنگاہی کرتے ہوئے نہیں دیکھتے۔

اس ہندوستانی نے جواب دیا کہ الحمدللہ ہم سب کی نظر بالکل ٹھیک ہے، مگر قرآن کی تعلیم ہے:۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ	اہلِ ایمان سے کہہ دیجئے کہ اپنی نظریں
اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا	نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی
فُرُوْجَهُمْ۔ (سورۃ النور ۳۰)	حفاظت کریں۔

پھر یہ ہمارے امام کی تربیت کا بھی نتیجہ ہے۔

اس خصوصیت کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ:۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا	اے ایمان والو! اگر تم اللہ کے معاملہ میں
اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا۔	تقویٰ و احتیاط کا عمل اختیار کروگے تو
(سورۃ الانفال ۔ ۲۹)	اللہ تعالیٰ تمہارے اندر ایک شانِ امتیاز کی
	پیدا کردے گا۔

اگر آپ نے اس ملک میں رہتے ہوئے زندگی کا ایک نیا ماڈل (MODEL) ایک نیا سانچہ، اور ایک نیا نمونہ پیش کیا، جس میں یہاں کی زندگی، طرزِ معاشرت، نفس پرستی اور دولت پرستی

اور ہر قسم کی آزادی سے امتیاز ظاہر ہوا، تو لوگوں کے اندر اسلام کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوگا، وہ آپ کے یہاں آئیں گے اور کہیں گے کہ ہمیں کوئی کتاب دیجئے جس سے ہم سمجھیں کہ اس انقلاب کا سرچشمہ کہاں ہے؟ کہاں سے یہ تبدیلی آئی اور آپ میں امتیاز پیدا ہوا؟

میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری حقیر ذات اور میرے رفقاء کا اعزاز کیا، خاص طور پر ڈاکٹر خورشید احمد صاحب اور مناظر احسن صاحب اور سب حضرات اور اس ادارہ کے ذمہ داروں کا کہ آپ نے ہمارے ساتھ برادرانہ ہی نہیں کریمانہ اور فیاضانہ سلوک کیا، اللہ تبارک وتعالیٰ توفیق دے کہ یہ مرکز زیادہ سے زیادہ ہدایت اور نفع کا سرچشمہ بنے، اللہ وہ دن ہمیں دکھائے کہ جیسے پہلے اس ملک سے دنیا پرستی اور نفس پرستی اور مادیت کی ہوا چلی تھی، الحاد اور لادینیت کا رجحان پیدا ہوا تھا، ویسے ہی یہاں سے اب ایمان کی، اخلاق کی، انسانیت اور شرافت کی اور ہدایت کی ہوا چلے۔

آخر میں اقبالؔ کے ان چند اشعار پر اس خطاب کو ختم کرتا ہوں، جو اس مقام وماحول، عہد وزمانہ، اور مسلمانوں کے مقام وپیغام سے بھی خاص مناسبت رکھتے ہیں ؎

ناموسِ ازل را تو امینی تو امینی ۔۔۔ دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی

اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی ۔۔۔ صہبائے یقیں درکش و از دیر گماں خیز

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

از خوابِ گراں خیز

فریاد ز افرنگ و دلآویزئ افرنگ ۔۔۔ فریاد ز شیرینئ و پرویزئ افرنگ

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزئ افرنگ ۔۔۔ معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

از خوابِ گراں خیز

اسلامک سنٹر لندن میں تقریر

لیسٹر سے لندن جانا ہوا، دو روز کے فرق سے وہاں کے مشہور و قدیم اسلامک سنٹر کی طرف سے (جو ریجنٹ پارک میں واقع ہے اور مصری فضلاء اور منتظمین کے زیر انتظام ہے اور وہاں اس سے پہلے بھی ایک دو بار تقریریں ہو چکی ہیں) دعوت دی گئی، وہاں پہنچے تو دیکھا کہ حاضرین و سامعین کی بڑی تعداد عرب نوجوانوں اور فضلاء کی ہے، اس لئے وہاں عربی زبان کو ترجیح دی گئی، اور "غیر اسلامی تہذیب و اقتدار کے مرکزوں میں مقیم مسلمانوں کی ذمہ داریاں" کے عنوان پر جو وہاں کے بالکل حسبِ حال تھا تقریر کی گئی، یہ تقریر بھی اپنی معنویت اور اہمیت کی بنا پر یہاں بجنسہٖ پیش کی جاتی ہے۔

غیر اسلامی تہذیب و اقتدار کے مرکزوں میں مقیم مسلمانوں کی ذمہ داریاں

بزرگو! ایک ایسے ملک میں جس میں اسلام ایک محکومانہ مذہب کی حیثیت رکھتا ہو اور مغربی اقتدار اور غیر اسلامی طرزِ معاشرت کی بالادستی ہو اور جس میں ذاتی منافع اور سیاسی و جماعتی فائدوں ہی کو سب کچھ سمجھا جاتا ہو اور لذت کو ایک فلسفہ کی شکل دیدی گئی ہو، جس میں تمام تر اعمال و اخلاق اور کاوشوں کا محور اسی کو سمجھا جانے لگا ہو، ایسے ملک میں مسلمانوں کی (جب کہ وہ وہاں اقلیت میں ہوں) بہت ہی نازک ذمہ داری ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ اُن میں غیر متزلزل ایمان ہو، جرأت مندانہ کردار ہو، وہ پوری حکمتِ عملی سے کام لیں، پھر ان میں اس پیغام و دعوت پر پورا اعتماد ہو جس سے اللہ نے اُن کو مشرف فرمایا ہے، یہ بھی اُن کے لئے ضروری ہے کہ اُن کا ایک بلند معیار ہو اور وہ احساس کمتری کا شکار نہ ہوتے

پائیں، اگر وہ اس بلند معیار پر نہ ہوئے تو وہ اپنی ذات کو اور اپنی قوم کو حقارت کی نگاہ سے، اور مغربی تہذیب کے مقلدوں اور اس کے خوشہ چینیوں کی حیثیت سے دیکھیں گے، اس صورت میں وہ کوئی مؤثر اور اہم کردار ادا نہیں کر سکتے جو لوگوں کی توجہ کو مرکوز کر سکے، اور کچھ تبدیلی عمل میں لا سکے۔

میں آپ کے سامنے ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے آپ کے سامنے بات بالکل واضح ہو جائے گی، اور ایک ایسے غیور مسلمان کا کردار بھی آپ کے سامنے آئے گا جس کو اپنی دعوت اور پیغام پر پورا اعتماد تھا اور یہ ظاہری شان و شوکت اور دلفریب مناظر اس کی نظر میں ٹھیکروں سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے اور ظاہری عیش و عشرت پر جینے مرنے والوں اور جاہلی زندگی گزارنے والوں پر اس کو ترس آتا تھا، یہ تاریخ اسلام کے قرنِ اول کا واقعہ ہے، اس کو میں آپ کے سامنے بیان کر رہا ہوں، اس میں عبرت و نصیحت بھی ہے، اور یہ ہمارے لئے سبق آموز بھی ہے۔

ایرانی افواج کا سب سے بڑا قائد جس کو رستم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور جس کو اپنے دبدبہ اور شان و شوکت میں شہنشاہِ ایران کے قریب ہی سمجھا جاتا تھا، اس نے لشکرِ اسلام کے قائد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ کسی ایسے آدمی کو بھیج دیا جائے جو اس مقصد کی وضاحت کرے جو عرب کے صحرا نشینوں اور بدوؤں کو ان متمدن ملکوں تک لے آیا جو تہذیب و تمدن اور عسکری قوت میں نقطۂ عروج پر ہیں، اور ملک عرب کو ان سے کوئی نسبت نہیں۔

اب غور کیجئے کہ وہ آدمی جو تختِ سیادت و قیادت پر بیٹھا ہوا ہے، اور ایک بڑے رقبہ پر اس کی حکومت ہے، اس کا عربوں کے بارہ میں کیا تأثر ہو گا جو خیموں

اور کچے مکانات میں بود و باش رکھتے تھے، اور جن کا گزارہ کھجور اور اونٹ کے گوشت پر تھا، وہ کس لاپرواہی اور حقارت کی نگاہ سے عربوں کی طرف دیکھتا ہوگا اس نے کہلوایا کہ کوئی ایسا آدمی بھیج دیا جائے جو اس قصد و محرکات کی ترجمانی کردے جو اُن کو یہاں لائے ہیں۔

یہ اسلام کا معجزہ ہے کہ اس نے تمام عربوں کو فکر و عقیدہ و ایمان باللہ اور مقصدِ اسلام پر ناز و فخر کے ایک بلند و بالا معیار پر پہنچا دیا تھا، حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ نے حضرت ربعی بن عامرؓ کا انتخاب فرمایا، یہ حضرت ربعی بن عامرؓ جن سے اکثر علمائے تاریخ و سیر ناواقف ہیں، اُن کو لشکرِ اسلامی میں کوئی شانِ امتیازی بھی حاصل نہ تھی، میں آپ کے سامنے یہ قصّہ کوئی افسانہ کے طور پر نہیں بیان کر رہا ہوں کہ جس میں صرف وقتی مزہ ہے یا قومی فخر و عزّت کا سامان ہے، میں اس لئے آپ کے سامنے اس قصّہ کا ذکر کر رہا ہوں تاکہ آپ اس طاقتور ایمان و اعتماد کا جس نے ایرانی لشکروں کے قائدِ عام رستم کے سامنے اس جرأت مندانہ اور آزادانہ گفتگو پر آمادہ کیا کچھ اندازہ کرسکیں اور مؤمن کے کردار، جرأت و عزم اور ایمانی قوت کا مغربی تہذیب و ترقی اقتدار و غلبہ کے بارہ میں اپنے موقف اور کردار سے موازنہ کرسکیں، یہاں ہمارا اپنے آپ کے ساتھ اپنے پیغام کے ساتھ اور اپنی ذمّہ داریوں کے ساتھ کیا معاملہ ہے اور مغربی تہذیب جو یہاں رائج ہے اور جس کو اس وقت معاصر دنیا میں سیادت و قیادت کا مقام حاصل ہے، اس کی طرف ہم کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

حضرت ربعی بن عامرؓ رستم کے دربار میں تشریف لائے اُن کے لباس میں پیوند لگے ہوئے تھے، معمولی سی تلوار اور ڈھال اُن کے ساتھ تھی، ایک معمولی اور پست قد و قامت گھوڑے پر سوار تھے، اسی حال میں قالینوں کو روندتے ہوئے تشریف لائے، پھر گھوڑے سے اترے وہیں کسی تکیہ سے اس کو باندھ دیا اور رستم کی طرف بڑھنے لگے، ہتھیار ان کے ساتھ

تھے، زرہ میں ملبوس تھے، اور سر پر خود تھا، خدم و حشم اس پر معترض ہوئے اور کہنے لگے ہتھیار اتار دو، حضرت ربعی بن عامرؓ نے فرمایا: میں خود تمھارے پاس نہیں آیا، تمھاری دعوت پر آیا ہوں اگر اسی حال میں جانے دیتے ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ میں واپس جاتا ہوں، رستم نے کہا کہ آنے دو، حضرت ربعیؓ اپنے نیزہ کو ان ریشمی قالینوں پر ٹیکتے ہوئے آگے بڑھے حتیٰ کہ ان میں اکثر قالین پھٹ گئے۔

ربعیؓ رستم کے پاس پہنچے رستم نے پوچھا کہ عرب کس مقصد سے یہاں آئے ہیں؟ انھوں نے پورے ایمان و یقین کے ساتھ جو اُن کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا تھا اور بھرپور اعتماد کے ساتھ جس نے اُن کے اعصاب کو مضبوط بنا دیا تھا، اس لئے کہ اُن کی پُشت پر جو چیز کار فرما تھی، وہ آسمانی کتاب تھی، نبوّتِ صادقہ تھی، غیر متزلزل اور پختہ عقیدہ تھا، بلند ہمّت تھی اور تیر بہدف نگاہ تھی، انھوں نے فرمایا: "ہم کو اللہ نے اس لئے بھیجا ہے، تاکہ ہم ان لوگوں کو جن کو اللہ چاہے بندوں کی غلامی سے نکال کر خدائے واحد کی غلامی میں لے آئیں، دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا کی وسعت میں لائیں اور مذاہب کے جور و ستم سے نکال کر اسلام کا عدل و انصاف عطا کریں۔"

بزرگو اور دوستو! اسلام کے پیغام و دعوت اور اس کے بنیادی مقصد کے بارہ میں حضرت ربعیؓ نے جو فرمایا اس پر کامل یقین کے ساتھ اور جو انھوں نے لوگوں کو اللہ کی بندگی کی طرف لانے اور دوسرے مذاہب کے جور و ستم سے نکال کر اسلام کے عدل و انصاف کی راہ دکھانے کا ذکر فرمایا اس پر کوئی حیرت و استعجاب نہیں ہوتا کہ یہ ان کے عقیدہ اور یقین کی بات تھی، لیکن مجھے اُن کے اس جملہ پر بڑی حیرت و استعجاب ہے، جس میں انھوں نے فرمایا کہ ہمیں اس لئے بھیجا گیا ہے کہ "دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا کی

وُسعت کی طرف لائیں، اگر وہ دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی وسعت میں لانے کا ذکر فرماتے تو مجھے ادنیٰ تعجب نہ ہوتا، اس لئے کہ یہ تو ایسی حقیقت ہے جس پر ہر مسلمان اور صاحبِ ایمان یقین رکھتا ہے، اور حضرت ربعیؓ کا واقعہ تو قرنِ اول کا ہے، میں اُن کے اس جملہ پر غرقِ حیرت ہو جاتا ہوں کہ ہم تم کو دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا کی وسعتوں میں لانا چاہتے ہیں، گویا کہ وہ فرماتے ہیں ہم نے اپنے اوپر ترس کھا کر اور ان ملکوں کے عیش و عشرت کی طمع میں اپنے وطن کو ترک نہیں کیا، ہم تو یہاں تم پر ترس کھا کر آئے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ تم کو تنگ و تاریک قید خانے سے آزاد کریں جس میں تم اس پرندہ کی طرح زندگی گزار رہے ہو جس کو کسی ظرف یا قفس میں بند کر دیا جاتا ہے اور دانہ اور پانی اسی کے اندر دے دیا جاتا ہے، اس لئے کہ تم اپنی عادتوں اور ضرورتوں کے غلام ہو، خواہشاتِ نفس کے غلام ہو، مُروّجہ فیشنوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے، تمھارے لئے تنہا ایک لمحہ گزارنا مشکل ہے، تم اپنی مرضی کے مطابق کوئی کام نہیں کر سکتے، تم کو قدم قدم پر خادموں اور معاونوں کی ضرورت ہے، پہرہ داروں اور چوکیداروں کی ضرورت ہے، کوئی کام بھی تم بغیر کسی مددگار کے انجام نہیں دے سکتے۔

تاریخی شواہد موجود ہیں کہ جب شاہ ایران یزدگرد اپنی مملکت سے فرار ہوا تو درمیان سفر اس کو پیاس لگی، ایک گھر میں داخل ہوا، اس کو ایک معمولی روزمرہ کے استعمال کے گلاس میں پانی دیا گیا تو اس نے کہا کہ میں اس گلاس میں پانی نہیں پی سکتا، اس لئے کہ وہ تو سونے اور چاندی کے گلاس میں پانی پینے کا عادی تھا، ایرانیوں کا تو یہ حال تھا کہ اگر ان میں کوئی بڑا آدمی ایک لاکھ درہم سے کم کا تاج پہنتا یا اس کے پاس عالی شان محل اور اس کے لوازمات حوض و فوّارہ اور باغات نہ ہوتے تو اس کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا۔

گویا کہ حضرت ربعیؓ یہ فرما رہے ہیں کہ تم تو اپنے خادموں کے خادم اور غلاموں کے غلام ہو اس لئے کہ اُن سے زیادہ تم ان کے محتاج ہو، ہماری آرزو ہے کہ تمھیں اس تنگ و تاریک قید خانہ سے نکال کر وسعت و آزادی کی فضا میں لائیں ہم یہاں اپنی ضرورت سے نہیں آئے، ہم نے تو یہ دور دراز کا سفر تمھاری ضرورت کے پیش نظر کیا ہے، ہمارے لئے اپنے وطن میں کوئی تنگی نہیں وہ صحراء تو بڑا کشادہ اور وسیع ہے، ہم کو تو تمھاری اس غیر فطری اور غیر طبعی معیشت پر لے چلنی ہے جس میں تم مست ہو، یہی لے چلنی ہمیں یہاں لائی ہے، ہم لوگ خواہشات پر چلنے والے نہیں ہیں، ہم خاص پوشاک اور راتب کے غلام نہیں ہیں اور نہ خادموں اور غاشیہ برداروں کے محتاج ہیں، ہم صحراء میں آزادی کی زندگی گزارنے والے ہیں، جو میسّر آتا ہے کھاتے ہیں اور شکر کرتے ہیں، ہم کو تو اللہ نے اس لئے بھیجا ہے کہ جس کو وہ چاہے اس کو ہم لوگوں کی غلامی سے نکال کر ایک اللہ کی غلامی میں لے آئیں، دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا کی وسعت عطا کریں، اور مذاہب کے جور و ستم سے آزاد کرکے اسلام کے عدل و انصاف سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیں، تم مذاہب کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہو جس کے نتیجہ میں مصیبتوں میں گرفتار ہو، ذلّت و خواری تمھارا مقدّر بنی ہوئی ہے، اور حقیقی سکون و راحت تم کو نصیب نہیں ہے۔

میرے بھائیو اور دوستو! میں طوالت دینا نہیں چاہتا، آپ کی بھی ذمّہ داریاں اور مشغولیتیں ہیں، میں آپ سے مختصراً کہتا ہوں، آپ یہاں آزادانہ، مؤثر اور بنیادی کردار ادا کریں، آپ کی زندگی مثالی زندگی ہو، جو لوگوں کی نگاہیں پھیر دے اور توجہ مرکوز کر دے، ذہنوں میں ایسے سوالات پیدا ہوں جو موازنہ کرنے پر مجبور کریں، اور اسلام کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کا داعیہ پیدا ہو، اگر آپ نے بھی مغربی طرز معاشرت اختیار کر لیا، آپ انہی کے مقلّد بن گئے، اور اپنے بلند معیار سے اپنے کو نیچے گرا لیا تو آپ میں اور یہاں کے

مغربی باشندوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہ سکتا اور نہ اُن میں معلومات کا شوق اور غور و فکر کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے، اور نہ آپ کا احترام ان کے دل میں آسکتا ہے، چہ جائیکہ وہ آپ کو قابلِ تقلید و نمونہ سمجھیں۔

لیکن جب آپ ان کے سامنے ایک نامانوس طریقۂ زندگی پیش کریں گے تو اس سے اُن کے اندر ایک جستجو پیدا ہو گی، اور وہ آپ سے پوچھنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ طریقۂ زندگی آپ نے کہاں سے اخذ کیا اور یہ بلند و بالا اقدار اور اخلاقِ فاضلہ آپ نے کس سے سیکھے، ان میں اشتیاق پیدا ہو گا کہ اُن کو آپ ایسا لٹریچر دیں جس سے وہ اسلام سے متعلق مستند معلومات حاصل کریں، اور آپ اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ سے روشناس کرائیں اور اُن کو وہ راستہ دکھائیں جس پر چل کر آپ کے اندر یہ قدریں پیدا ہوئیں اور یہ بلند کردار آپ کو حاصل ہوا، اس وقت وہ آپ کو احترام و عقیدت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

مسلمان بھائیو اور یہاں کے باشندو! (خواہ وہ یہاں کے مستقل ہوں یا کچھ مدت کے لئے آئے ہوئے ہوں) ایسا نمونۂ زندگی پیش کیجئے جو ان میں اسلام کے مطالعہ کا شوق پیدا کر دے اور اس راستہ کو جاننے کا اشتیاق پیدا کر دے جس پر چل کر یہ طرزِ زندگی، اور طریقۂ فکر ہم کو عطا ہوا، یہی تنہا وہ انقلاب انگیز راستہ ہے جس پر چل کر آپ ان غیر اسلامی ملکوں میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں، اگر آپ ان ہی کے رنگ میں رنگ گئے اور وہی طریقۂ زندگی اختیار کر لیا، (خواہ یہ احساس کمتری اور نقالی کا جذبہ عالمِ عربی میں ہو یا ہندوستان یا افریقہ کے کسی حصہ میں یا دنیا کے کسی بھی ملک میں) آپ ہرگز ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتے، اور کوئی تبدیلی عمل میں نہیں لا سکتے خواہ سو سال یا اس سے زیادہ مدت تک یہاں قیام

اور زندگی گزارنے کا موقع ملے۔

آخر میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے سکون واطمینان کے ساتھ تقریر سنی اور اگر مجھ سے کوئی زیادتی ہوئی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔

ضیاء الرحمٰن انصاری صاحب کا حادثۂ وفات

اکتوبر کا پہلا ہفتہ تھا کہ سابق وزیر مرکزی اور ایک غیور و باحمیّت مسلمان رکنِ حکومت اور خادمِ ملّت، جناب ضیاء الرحمٰن انصاری صاحب کی وفات کی اطلاع ملی، ۸ر اکتوبر کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں راقم نے ان کی وفات کو ایک ملّی حادثہ سے تعبیر کیا اور کہا کہ ان کی مخلصانہ حمیّت، اسلامی غیرت اور مجاہدانہ وکالت وحمایت سے مسلم پرسنل لا کے قضیہ کو بڑی تقویت حاصل ہوئی تھی، ان کی دوسری خصوصیات کے ساتھ جو باتیں ان کو دوسرے مسلم وزراء سے ممتاز کرتی ہیں، وہ ان کی صحیح الاعتقادی، دینی حمیّت، غیرت، دین کا احترام اور اس کی صحیح وکالت وترجمانی اور اپنے اثر ورسوخ اور صلاحیتوں کو کام میں لانا ہے، جو اس طبقہ میں بڑی نادریات تھی، انصاری صاحب کو مولانا آزاد سے بڑی عقیدت اور مناسبت تھی، انھوں نے مولانا کی چیزیں بڑے احترام وشغف سے پڑھی تھیں، اور مولانا آزاد کے سلسلہ میں جو جلسے مولانا آزاد میموریل اکیڈمی کی طرف سے لکھنؤ میں ہوئے ان میں وہ بڑے شوق سے شریک ہوئے اور اظہارِ عقیدت و واقفیت کیا، ان کا آخری دور امراض وتکالیف کے بڑے مجاہدہ کا تھا، کیا عجب کہ ان کی موت شہادت کی موت ہو۔

حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی کا انتقال

حکیم عبدالقوی دریابادی، ادیب شہیر و محقّق کبیر مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مرحوم کے حقیقی بھتیجے اور داماد تھے، راقم سطور کو کم سنی، قربِ مکانی، اور مولانا کی ذات و خیالات سے مناسبت و عقیدت اور ان کے خاندان سے روابط کی بنا پر حکیم صاحب سے ایک برادرانہ و عزیزانہ تعلق تھا، وہ ہمارے شیخ و استاد مولانا خلیل بن محمد عرب (استاد لکھنؤ یونیورسٹی) کے خانگی مدرسہ میں تعلیم و استفادہ کے لئے آتے تھے، وہاں ان سے خصوصی تعارف اور دوستی پیدا ہوئی جو زمانہ و عمر کے ساتھ بڑھتی گئی اور وہ راقم کے خصوصی حلقۂ احباب میں شامل ہو گئے[1]، اور یہ تعلق اخیر وقت تک رہا، ان کی بیماری کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس کا علم دیر میں ہوا، ۱۶ ؍ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو جب وہ بلرام پور ہاسپٹل میں داخل تھے، ان کے برادر خورد اور فاضل عزیز محمد ہاشم قدوائی صاحب (سابق پروفیسر و صدر شعبہ سیاست مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور حال رکن راجیہ سبھا) کی معیت میں ان کی عیادت کا شرف حاصل کیا، حکیم صاحب اس وقت نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے، لوگوں نے بیان کیا کہ جب زبان کو حرکت ہوتی ہے تو وہ قرآن مجید پڑھتے ہوئے سُنے جاتے ہیں، وہاں سے راقم دارالعلوم آیا اور چند گھنٹوں کے بعد ان کی وفات کی اطلاع ملی اور راقم ہی کو اپنے رفیق قدیم کی نماز جنازہ پڑھانے کا (تکلیف دہ) شرف حاصل ہوا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

---

[1] حکیم صاحب کے ساتھ تعلقات اور ان کی خصوصیتوں اور حالات کے لئے راقم کا وہ مضمون ملاحظہ ہو جو راقم کی کتاب "پرانے چراغ" کی تیسری جلد میں شامل ہے۔

رائے بریلی میں دعوت وفکر اسلامی کانفرنس

۱۴/۱۵/۱۶/ نومبر ۱۹۹۲ء کو رائے بریلی میں دعوت وفکر اسلامی کے عنوان سے محمد ثانی حسنی میموریل ایجوکیشنل سوسائٹی کی طرف سے ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں متعدد ہندوستانی وعرب فضلاء شریک ہوئے۔

عرب فضلاء میں شیخ محمد المحروس عراقی، جناب امین القضاۃ (عمان واردن) ڈاکٹر عبدالحلیم عویس ریاض، جناب عبدالفتاح سعید الوظبی، احمد فہمی زمزم (ملیشیا) مولانا بدرالحسن قاسمی کویت، ہندوستانی فضلاء میں مولانا عبداللہ مغیثی اور مولانا عبدالکریم پاریکھ قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے اہم عنوانات تھے۔

۱۔ برصغیر ہند وپاک اور بنگلہ دیش میں دعوتِ اسلامی اور اس کا اسلوب۔

۲۔ عالمِ عربی میں دعوتِ اسلامی اور اس کا اسلوب۔

۳۔ افریقہ میں دعوتِ اسلامی اور اس کا اسلوب۔

۴۔ یورپ میں دعوتِ اسلامی اور اس کا اسلوب۔

۵۔ جنوب مشرق ایشیا میں دعوتِ اسلامی اور اس کا اسلوب۔

کانفرنس اپنے مقام انعقاد کے حجم واہمیت، چھوٹا شہر ہونے کی وجہ سے انتظامات کی دشواریوں کے باوجود اپنے کارکنوں کی مستعدی اور فرض شناسی کی وجہ سے بہت کامیاب رہی، جس کی نظیر اس شہر کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں رابطۂ ادب اسلامی کی آٹھویں دو روزہ کانفرنس

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں "خطوط اور مراسلات کے ادب" کے عنوان پر

۱۷ر نومبر ۱۹۹۲ء کتب خانہ شبلی کے وسیع ہال میں رابطۂ ادب اسلامی کی طرف سے ایک سیمینار منعقد ہوا، ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، جس میں شہر کے لوگوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی سیمینار اگرچہ علمی تھا لیکن پورے سیمینار پر ایک روحانی کیفیت طاری رہا، عالم اسلام کے متعدد ممتاز دانشور ادیب وانشاء پرداز شریک اجلاس تھے، جن میں وہ سب عرب فضلاء تھے، جن کے نام رائے بریلی کے "فکر ودعوت اسلامی کانفرنس" کے سلسلہ میں لئے گئے، ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور علمی اداروں کے استاد شریک محفل تھے، اس عالمی رابطۂ ادب اسلامی کے دو روزہ بین الاقوامی علمی مذاکرہ کا افتتاح تلاوت قرآن اور علامہ اقبال کی ایک نظم کے بعد راقم کے ایک مقولہ سے کیا گیا کہ "تحریروں کی جان خلوص، بے ساختگی، اللہ کے یہاں قبولیت کا خیال، اور ضمیر کے صحیح تاثر کی پیش کش ہوتی ہے" اور ایسی تحریروں کو خطوط، "خواطر" اور "مراسلات" میں تلاش کرنا چاہئے جو ان خوبیوں کے حامل ہیں لیکن نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں، اس اجلاس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مندوبین کے نام ایک پیغام دیا گیا جس میں کہا گیا:۔

"آپ یہاں سے یہ پیغام لے کر جائیے کہ ہمیں ہر قیمت پر اپنے دین کو ہر طرح کی کنزرویٹیو کوششوں سے محفوظ رکھتے ہوئے اس کی تمام خصوصیات کے ساتھ باقی رکھنا ہے اور ہم اپنے دین اور اپنی تہذیب وزبان کو ہر قیمت پر محفوظ اور برقرار رکھیں گے۔

ہندوستان اور عالم اسلام میں درپیش سنگین چیلنجوں، یہودیوں کی غیر معمولی ذہانت اور امریکی ویورپی وسائل کی کثرت نے مل جل کر ملت کے

سامنے ایک زبردست چیلنج پیش کیا ہے' اور آج مسلمانوں سے جارحانہ نعروں کے ذریعہ اپنا دین بدلنے کے لئے کہا جا رہا ہے' اردو اور اس کے رسم الخط کو مٹانے کی سازش کی جارہی ہے' نوجوانوں میں الحاد اور تشکیک کے بیج بوئے جارہے ہیں' اور علماء اور دین پسندوں کے خلاف محض اس لئے مہم چلائی جارہی ہے کہ وہ فنڈا منٹلسٹ یا اصول پسند ہیں' یہ خطرہ صرف اردو ہی کے لئے نہیں ہے کل یہی خطرہ عربی کے لئے بھی ہوسکتا ہے"۔

عرب فضلاء نے بھی اس سلسلہ کے مختلف موضوعات پر فاضلانہ مضمون پڑھے' ہندوستانی فضلاء میں سے جامعہ اسلامیہ دہلی کے پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب' ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی پروفیسر دہلی یونیورسٹی ———— پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی صدر شعبہ عربی الہ آباد یونیورسٹی، پروفیسر عبدالوہاب، ڈاکٹر نشاء الرحمٰن نشاء (ناگپوری) ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی، مولانا عبدالکریم پاریکھ، ڈاکٹر محمد راشد ندوی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، پروفیسر شعیب اعظمی، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی، اور ڈاکٹر عبدالباری سبحانی نے مقالات پیش کئے، اور سیمنار میں اظہار خیال کیا۔

رام جنم بھومی قضیہ کا بُحران

اندرون و بیرون ملک کی مشغولیتوں' دوروں اور علمی، ادبی اور دعوتی مجالس کی مشغولیتوں کی اس مختصر روئداد کے بعد جس کے بغیر راقم سطور کے مزاج و مذاق، تنوّع بلکہ متضاد مشاغل اور دلچسپیوں اور عہد اور ملت کے تقاضوں کا سمجھنا اور

ان کا اندازہ کرنا ممکن نہ تھا، اب ہم اس مسئلہ کی طرف آتے ہیں، جو ملک کی پوری فضا اور دل و دماغ کی سطح پر ایک غبار اور کہر کی طرح ہی چھایا ہوا نہیں تھا بلکہ ایک دبیز غلاف کی طرح چپکا ہوا تھا، وہ رام جنم بھومی کا مسئلہ تھا، جو مجلسوں کا موضوعِ سخن، اخبارات کا سب سے نمایاں عنوان اور ذرائع نشر و اشاعت کا سب سے طویل و عریض موضوع تھا، ملک ایک ایسے بحرانی دور سے گزر رہا تھا جس کا مشاہدہ و تجربہ ماضی قریب ہی نہیں ماضی بعید میں بھی نہیں ہوا تھا۔

راقم سطور اور اس کے رفقاء آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ممتاز ارکان، نے اپنے اخباری بیانات میں خبر رساں ایجنسیوں اور اخباری نمائندوں کے انٹرویوں میں بالکل واضح طریقہ پر اعلان کر دیا تھا کہ "مسجد نہ منہدم کی جاسکتی ہے نہ منتقل کی جاسکتی ہے وہ ہمیشہ مسجد ہی رہے گی اور اپنی جگہ پر رہے گی" دہلی کے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اس اجلاس سے لے کر جو گزشتہ سال اس موضوع پر بحث کرنے اور مسلمانوں کا موقف ظاہر کرنے کے لئے منعقد کیا گیا تھا کسی ایک دن اور کسی ایک ساعت میں بھی اس کے خلاف پرسنل لا بورڈ کے کسی ذمہ دار آدمی نے ایک لفظ نہیں کہا۔

لیکن مسئلہ کے اس وقت تک حل نہ ہوسکنے اور اس کے بارہ میں قیاس آرائیوں اور مبالغہ آمیزیوں بلکہ بعض اردو اخبارات کی طرف سے افواہ بازیوں اور افتراپردازیوں کی وجہ سے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ پھر اس کے بارہ میں پرسنل لا بورڈ کی طرف سے واضح اعلان کیا جائے، یوں بھی پرسنل لا بورڈ کے مجلس عاملہ کا جلسہ، کاموں کا جائزہ لینے اور اصلاحی، معاشرتی اور قانونی مسائل پر مشورہ کرنے کے لئے بلانے کی ضرورت تھی،

راقم کی دعوت پر اس کا لکھنؤ میں ہونا طے پایا، اور اس کے لئے ۱۱؍اگست ۱۹۹۲ء کی تاریخ مقرر ہوئی، لکھنؤ میں گلمرگ ہوٹل میں مہمانوں کے ٹھہرنے اور اجلاس کو منعقد کرنے کا انتظام کیا گیا، اس اجلاس میں چوبیس۲۴ ارکانِ عاملہ اور سات۷ مدعوئین خصوصی جمع ہوئے، علاوہ دوسری تجاویز کے جو اس مجلس عاملہ کی رپورٹ میں درج ہیں، بابری مسجد کے بارہ میں ایک واضح اور طاقتور تجویز منظور ہوئی، ۲؍دسمبر ۱۹۹۰ء کو مسجد کی شرعی حیثیت کے بارہ میں جو قرارداد منظور کی گئی تھی، اس کا حوالہ دیا گیا اور کہا گیا کہ اس وقت ملک کی جس ذمہ دار شخصیت (وزیر اعظم) واسطہ ہے، اس کے لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اور فراست اور عزیمت کی بھی۔

نرسمہا راؤ جی کا راقم کے نام خط اور اس کا جواب ۳۰/۹/۱۹۹۲

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہو رہا تھا کہ ۱۱؍اگست ۱۹۹۲ء کو راقم کی قیام گاہ (مہمان خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء) میں نرسمہا راؤ جی وزیر اعظم ہند کے فرستادہ ان کا ذاتی مکتوب لے کر آئے[۱] اور انھوں نے بتایا کہ یہ نرسمہا راؤ جی کا اپنے قلم سے لکھا ہوا خط ہے، خط بہت صاف اور فصیح اردو اور واضح اور مشاقانہ رسم الخط میں ہے، یہ خط بجنسہٖ درج کیا جاتا ہے۔

مکتب العلامة أبي الحسن علي الحسني
دار عرفات رائے بریلی (الہند)

"محترمی! آداب

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

خواہش تو یہی تھی کہ آپ سے ملاقات ہوتی لیکن پچھلے دنوں جو صاحبان

---

[۱] بعض لوگوں نے بتایا کہ وہ وزارت کے عہدہ پر فائز ہیں، مجھے اس کی تحقیق نہ ہو سکی۔

آپ سے مل کر آئے ان سے معلوم ہوا کہ فی الوقت آپ کے لئے دہلی کا سفر مشکل ہوگا لہذا یہ خط ارسال کر رہا ہوں۔

بابری مسجد اور رام جنم بھومی تنازعے کو باہمی مفاہمت اور گفت وشنید کے ذریعے حل کرنے کی قومی رائے عامہ بنتی جارہی ہے، جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ یہ انتہائی پیچیدہ نازک اور حساس مسئلہ بن گیا ہے اور اس مسئلہ کا منصفانہ معقول اور سب کے لئے قابل قبول حل نکالنے کی کوشش ملک کے ممتاز مذہبی رہنماؤں کے مشورے اور عملی تعاون کے بغیر نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی۔

ملکوں اور قوموں کی زندگی میں بعض مراحل ایسے آتے ہیں کہ جب وقتی مصلحتوں، سیاسی مفادات پرجوش جذباتیت اور اشتعال انگیزی سے کنارہ کشی کرتے ہوئے نیک نیتی، دور اندیشی، دیانتداری، دردمندی اور دانشمندی کے ساتھ ہی قومی نوعیت کے اور مذہبی جذبات سے جڑے ہوئے پیچیدہ مسائل کو حل کیا جانا چاہیئے۔

مجھے یقین ہے کہ آپ میری رائے سے اتفاق فرمائیں گے، آپ نے اس مسئلہ کے حل کے لئے ماضی میں جو مثبت اور مخلصانہ کوشش کی ہے اسی کے پیش نظر مجھے امید ہے کہ آپ نئے سرے سے اس سلسلہ میں رہنمائی اور تعاون فرمائیں گے۔

بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے تنازعے میں مذہب، تاریخ، قانون اور سیاست سب کو اس طرح الجھا دیا گیا ہے کہ اسے حل کرنا کسی ایک فرد کے لئے انتہائی دشوار ہے، اس خیال کے پیش نظر میں کھلے دل ودماغ سے ہر مناسب، معقول اور مثبت تجویز اور مشورہ پر خواہ وہ کسی بھی فرد، حلقے، جماعت یا فرقے کی طرف سے سامنے آئے غور کرنے کے لئے تیار ہوں اور سب کا تعاون ضروری سمجھتا ہوں۔

ملک میں امن اعتماد اور مذہبی رواداری کا ماحول قائم رہے یہ میری ذاتی خواہش ہی نہیں بلکہ یہ ملک کی اندرونی سلامتی اور بیرونی وقار کے لئے تمام ہندوستانیوں کی قومی اور اخلاقی ذمّہ داری ہے۔

تمام تر مشکلات کے باوجود اگر نیک نیت، دیانت دار اور اعتدال پسند اصحاب اجتماعی شعور اور باہمی مشورے سے اس مسئلہ کا حل تلاش کریں تو مناسب اور قابل قبول عمل حل سامنے آسکتا ہے۔

مناسب تو یہی تھا کہ آپ سے ملاقات ہوتی تاکہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے گفتگو ہوسکتی، لیکن اگر کسی وجہ سے اس وقت آپ کے لئے دہلی کا سفر ممکن نہیں تو براہِ کرم اس سلسلہ میں آپ مجھے اپنے خط یا اپنے کسی نمائندہ کے ذریعہ اپنی رائے، مشورے یا اس سلسلہ میں طریقۂ کار یا عملی حل کے لئے اپنی تجاویز سے مطلع فرمادیں، سب کی رائے ہے کہ اس سلسلہ میں بلا تاخیر مناسب اقدام کئے جانے چاہئیں، اسی لئے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔

شکریہ

مخلص

(دستخط)

(پی۔ وی۔ نرسمہاراؤ)''

جو صاحب خط لے کر آئے تھے، ان سے کہا گیا کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہو رہا ہے، اور مجھے اسی وقت وہاں جانا ہے، میں اس سے فارغ ہو کر اس کا جواب لکھ کر حوالہ کردوں گا، انھوں نے اس کو منظور کیا، اس خط میں راقم نے فوری طور پر اپنی ملاقات کو دشوار بتایا کیونکہ ستمبر کے پہلے ہفتہ کے آخر میں اس کو آکسفورڈ یونیورسٹی کے سنٹر آف اسلامک اسٹڈیز کے سالانہ جلسہ میں شرکت کرنی تھی،

جس کا وہ صدر ہے، مزید یہ کہ وہ ملک کے عمومی اور وسیع مسئلہ پر گفتگو کو ترجیح دینا ہے جس کے لئے اس کا علیحدہ سے ملنا زیادہ مفید ہوگا، اس کے لئے ۶، ۷ر ستمبر کی تاریخ کو ترجیح دی گئی، خط بجنسہٖ یہاں درج کیا جارہا ہے۔

"گرامی مرتبت جناب نرسمہا راؤ صاحب وزیر اعظم ہند۔

جناب کا گرامی نامہ کل ۱۱ر اگست کو دستی طریقہ پر پہنچ کر باعث عزت افزائی ہوا پھر اس کو اردو میں آپ کے قلم سے دیکھ کر مزید مسرت ہوئی اور آپ کی اس خصوصیت وامتیاز کا مشاہدہ اور تجربہ ہوا جس کی شہرت میں نے پہلے سے سن رکھی تھی۔

جواباً گزارش ہے کہ مجھے خود عرصہ سے آپ سے براہ راست نیاز حاصل کرنے کی خواہش اور ضرورت کا احساس تھا، میں آپ سے تخلیہ کی ایک ایسی ملاقات چاہتا تھا جس میں میں آپ سے ملک کے وسیع مفاد میں گفتگو کر سکوں کہ ملک اس وقت ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہے جو عرصۂ دراز کے بعد بدقسمتی سے ملکوں اور قوموں کو پیش آتی ہے اور جس کی تلافی بعض اوقات ناممکن اور بعض اوقات سخت دشوار ہو جاتی ہے، میں نے آپ کی اس ذمہ داری (وزارت عظمیٰ) کے سنبھالنے کے معاً بعد ایک مفصل عریضہ کسی معتبر ذریعہ سے ارسال خدمت کیا تھا، جس کے متعلق معلوم ہوا کہ آپ نے توجہ اور دلچسپی کے ساتھ اس کا مطالعہ فرمایا اور جواب دینے کا بھی وعدہ یا ارادہ فرمایا، اس نازک مرحلہ پر آپ کا ملک کی رہنمائی اور سربراہی کے منصب پر فائز ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ خدا آپ سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے۔

حسن اتفاق ہے کہ جس وقت آپ کے فرستادہ حضرات گرامی نامہ لے کر لکھنؤ پہنچنے والے تھے، یہاں اس ناچیز ہی کی صدارت میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

کی مجلس عاملہ (ورکنگ کمیٹی) کا جلسہ ہو رہا تھا، اور میں کھانے کے وقفہ میں وہاں سے اٹھ کر اپنی قیام گاہ پر آیا جہاں ان دونوں حضرات سے ملاقات ہوئی، پرسنل لا بورڈ کے اس جلسہ میں (غالباً آپ ہی کے ایما اور اشارہ پر) اس وفد کی تشکیل کی جانے والی تھی جو آپ کی ملاقات سے شرف یاب ہوگا، وفد کے ارکان کا انتخاب میری رائے پر چھوڑ دیا گیا، آج ۲۱؍ اگست کو میں نے اور پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری مولانا نظام الدین صاحب نے ان ارکان کا انتخاب کیا جو بورڈ کی نمائندگی کریں گے، میں نے قصداً و ارادۃً اپنے کو اس وفد میں شامل نہیں رکھا جو تنہا بابری مسجد، رام جنم بھومی تنازعہ پر گفتگو کرے گا، اس کے دو اسباب ہیں ایک تو یہ کہ یہ منتخب ارکان وفد مختلف ریاستوں کے رہنے والے اور مختلف اداروں کے ذمّہ دار ہیں، کسی کو کسی تاریخ میں عذر ہو سکتا ہے اور کسی کو کسی تاریخ میں، معلوم نہیں یہ کس دن اور کس تاریخ پر آپ کی ملاقات اور بورڈ کی نمائندگی کر سکیں گے، اور میری مجبوری یہ ہے کہ میں ستمبر کے پہلے ہفتہ کے آخر میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے سنٹر آف اسلامک اسٹڈیز کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لئے (جس کا میں چیرمین ہوں) (ان شاء اللہ) لندن کے لئے روانہ ہو جاؤں گا، دوسرے یہ کہ اس وفد کی گفتگو خاص اس تنازعہ کے موضوع پر ہوگی جس کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے اور میں ملک کی موجودہ صورتِ حال اور اس کی اصلاح کے موضوع پر بھی گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور وہ بھی تنہائی میں جس کا مجھے اس محدود وقت میں اور کثیر التعداد ارکان وفد کی موجودگی میں موقع نہیں ملے گا اور مناسب بھی نہیں ہوگا، اس لئے میری درخواست ہے کہ ۶؍ ستمبر یا ۷؍ ستمبر کی تاریخ میں مجھے اجازت دی جائے کہ میں آپ سے تنہائی میں مل سکوں،

شاید اس طرح ملک کی کوئی خدمت ہو سکے اور بعض حقائق پر بے تکلفانہ غور کرنے اور ان کے حل کی تلاش میں مدد ملے، آپ کو اگر اس سے اتفاق ہو اور آپ ۶ یا ۷ ستمبر کو اس کے لئے وقت نکال سکیں تو مطلع فرمائیں میں انشاء اللہ حاضر ہو جاؤں گا، اور اس سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا، خدا آپ کو اس ملک کی خدمت کے لئے تا دیر سلامت رکھے اور مدد و رہنمائی فرمائے۔

مخلص و دعا گو

ابوالحسن علی ندوی

۱۲ اگست ۱۹۹۲ء"

عاملہ کے جلسہ کے شرکاء کو جب یہ معلوم ہوا کہ صدر بورڈ (راقم) کو وزیر اعظم صاحب نے ملاقات کی دعوت دی ہے تو مجلس عاملہ نے طے کیا کہ صدر بورڈ بمشورہ جنرل سکریٹری (مولانا سید نظام الدین صاحب) ملک گیر نمائندہ وفد تشکیل دیں، جو حکومت کو بورڈ کے موقف سے مؤثر انداز میں متقررہ تاریخ پر واقف کرائے، بورڈ بات چیت کے ذریعہ نکلنے والے ہر ایک ایسے حل کی تائید کرے گا جو شریعت کے مطابق ہو، بورڈ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس مسئلہ کو جلد از جلد طے کر لینا ملک کے مفاد میں ضروری ہے۔[1]

وزیر اعظم صاحب سے ملاقات

راقم کا خیال تھا اور اس نے اس خیال کا جنرل سکریٹری صاحب سے اظہار بھی کر دیا تھا کہ اس وقت مجلس عاملہ کے وہ ارکان جن کا راقم اور جنرل سکریٹری (مولانا

[1] اقتباس از کارروائی مجلس عاملہ منعقدہ ۱۱ اگست ۱۹۹۲ء

سید نظام الدین صاحب) نے مشورہ سے انتخاب کیا ہے وزیر اعظم صاحب سے مل لیں، میرے انگلستان کے اس سفر کی وجہ سے جو قریبی تاریخوں میں تھا، دو۲ مرتبہ دہلی جانا مشکل ہوگا، لیکن مولانا نظام الدین صاحب نے دہلی سے بار بار ٹیلیفون کیا کہ آپ کا وفد میں ہونا ضروری ہے اور آپ کی عدم شرکت محسوس کی جائے گی، راقم نے بھی یہ سوچا کہ یہ زمانہ بدگمانیوں اور قیاس آرائیوں کا ہے، اس کی عدم شرکت تساہلی اور مسئلہ کی اہمیت نہ محسوس کرنے پر محمول کی جائے گی، چنانچہ وہ بھی دہلی چلا گیا، ۵ اراگست ۱۹۹۲ء کو محترم ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب کے دولت خانہ پر جانے والے ارکان جمع ہوئے، پھر وہاں سے پرائم منسٹر صاحب کے جائے قیام پہنچے، راقم نے گفتگو کا آغاز کیا، جس میں ملک کی نازک صورت حال کی طرف اشارہ تھا، اور ضمناً کہا کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد پہلی مرتبہ جنوبی ہند کی ایک شخصیت کا وزارتِ عظمیٰ کے لئے انتخاب کیا گیا ہے، جنوب اپنی رواداری اور تعصبات سے دوری میں ابھی تک نیک نام اور ممتاز رہا ہے، توقع کی جاتی ہے کہ آپ اس وسیع القلبی اور وسیع النظری سے اس مسئلہ کا حل تلاش کریں گے، ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا کہ مسجد کسی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کی جاسکتی، ہندوستان دینی مسائل میں قدیم زمانہ سے اپنا ایک مقام رکھتا ہے جس کا اعتراف اسلامی عرب ملکوں کو بھی ہے، اس لئے اس کے علماء کی رائے قابلِ احترام اور ہر طرح سے قابلِ اعتبار ہے، ان کا اس پر اتفاق ہے کہ مسجد اپنی جگہ سے ہٹائی نہیں جاسکتی، اور اس کی جگہ پر کوئی دوسری عمارت نہیں بن سکتی۔

اس کے بعد دوسرے معزز ارکان وفد نے جن میں علماء و وکلاء اور قائدین

شامل تھے، گفتگو کی، جو اسی بیان کی تائید کرتی تھی، تر سمہا راؤجی یہ سب خاموشی سے سنتے رہے، اور انھوں نے اپنی طرف سے کوئی فارمولا پیش نہیں کیا اور وفد گفتگو سے فارغ ہو کر واپس ہوا۔

راقم کی وزیر اعظم صاحب سے دوسری ملاقات

راقم اپنی قیام گاہ میں جو ذاکر نگر اوکھلے میں واقع ہے[1] ٹھہرا ہوا تھا کہ دوسرے ہی دن پرائم منسٹر صاحب کے سکریٹری کا ٹیلیفون آیا کہ پرائم منسٹر صاحب آپ سے خصوصی ملاقات کرنا چاہتے ہیں، آپ دوبارہ تکلیف کریں، میں نے اس بنا پر کہ زمانہ بدگمانیوں اور قیاس آرائیوں کا ہے معلوم نہیں اس کو کس بات پر محمول کیا جائے، اپنی صحت کی کمزوری اور سفر کے قرب کی وجہ سے معذرت کی لیکن دوبارہ سہ بارہ ٹیلیفون آیا کہ وزیر اعظم صاحب آپ سے ضرور ملنا چاہتے ہیں، آپ ضرور تکلیف کریں، میں نے ہر چند معذرت کی مگر ادھر سے اصرار ہوتا رہا، آخر وقت کی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ (کہ میں آسانی سے لکھنؤ کے لئے گاڑی پکڑ سکوں) میں نے آنے کا وعدہ کر لیا، اس میں اس بات کو بھی دخل تھا کہ ممکن ہے کہ جلد یا دیر پرسنل لا بورڈ کے وفد کو میری ہی قیادت میں دوبارہ ملنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب ہم نے بلایا تھا، اور اصرار کیا تھا، جب تو آپ نہیں آئے اب خود ملنا چاہتے ہیں؟

---

[1] یہ عزیز گرامی مولوی ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی کا مکان ہے جو ان کی ملکیت اور دہلی میں قیام گاہ ہے چند سال سے راقم بہت سی سہولتوں اور تعلقات کی بنا پر دہلی میں وہیں قیام کرتا ہے۔

میں نے آنے کی ہامی بھرلی اور ان کے سکریٹریٹ کے عملہ کے ایک صاحب گاڑی لے کر آگئے، میں نے یہ طے کرلیا (اور دل میں گویا قسم کھالی اور عہد کرلیا) کہ میری زبان سے کوئی لفظ ایسا نہیں نکلے گا جس کا وہ سہارا لے سکیں، اور اس کو دلیل بنائیں اور مسلمانوں کی رائے عامہ اور بورڈ کے اس فیصلہ سے کہ مسجد کسی حال میں منتقل نہیں ہوسکتی ان کو گریز کا موقع یا دلیل مل جائے کہ صدر بورڈ نے ایک نجی ملاقات میں یہ بات کہی تھی جس سے مسئلہ کا دوسرا حل نکالا جاسکتا ہے، راقم اللہ کا نام لے کر اور لکھنؤ کے سفر کے لئے تیار ہوکر ان کی قیام گاہ پر پہنچا اور نہایت محتاط اور مختصر گفتگو کی جس سے غالباً ان کو مایوسی ہوئی اور مسئلہ جوں کا توں اپنی جگہ پر رہا، اُن کی قیام گاہ سے سیدھا اسٹیشن گیا اور لکھنؤ واپس ہوگیا۔

ایک بے بنیاد خبر اور الزام تراشی

راقم لکھنؤ پہنچا تھا کہ چند دنوں میں معلوم ہوا کہ اس کے ایک قدیم رفیق کار نے جو مسلمانوں کی ایک مشہور مجلس میں ذمہ دارانہ عہدہ رکھتے ہیں کسی اخبار کو یہ انٹرویو دیا کہ "مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی" جو وفد کے ساتھ وزیر اعظم صاحب سے ملاقات کر چکے تھے دوبارہ اپنی کوشش اور خواہش سے وزیر اعظم صاحب سے ملے۔

اسی پر بس نہیں ہوا کچھ عرصہ کے بعد پٹنہ سے ایک دوست کا خط آیا کہ یہاں ایک اردو اخبار میں یہ شائع ہوا ہے کہ مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی نے ایک دوسری ملاقات میں وزیر اعظم صاحب کو مسجد کے انہدام کی اجازت دے دی اور کہہ دیا کہ آپ یہ کام کرسکتے ہیں، میں نے خط میں اس کی تردید کی لیکن اس غیر ذمہ دارانہ

اور ناخدا ترسانہ روش پر بڑا رنج اور دلی تأثر ہوا، اور اس سے ملّی سیاست وصحافت کی ایک بڑی کمزوری اور خدا کے یہاں مسئولیت سے بے نیازی اور لاپرواہی کا ایک نمونہ سامنے آیا۔

بابری مسجد کی شکست و ریخت اور ہندوستان کی تاریخ کا ایک عظیم ترین سانحہ

وقت گزرتا رہا اور (B. J. P.) کی حکومت جس کی سربراہی کلیان سنگھ وزیر اعلیٰ کر رہے تھے، اور اس کے ترجمان اور قائد ایڈوانی جی، جوشی جی اور اٹل بہاری باجپئی جی اور ان کے دوسرے رفقاء تھے، بابری مسجد کو مسمار کرنے اور اس کی جگہ پر رام جنم بھومی کو تعمیر کرنے کو ایک تحریک کی طرح پورے ہندوستان میں چلا رہی تھی، اور اس کو ہندو قوم ومذہب بلکہ آزاد ہندوستان کے وقار وعزّت کا ایک مسئلہ بنا دیا گیا تھا، اس کا پروپیگنڈا اس زور شور سے کیا گیا کہ سارے ملک میں ایک آگ سی لگ گئی، اور کارسیوکوں کا ایک ایسا لشکر تیار ہو گیا جو اس کام کو ایک مذہبی فریضہ اور مہابھارت کے معرکہ کی طرح انجام دینے کے لئے تیار تھا۔

اس کے نتیجہ میں بابری مسجد کا انہدام پوری سنگدلی، مذہبی جوش اور نفرت کے جذبہ کے ساتھ عمل میں آیا، اس کی منظر کشی دشوار بھی ہے اور قلب ودماغ پر بار بھی، یہ بھی ثابت ہوا کہ مسجد کی شہادت کے لئے ایک ہفتہ سے ریہرسل (REHEARSAL) جاری تھی، اور پی اے سی (P. A. C.) اور کارسیوکوں کے درمیان تعلقات اتنے ہی دوستانہ رہے جتنے کہ بھارتی جنتا پارٹی اور راشٹریہ سیوک سنگھ (R. S. S.) میں ہیں، مسجد کے انہدام اور اس کے ساتھ معاندانہ اور منتقمانہ طرز عمل کی روئیداد انگریزی،

اردو اخبارات میں شائع ہو چکی ہے، اس کا نقل کرنا باعث طوالت بھی ہے اور دلوں کو زخمی کرنا بھی، انگریزی اخبار (STATESMAN) کے نامہ نگار سنجے کاوے نے کارسیوک کا بھیس بدل کر جو کچھ دیکھا اور سنا وہ دسمبر کے ایک شمارہ میں شائع ہو چکا ہے، اردو اور ہندی اخبارات نے بھی پوری تصویر کشی کی ہے۔

۶ر دسمبر کو اجودھیا میں کیا کیا ہوا اس کے سلسلہ میں وھائٹ پیپر میں تاریخ وار واقعات بیان کئے گئے اور دن او گھنٹوں کی تفصیل کے ساتھ اس سفّاکانہ و بے رحمانہ طریق کار کی تصویر کھینچی گئی ہے، جس کے ساتھ یہ کارروائی مکمل کی گئی، تفصیل اور تصدیق کے لئے اس وھائٹ پیپر کا مطالعہ کافی ہوگا، یہاں اس کے نقل کی گنجائش نہیں ہے۔

لیکن اتنی بات ضرور واضح اور عیاں ہے کہ مرکزی حکومت کے فورس اور (P. A. C.) اور فوج نے فاصلہ پر کھڑے ہو کر ایک تماشائی کا کردار انجام دیا اور کلیان سنگھ کی حکومت اس کارروائی کو تماشائی کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ قدر افزائی اور سرپرستی کے انداز سے دیکھتی رہی، ۸ر دسمبر کو راقم نے ایک بیان جاری کیا جو اخبارات میں شائع ہوا، وہ حسب ذیل ہے :۔

"۶ر دسمبر کو اجودھیا میں قدیم تاریخی بابری مسجد کے انہدام اور باوجود اس کی حفاظت کے وعدوں کے اس کو صاف کر دینے کا جو واقعہ پیش آیا اس نے پورے ہندوستان کو ایک کلنک کا ٹیکا لگا دیا اور اس کی سیکڑوں برس کی رواداری، مذہبی آزادی اور صلح پسندی کی روایات کو خاک میں ملا دیا، ملک کی آزادی کے لئے جدّوجہد کرنے والوں اور قربانی دینے والوں کی

محنتوں پر پانی پھیر دیا اور عالمی اور بین الاقوامی سطح پر ہندوستان کو ذلیل کیا۔

اس کی ذمّہ داری سب سے پہلے ان فرقہ پرست جماعتوں پر ہے، جنھوں نے پورے ملک میں کارسیوا کے نام پر ایک ادھادھند اندھا مذہبی جوش پیدا کر دیا، پھر اتر پردیش کی اس حکومت پر ہے جو اسی وعدہ اور بنیاد پر قائم ہوئی تھی اور جس نے باوجود مسجد کی حفاظت کے بار بار کے وعدوں اور عدالت کے فیصلہ کے احترام کے اپنا فرض پورا نہیں کیا اور وہ اس پورے ڈرامہ میں تماشائی بنی کھڑی رہی بلکہ ایک طرح سے اس نے اس کارروائی کی حوصلہ افزائی کی، ورنہ چند گھنٹوں میں اس سہولت اور آزادی کے ساتھ یہ کام نہیں ہو سکتا تھا۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مرکزی حکومت پر بھی اس کی ذمّہ داری عائد ہوتی ہے اور حقیقت پسند اور واقف کار حلقوں کو اس سے بھی شکایت کرنے کا حق ہے کہ اس نے مرکزی فورس اور پولیس کی موجودگی میں (جو دور سے تماشائی بنی کھڑی تھی) کوئی مداخلت نہیں کی اور اپنے بار بار اعلانات کے باوجود اس نے مسجد کو بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

اب کلنک کے اس ٹیکے اور ہندوستان کے چہرہ کو جو داغ لگا ہے اس کو مٹانے اور دھونے کے لئے بہت کچھ کرنا ہوگا، اور یہ ملک سے وفاداری، حُبّ الوطنی اور حقیقت پسندی کا تقاضا ہے، مسجد کی

از سر نو تعمیر کے علاوہ جس کا مرکزی حکومت نے وعدہ کیا ہے، فرقہ پرست اور ملک دشمن جماعتوں پر پابندی لگانے اور ان کا احتساب کرنے اور ان کی سرگرمیوں کو مفلوج کرنے کے علاوہ ملک میں اتحاد، باہمی اعتماد، مذہبی فرائض و رسوم اور عبادت گاہوں، علمی مرکزوں کی حفاظت اور احترامِ انسانیت اور حب الوطنی کی ایک جرأت مندانہ، حقیقت پسندانہ لیکن ہمہ گیر اور طوفانی تحریک چلانے کی ضرورت ہوگی، عوامی اور حلقہ وار جلسے کرنے ہوں گے، اور شائع ہونے والے لٹریچر اور پریس پر بھی نگاہ رکھنی ہوگی اور اس کو بھی اس مقصد کے لئے آلۂ کار اور ترجمان بنانا ہوگا، ملک کو اس واقعہ سے اندرونی اور بیرونی طور سے جو نقصان پہنچ گیا ہے اس کو دور کرنے کے لئے سخت جدّ و جہد کرنا ہوگی، اور اس سلسلہ میں ہر طرح کے سیاسی مفادات، جماعتی تقاضوں اور طاقت اور اقتدار میں آنے اور عوام کے استحصال کی سطح سے بلند ہو کر پورے خلوص، سچی حب الوطنی اور انسان دوستی سے کام لینا ہوگا، ورنہ یہ ملک سخت خطرہ میں ہے اور اس کو اس خطرہ سے نکالنے اور بچانے کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں۔"

مرکز کا ایک ذیلی اقدام اور B.J.P. کی چار حکومتوں کی برطرفی

مرکز نے چاروں طرف سے زور پڑنے کے بعد اور اپنی بدنامی کے خیال سے ایک کام تو یہ کیا کہ چار ریاستوں (اُتر پردیش، مدھیہ پردیش، راجستھان اور ہماچل پردیش) کی حکومتوں کو برطرف کر کے گورنر راج قائم کر دیا، دوسرے اس نے ۱۰ دسمبر ۱۹۹۲ء

کو چند کھلی ہوئی فرقہ پرست جماعتوں (R. S. S.) وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل، اور اسلامک سیوک سنگھ) کو خلاف قانون قرار دیا، اپنے نزدیک توازن قائم کرنے کے لئے جماعتِ اسلامی کو بھی ان کے ساتھ خلافِ قانون قرار دیا، راقم نے اس کے خلاف ایک بیان اخبارات میں اشاعت کے لئے بھیج دیا جو درج ذیل ہے :۔

"ہندوستان کے ممتاز عالمِ دین اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب نے ان جماعتوں میں جو وزیر اعظم ہند نرسمہا راؤ جی کے اعلان کے ذریعہ ممنوع و خلاف قانون قرار دی گئی ہیں، جماعت اسلامی ہند کی شمولیت پر اپنے استعجاب کا اظہار کیا ہے، اس لئے کہ یہ جماعت ایک اصلاحی و تربیتی اور دینی و فکری جماعت ہے، اور اس کا علمی، جارحانہ، اور فرقہ وارانہ سیاست سے تعلق نہیں، ان ممنوعہ فرقہ وارانہ جماعتوں میں جماعتِ اسلامی کی شمولیت پر بیرونی دنیا اور مسلم و عرب ممالک میں تعجب و ناپسندیدگی کا اظہار کیا جائے گا، اس لئے کہ ان ممالک کے علمی و دینی حلقوں میں یہ جماعت اسی حیثیت سے جانی اور پہچانی جاتی ہے کہ وہ ایک اصلاحی و فکری جماعت ہے۔"

راقم نے اپنی ایک گفتگو میں کہا کہ یہ محض "ضرورتِ شعری" کی بنا پر کیا گیا ہے کہ بعض مصرعے اس وقت تک موزوں نہیں ہوتے جب تک کوئی زائد حرف بڑھا نہیں دیا جاتا۔

بمبئی، سورت، مہاراشٹر کے ہولناک فسادات اور ہوش رُبا جانی و مالی نقصانات

اجودھیا کے واقعہ اور بابری مسجد کے انہدام کے بعد بمبئی، سورت خاص طور پر

اور مہاراشٹرا اور گجرات کے مختلف مقامات پر فرقہ وارانہ فساد کا ایک سیلاب آگیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ پورا علاقہ مہیب زلزلہ یا خوفناک آتشزنی کی زد میں آگیا ہے، تفصیل کے ساتھ اس کی روئیداد سنانا یا اس کی تصویر کشی، ایک ایسی تصنیف کے حدود سے خارج ہے جس کا رقبہ محدود اور دائرہ زندگی کے اہم واقعات، تجربات، تأثرات اور مشاہدات پر محیط ہے، اس کے لئے ماہ جنوری میں نکلنے والے انگریزی، اردو اور ہندی کے معتبر اخبارات کے پرچے اور اُن کے فائل دیکھنے ہوں گے، یہاں پر ان اخبارات کے ان تراشوں سے جو مصنّفِ کتاب کے پاس محفوظ رہ گئے ہیں اور اس کے ریکارڈ میں ہیں چند سرخیوں کے نقل کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے، ان سے ان فسادات کی ہولناکی، وسعت وعمومیت اور جنون کی اس کیفیت کا اندازہ ہوسکتا ہے، جو ان میں کارفرما تھی:۔

"بمبئی اور احمد آباد میں مسلمانوں کا چھپّن ۵۶ ارب کا نقصان" "سڑکوں پر ہنوز لاشیں"، "گجرات میں فساد سے ایک کھرب کا نقصان"، "سیکوریٹی فورسوں کی تعیناتی کے باوجود بمبئی میں فسادات کی لہر جاری"، "لاتعداد دکانیں، عمارتیں نذر آتش"، "اربوں روپے کے مالی نقصانات"، "بمبئی کا وسیع المشرب کلچر ڈھانچہ منتشر ہوگیا"، "تین سو ۳۰۰ سالہ تاریخی شہر کا بدترین قتل عام"، "بمبئی میں مسلم کش فسادات کا دوسرا دور"، "حکومت کا یوں مفلوج ہوجانا افسوسناک" "مسلسل وحشیانہ تشدّد روکنے کے حتمی فیصلہ کے عمل میں تأمّل ملک کی بقا کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے"،

"ممتاز اہلِ علم اور حقوقِ انسانی کارکنوں کا حکومت پر زور"، "بمبئی جلتا رہا اور بال ٹھاکرے آگ پر تیل ڈالتے رہے"، "وحشیانہ فرقہ وارانہ تشدّد کی لرزہ خیز داستان"، "ایک ہی رات میں پچاس ہزار افراد پناہ گزیں بنے"، "بمبئی میں ہزاروں لوگ ریلوے اسٹیشن پر پھنسے ہیں"، "مزدور بقایاجات لئے بغیر فرار ہوگئے"، "بمبئی سے پناہ گزینوں کی ٹرینیں لکھنؤ پہنچیں" "سب کی ایک کہانی"، "سب لُٹ گیا"، "جل گیا"، "احمد آباد میں پولیس فائرنگ سے مرنے والوں کی تعداد ساٹھ ہوگئی"[1]

بمبئی کے علاوہ سورت میں وحشیانہ اور غیر شریفانہ کارروائیوں کی اطلاع ملی، اخباری رپورٹ کے مطابق لوٹنے، جلانے، بے دردانہ قتل کرنے اور عورتوں کی آبروریزی کرنے کی مکمل چھوٹ دے دی گئی، ملّی کونسل کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "مسلمان ایسے ظلم کا نشانہ بنے جن کے آگے ہلاکو اور چنگیز کے مظالم حقیر معلوم ہوتے ہیں" اس میں کہا گیا ہے کہ "بعض ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پولیس فائرنگ میں زخمی ہونے والے مسلمانوں کی تعداد سترہ سو سے زائد ہے، اور دوسرے طبقات کے افراد کی تعداد پانچسو کے لگ بھگ ہے" اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ گجرات کے شہر سورت میں عورتوں اور کم عمر بچوں کے ساتھ جو حیاسوز سلوک کیا گیا ہے، اس پر ہمارے ملک کا سر شرم سے جھک جانا چاہئے، بعض علاقے ایسے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فساد نہیں ہوا ہے بلکہ جنگ میں بھاری ٹینکوں کے ذریعہ بستی کو

[1] یہ سرخیاں اکثر ذمہ دار اور قومی پریس کے اخبارات "قومی آواز" وغیرہ سے لی گئی ہیں۔

اجاڑ دیا گیا ہے، مہاراشٹر اور گجرات کے علاوہ کانپور اور بعض دوسرے شہروں میں بھی خونریزی اور سفاکانہ حملوں کے واقعات پیش آئے، اس سے شہری امن وامان کے علاوہ معیشت واقتصادیات اور تجارتی کاروبار پر جو اثر پڑا ہوگا اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

ملک کے اٹھتے ہوئے طوفان کے خلاف عمومی جلسے اور راقم کے خطابات

راقم سطور نے ملک کی اس صورتِ حال کے پیش نظر ایک طرف تو یہ ضروری سمجھا کہ ہندو مذہب کے پیشواؤں اور صاف ذہن کے سیاسی رہنماؤں کو اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے اور اس کو تبدیل کرنے کی کوشش کے لئے میدان میں لایا جائے، اس کے لئے اس نے اپنے مخلص دوست، داعی الی اللہ اور ترجمانِ قرآن مولانا عبدالکریم صاحب پاریکھ کو دعوت اور زحمت دی اور ان سے جو کچھ ہو سکا وہ انھوں نے کیا، مگر افسوس ہے کہ اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی اور اس کی وجہ ان افراد کی کمی ہے، جن کے دل پر اس کی پوری چوٹ لگی ہو اور وہ بے تاب ہو کر میدان میں نکل آئیں۔

دوسری طرف اس نے ایسے پبلک جلسوں کے انعقاد کی کوشش کی اور ان میں پوری صفائی اور جرأت کے ساتھ خطرہ کی گھنٹی بجانے اور قلب وضمیر پر چوٹ لگانے کی کوشش کی، اس سلسلہ میں وہ اپنی دو تقریروں کو پیش کر رہا ہے، جن میں صورتِ حال کی پوری عکاسی اور سیکڑوں ہزاروں دلوں کی ترجمانی ہے۔

ایک وہ تقریر جو ۶؍ جنوری ۱۹۹۳ء کو قیصر باغ لکھنؤ کی بارہ دری میں ایک مخلوط مجمع عظیم کے سامنے کی گئی، یہ تقریر "ملک و معاشرہ کا سب سے خطرناک مرض

ظلم وسفّاکی" کے عنوان سے شائع ہوئی، دوسری تقریر جو ۸ فروری ۱۹۹۳ء کو شہر رائے بریلی میں گورنمنٹ کالج کے وسیع میدان کے ایک عظیم جلسہ میں کی گئی، جس میں ۱۰-۱۵ ہزار حاضرین کا اندازہ کیا گیا، جو مختلف مذاہب اور حلقوں سے تعلق رکھتے تھے۔

یہاں دونوں تقریریں اس خیال سے بجنسہٖ پیش کی جارہی ہیں کہ وقتی رسائل کا کوئی بھروسا نہیں، یہ تقریریں جو حقیقت کی ترجمانی اور فضا کی عکّاسی کرتی ہیں، کتاب میں آجانے کی وجہ سے تاریخ میں محفوظ رہ جائیں گی:-

ملک و معاشرہ کا سب سے خطرناک مرض ظلم و سفّاکی

حضرات! ہم اس وقت لکھنؤ شہر میں ہیں، میں اپنی تقریر کا آغاز اسی لکھنؤ شہر کے ایک معروف شاعر امیر مینائی کے شعر سے کروں گا، ادب کے بہت سے طالب علم شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنے والے اور تاریخ کا علم اور اس کا ذوق رکھنے والے حضرات ان کے نام سے واقف ہوں گے وہ کہتے ہیں ؎

امیرؔ جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

اور اسی کے ساتھ میں اس برّصغیر (SUB-CONTINENT) کے قابلِ فخر اور مشہور ترین شاعر و ادیب اور فلسفی و مفکر علّامہ اقبالؔ کا بھی شعر پڑھوں گا وہ کہتے ہیں ؎

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

مطلب یہ ہے کہ آپ جاگ جائیں اس لئے میرے دل سے ایک آہ، ایک کراہ نکلی ہے، ورنہ عشق تو ایسا کام ہے کہ جو آہ و فغاں اور اظہارِ درد کے بغیر بھی کیا جاتا ہے اور کیا جاتا رہا ہے۔

حضرات! میں بہت معذرت کے ساتھ اتنا عرض کردوں کہ میں لکھنے پڑھنے والا آدمی ہوں، لیکن میری توجہ اور میری دلچسپی کا مرکز دو موضوع (SUBJECT) ہیں، ایک مذاہب اور اس میں بھی تقابلی مطالعہ (COMPARATIVE STUDY) اور ایک تاریخ، اور تاریخ صرف ایک حصہ کی نہیں بلکہ تاریخ عالم (UNIVERSAL HISTORY) میں نے عربی، فارسی، اردو اور انگریزی میں اس کا بڑا ذخیرہ دیکھا اور پڑھا ہے، اسی مطالعہ کے نتیجہ میں میں اس حقیقت تک پہونچا ہوں کہ دنیا کے مذاہب میں سب سے زیادہ اگر کسی چیز پر اتفاق ہے تو وہ یہ کہ ظلم بُری چیز ہے، اور ظلم اس دنیا کو پیدا کرنے والے کو پسند نہیں ہے، اور جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے، وہ بتاتی ہے کہ ظلم سے بعض اوقات بڑی بڑی سلطنتوں کے چراغ گُل ہو گئے ہیں، اور معاشرہ پر بادِ خزاں چل گئی ہے، ان پر مکمّل زوال آگیا ہے اور سارے علمی و ادبی کارنامے اور ذخیرے خاک میں مل گئے ہیں۔

تاریخ میں ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ بعض اوقات کسی ایک مظلوم مرد کی آہ، اور کسی ایک مصیبت زدہ خاتون کی کراہ سے پورے دور کا خاتمہ ہو گیا ہے، جو بات سب سے زیادہ ملکوں کی خیر خواہی، سچی ہمدردی، حقیقت پسندی، انسانیت کے فرض کی ادائیگی بلکہ اس کے احساس کی ہے، (خواہ اس ملک میں کتنی ترقیاں ہوں اور اس ملک کی تاریخ خواہ کیسی رہی ہو اور اس میں کتنے وسائل و ذخائر ہوں) یہ ہے کہ ظلم نہ ہونے پائے، کسی کمزور آدمی کو روندا نہ جائے، کسی گھر کا چراغ بجھایا نہ جائے، کسی بے زبان عورت پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے، اور کسی مظلوم کی بددُعا نہ لی جائے۔

میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس بارہ دری کی (ہندوستان کو چھوڑیئے لکھنؤ شہر کے مقابلہ میں) کیا حقیقت ہے؟ لیکن اگر کچھ لوگ آ کر اس بارہ دری میں توڑ پھوڑ شروع کر دیں، کرسیاں پٹخنا شروع کر دیں، اور لوگوں پر حملہ آور ہو جائیں، اور یہ جو آپ آرائش کا سامان دیکھ رہے ہیں، اس کو برباد کرنا شروع کر دیں، تو اس کا ٹرسٹی، اس کا محافظ، اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا اسٹاف، برداشت نہیں کر سکتا، آپ کمہار کی دوکان پر جا کر دیکھئے (میں آسانی سے یہ مشورہ نہیں دوں گا، مجھے آپ سے ہمدردی ہے) لیکن میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ کمہار کی دوکان پر تجربہ کیجئے، ایک کمہار کی کیا حقیقت ہے، اس کے مٹی کے برتنوں کی کیا حیثیت ہے؟ دو پیسے کی چیز ہے! لیکن آپ کمہار کی دوکان پر جا کر اس کے گھڑے توڑنے لگیں، اس کے بدھنے توڑنے لگیں، اس کے برتن پھوڑنے لگیں تو وہ آپ کو آسانی سے جانے نہیں دے گا، وہ آپ کو روکے گا، اپنے برتنوں کو بچانے کی کوشش کرے گا، اور آپ پر حملہ آور ہو جائے گا، اسی طرح آپ کسی اور دوکان پر چلے جایئے اور اس دوکان کو لوٹنے لگئے، اس کا سامان اٹھا کر لے جانے لگئے، توڑ پھوڑ شروع کر دیجئے اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے لگئے تو وہ برداشت نہیں کر سکتا، اگر وہاں زندگی کے آثار ہیں اور واقعی وہ کوئی مہذب جگہ ہے، پڑھے لکھے لوگ وہاں رہتے ہیں تو پورا محلہ آ کر کھڑا ہو جائے گا، گھر کے لوگ باہر آ جائیں گے، پڑھنا لکھنا چھوڑ دیں گے اور آپ کا ہاتھ پکڑ لیں گے کہ اس غریب دوکاندار کا کیا قصور ہے کہ آپ اس کی دوکان اور اس کے سامان کو توڑ پھوڑ رہے ہیں، اور جلا رہے ہیں؟ یہاں قریب ہی ایک لائبریری[1] ہے، مجھے وہاں کے ایک ایک صفحہ کی قدر ہے، میری بہت سی تحریریں اور کاوشیں اس کی رہین منت ہیں، لیکن میں کہتا ہوں اور دل پر

---

[1] امیر الدولہ لائبریری واقع قیصر باغ کی طرف اشارہ ہے۔

ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں کہ وہاں جا کر کوئی کتابیں پھاڑنے لگے، کیا حقیقت ہے کتاب کی، انسان کی لکھی ہوئی کتاب ہے، دوبارہ لکھی جاسکتی ہے، دوبارہ چھپ سکتی ہے اور کئی بار چھپ سکتی ہے تو آپ کو اس ذخیرہ یا اس کے کسی حصہ کو تلف اور برباد کرنے کی کوئی اجازت نہیں دے گا۔

پس کیا آدمی ہی رہ گئے ہیں، ہمارے بھائی بندہی رہ گئے ہیں، نسل انسانی کے افراد ہی رہ گئے ہیں جن سے ہمارا ملک آباد ہے، جن سے یہاں کی رونق قائم ہے، جن کی وجہ سے ہمارا ملک ملک کہلاتا ہے جنگل نہیں کہلاتا، یہاں کوئی شکار کھیلنے نہیں آتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ لکھنؤ ہے، تہذیب کا مرکز ہے، یہ اجودھیا ہے، یہ دہلی ہے تاریخی شہر ہے اور ملک کا دارالسلطنت ہے، بمبئی ہے، احمد آباد اور سورت ہے، کہاں تک شہروں کے نام لوں، کوئی آپ کو اجازت نہیں دے گا کہ آپ مٹی کے سامان کو، شیشے کے سامان کو اور ٹین کے سامان کو بھی برباد کرنے لگیں تو کیسے یہ خیال آسکتا ہے کہ آدمی جسے اس دنیا کے پیدا کرنے والے نے کس محبت سے، اپنی قدرت و صنعت اور اپنی رحمت سے انسان بنایا، وہ انسان شکار بن جائے اور کس کا شکار بن جائے؟ خود انسانی ہاتھوں کا شکار بن جائے اور اس کا اس طرح شکار کیا جائے جس طرح شکاری، جانوروں کا شکار کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ سارے مذہب اگر کسی بات پر متفق ہیں تو اس پر کہ ظلم بہت بُری چیز ہے، اور ظلم خالقِ کائنات کو ناراض کرنے والی چیز ہے، اور اس کی طرف سے ظلم کرنے والوں پر ایسی ایسی سزائیں، آفتیں اور مصیبتیں آتی ہیں جن کا پہلے سے تصوّر و تعیّن بھی نہیں کیا جاسکتا، اور ان کے تصوّر ہی سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، میں کہنا نہیں چاہتا، اسی ملک کا رہنے والا ہوں، میری زندگی بھی اسی ملک سے وابستہ ہے مگر

کہتا ہوں کہ ظلم کرنے والوں پر خدا کی طرف سے آفتیں آتی ہیں، زلزلے آتے ہیں، بجلیاں گرتی ہیں، گرانی بڑھتی ہے، قحط سالی آتی ہے، چیزیں نایاب ہو جاتی ہیں، بیماریاں بھی عام ہو جاتی ہیں، اور آگے مجھ سے نہ کہلوایئے۔

میں کہہ رہا ہوں کہ سب سے زیادہ ڈرنے والی چیز جو ہے وہ ظلم ہے، دنیا کے سارے مذاہب، سارے کلچر، سارے رفارمرس، سارے صوفی سنت اس بات پر متفق ہیں کہ انسان سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے، اور ہر مذہب کا انسان، ہر شہر کا انسان، ہر ملک کا انسان، ہر برادری کا انسان، ہر نسل کا انسان، ہر طبقہ کا انسان، ہر سوسائٹی کا انسان، ہر قابلیت کا انسان، ہر صلاحیت کا انسان، مفید ہو یا غیر مفید، وہ خدا کی صنعت ہے اور خدا کی رحمت کا مظہر ہے، ہم اس کو (MASTERPIECE) نہیں کہہ سکتے ورنہ اس سے بڑھ کر (MASTERPIECE) اور کیا ہو سکتا ہے؟

اب میں آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ آدمی بیمار ہو جاتا ہے، اس پر اعصابی اور جنون کا دورہ پڑ جاتا ہے، اور یہ دورہ فرد (INDIVIDUAL) پر بھی پڑتا ہے، سوسائٹی پر بھی پڑتا ہے، اور پوری قوم (NATION) پر بھی پڑ سکتا اور پڑتا ہے، اور تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ مرض کا یہ دورہ، جنون (پاگل پن) کا یہ دورہ، ظلم و سفاکی کا یہ دورہ، انسان کی تحقیر و تذلیل کا یہ دورہ، صرف افراد ہی پر نہیں بلکہ پورے پورے معاشرہ، پوری پوری سوسائٹی، پورے پورے ملک اور پورے پورے عہد پر پڑا ہے، اور یہ دورہ پڑنا کوئی انوکھی اور تعجب خیز بات نہیں ہے، لیکن جو چیز ڈرنے کی ہے، اور خطرناک بھی ہے وہ یہ کہ اس دورہ کو دور کرنے والے اور اس بیماری کا علاج کرنے والے لوگ نہ ہوں، ہم نے انسانی تہذیب اور نسل انسانی پر ایسے بڑے بڑے دورے پڑتے ہوئے دیکھے ہیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ اب یہ تہذیب زندہ

نہ رہ سکے گی، اور یہ نسل اب آگے نہ چل سکے گی لیکن ہمت والے لوگ سامنے آگئے اور انھوں نے واقعات کا رخ بدل دیا، اس کی مثالیں میں آپ کو اپنے تاریخ کے مطالعہ کی روشنی میں ایک نہیں دس دے سکتا ہوں لیکن اس موقع پر میں صرف دو مثالیں دوں گا۔

ایک تو جب چین کی سرحد سے ترکستان کے تاتاری اٹھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب نسل انسانی سب کچھ کھو دے گی، اور اب کچھ بھی باقی نہ رہے گا، معلوم ہوتا تھا کہ اب دنیا کو اپنا تہذیبی سفر دوبارہ شروع کرنا پڑے گا کیونکہ سب کچھ برباد ہو جائے گا، نہ کتب خانے رہیں گے، نہ مدرسے رہیں گے، نہ دانشور رہیں گے، نہ پڑھے لکھے انسان رہیں گے، اور حد یہ بھی کہ وہ اٹھے تھے ترکستان سے لیکن یورپ میں لوگ ان سے ڈرتے تھے، یہاں چند تاریخی شہادتیں پیش کی جاتی ہیں، جو یورپ کے مستند و مشہور مؤرخوں کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

گبن (GIBBON) اپنی مشہور کتاب "تاریخ انحطاط و سقوط روما" (THE DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE) میں لکھتا ہے :۔

"سویڈن کے باشندوں نے روس کے ذریعہ تاتاری طوفان کی خبر سنی، ان پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ وہ ان کے خوف سے اپنے معمول کے مطابق انگلستانی سواحل پر شکار کھیلنے کے لئے نہیں نکلے۔"[1]

ایچ جی ولز (H. G. WELLS) کا قول ہے کہ :۔

"اگر کوئی سیاسی پیشین گو ساتویں صدی کے آغاز میں دنیا کا جائزہ لیتا تو اس نتیجہ پر پہنچتا کہ صرف چند صدیوں کی بات ہے کہ پورا یورپ اور ایشیا منگولوں کے زیر اقتدار آجائے گا۔"[2]

---

[1] (Vol. VII, p. 16, 3rd. Ed., LONDON, 1909)
[2] (A SHORT HISTORY OF THE WORLD, 1924, p. 140)

ہیرالڈلیمب (HAROLD LAMB) لکھتا ہے :-

"چنگیز خاں کی جہاں آشوبی و غارت گری نے تمدّن کو ایسا سخت صدمہ پہنچایا کہ نصف دنیا میں تہذیب و شائستگی کو مرکز از سرِ نو جنم لینا پڑا، خوارزم کی سلطنت، بغداد کی خلافت، روس کی مملکت اور کچھ دنوں کے لئے پولینڈ (پولار) کی حکومتیں مٹ گئیں"[1]

لیکن کیا ہوا کچھ صوفیاء (سَنت لوگ) کچھ اہلِ دل اٹھے، انھوں نے کوشش کی، ان سے ملے، خدا کی یاد دلائی، اس کے غضب سے ڈرایا ان کو انسان پر ترس کھانے کی تلقین کی، اور اپنے اخلاق سے، اپنی روحانیت سے، اپنی بے غرضی اور خلوص سے، اپنی ہمدردی نوعِ انسانی سے ان کے دلوں کو موہ لیا، ان کے دلوں کو بالکل ایسا نرم بنا لیا کہ وہ بالکل موم ہو گئے جس کے اتنے قصے ہیں کہ بیان نہیں کئے جا سکتے، ان صوفیوں اور درویشوں کا دولت سے بے پرواہ ہونے اور ان کے خلوص کی حد یہ ہے کہ چند بزرگوں کے علاوہ ان میں سے اکثر کے نام بھی تاریخ میں نہیں ملتے، انھوں نے اپنے نام بھی چھپائے، انھوں نے پوری تاتاری نسل کو آدمی بنا دیا، ایسا آدمی بنایا کہ ان میں مصنّف بھی پیدا ہوئے ان میں بڑے بڑے قانون داں پیدا ہوئے بڑے بڑے بانیانِ سلطنت پیدا ہوئے انھوں نے انسانی تہذیب کی حفاظت کی اور صدیوں تک دنیا کی رہنمائی کرنے کے قابل ہوئے۔

تو میرے بھائیو! کسی ملک پر، کسی فرقہ پر، اور مجھے معاف کیجئے میں صاف کہوں گا کہ کسی کمیونٹی (COMMUNITY) پر، کسی مکتبِ خیال (SCHOOL OF THOUGHT) پر، کسی سوسائٹی پر، کسی کنٹری اور سولیزیشن (CIVILIZATION) پر یہاں تک کہ کسی ایج (AGE)

---

[1] (GENGHIS KHAN, LONDON, p. 206, LONDON 1928)

پر پورے پورے ایج (AGE) پر اس دورہ کا پڑ جانا، اس کا بیمار ہو جانا اور جنون کا شکار ہو جانا کوئی بعید بات نہیں ہے یہ بار بار ہوا ہے۔

لیکن اصل ڈرنے کی بات یہ ہے کہ اس دورے کو دور کرنے اور آدمی کو پھر آدمیت کے حدود میں لانے اور آدمی کو آدمی بنانے، اور آدمی کو ظلم سے خونریزی سے ڈرانے اور آدمی کی آدمی سے دل میں محبت پیدا کرنے اور اپنے ملک کی سچی خیر خواہی اور سچی حُبُّ الوطنی سچا نیشنلزم اور اپنے ملک کی محبت پیدا کرنے کی تعلیم دینے کے لئے کوئی پارٹی اور کوئی جماعت کھڑی نہ ہو، یہ چیز ڈرنے کی ہے، ایک آدمی جو فلسفۂ تاریخ پر نظر رکھتا ہے، اور جس کی مذاہب کی تعلیمات پر بھی نظر ہے جس نے آسمانی کتابیں پڑھی ہیں، جس نے روحانی شخصیات کے ملفوظات اور زبان سے نکلے ہوئے الفاظ پڑھے ہیں وہ جانتا ہے کہ یہ دورے تو پڑتے رہتے ہیں، دولت پرستی کا دورہ پڑ گیا، خواہشاتِ نفس کی پرستش کا دورہ پڑ گیا، اور آدمی سے بیزار ہونے اور آدمی کی صورت دیکھنے کا روادار نہ ہونے، اور ظلم سے لطف اٹھانے (ENJOY) کرنے کی بیماری پیدا ہو جائے، جن کو جائز تفریحات اور فطری لذّتوں میں وہ مزہ نہیں آتا اور کسی دلکش گیت اور عمدہ نغمہ سننے میں مزہ نہیں آتا جو آدمی کو مارنے میں مزہ آتا ہے، یہ ایک بیماری ہے، انسانیت کی آخری حد تک گراوٹ ہے، اور آخری درجہ کی ذلّت ہے، لیکن انسان اس کا شکار ہوتا ہے، اور ہوا ہے، اور اگر کہدوں کہ ہزاروں بار شکار ہوا ہے تو غلط نہیں ہوگا، پوری پوری تاریخیں لکھی گئیں ہیں، ایک قوم کے ظلم پر، ایک سلطنت کے دوسری سلطنت کو غلام بنانے پر، اور ظلم کے کئی کئی طریقے نکالنے پر، اور انسان کُشی اور انسان سوزی کے واقعات پر، یہ سب تاریخ کی نذر ہو گیا، تاریخ کے سوا ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا، صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ چیز دور نہیں ہو سکتی یہ قہر خداوندی ہے،

جس رقبہ کی چیز تھی، اس کی جو حدیں تھیں، اس میں جو انسانی برادری آباد تھی، اب پنپ نہیں سکے گی، یہ اب سر اٹھا کر عزّت سے چل نہیں سکے گی، اس کے بچے پڑھ نہیں سکیں گے، اس کی خواتین اور عورتیں عزّت کے ساتھ رہ نہیں سکیں گی۔

لیکن اچانک ہوا کا رُخ بدلا اور بہار کا ایسا جھونکا آیا، روحانیت کا ایک ایسا جھونکا آیا اور قربانی دینے کا ایسا جذبہ پیدا ہوا کہ لوگوں نے اپنی جانوں کی پرواہ نہیں کی، اپنی عزّتوں کی پرواہ نہیں کی، عُہدے تو عُہدے کیا ہیں، اپنی صحت کی، اپنی زندگی کی پرواہ نہیں کی، خوف کا بادل چھٹ گیا، وہ کہُر دور ہو گیا، وہ انسان جو بالکل عقل کھو بیٹھا تھا، حواس باختہ ہو چکا تھا، اور اس کے منھ کو خون لگ گیا تھا، اس کو کھانے میں وہ مزہ نہیں آتا تھا جو انسان کا خون بہانے میں مزہ آتا تھا وہ انسان اور انسانیت کا محافظ بن گیا، جو رہزن اور حملہ آور تھا وہ پاسبان اور چوکیدار بن گیا، جو قاتل تھا وہ معالج اور تیماردار بن گیا۔

ایک ایسا دَور بھی گزرتا ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش نہیں ہو پاتے اور آج بھی کہیں کہیں ایسا ہو رہا ہے کہ لوگ اپنے بچوں، پوتوں اور نواسوں کو دیکھ کر خوش نہیں ہوتے، بچے ہنستے ہوئے آتے ہیں کہ دیکھ کر پیار آجائے مگر پیار کے بجائے آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں کہ کل نہیں معلوم کہ ان کا کیا حشر ہوگا، کب ہسٹریا کا دورہ پڑجائے اور ان بچوں کو ان کے ماں باپ کے سامنے چیر پھاڑ کر رکھ دیا جائے، ہزار افسوس اور شرم ایسی زندگی پر کہ آدمی اپنے جگر کے ٹکڑوں کو آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کی راحت کو اور ہنستے مسکراتے بچوں، نواسوں، پوتوں اور پوتیوں اور پردہ نشین خواتین کو جن پر کسی کا سایہ نہیں پڑا جن پر آج تک کسی کی نگاہ نہیں پڑی ان کو دیکھ کر یہ خطرہ محسوس کرے کہ معلوم نہیں کب جنون کا ایک دورہ آئے، دیوانگی کا ایک اُبال آئے اور اس کے بعد نہ شریف عورت رہے نہ معصوم بچہ

معصوم بچہ رہے، نہ یتیم کو یتیم سمجھا جائے، نہ بے کس پر رحم کیا جائے، نہ بیوہ پر ترس کھایا جائے، یہ ایک بیماری ہے، اور انسانی فطرت کے بالکل خلاف ہے، خدا کے پیدا کرنے کے منشا کے خلاف ہے، اور خدا کے پیغمبروں، رسولوں اور ریفارمرس کی تعلیمات کے خلاف ہے، لیکن یہ ہوتا ہے، اور جو چیز ہوتی ہے اس کا ذکر بھی کرنا پڑتا ہے، دل پر پتھر رکھ کر ذکر کیجیے، آنکھوں پر پٹی باندھ کر ذکر کیجیے، رو کر کہیے، چیخیں مار کر کہیے، کراہوں کے ساتھ کہیے، آہوں کے ساتھ کہیے، لیکن اس کو کہنا پڑتا ہے، اور کہنا ہی نہیں پڑتا، لکھنے پڑھنے والا آدمی ہوں لکھنا بھی پڑتا ہے، تاریخ میں ایسے واقعات درج ہوتے ہیں، اور آنے والی نسل انھیں دیکھتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ کون لوگ تھے؟ کس نسل کے لوگ تھے؟ کس علاقہ کے لوگ تھے؟ ان کو کیا ہو گیا تھا؟ ان کو یہ دیوانگی کا دورہ کیسا پڑا تھا؟ اور ان کی انسانیت کہاں چلی گئی تھی؟ اور کیا دل نکال کر انھوں نے پھینک دیا تھا؟ کیا آنکھیں انھوں نے پھوڑ لی تھیں؟ کیا ان کو کسی کے دکھ سے تکلیف نہیں ہوتی تھی؟ کیا انسان کے رستے ہوئے خون کو دیکھ کر ان کے آنسو نہیں نکلتے تھے؟ جہاں خون بہا ہے وہاں کم سے کم آنسو تو بہنے چاہئے تھے، آنسو بہنے میں کیا لگتا ہے، آنسو بہتے ہیں، کیا جاتا ہے، لیکن نہیں وہ ایسے سنگدل تھے کہ انسان کے جسم سے خون بہتے ہوئے دیکھتے رہے، اور ان کی آنکھ سے ایک آنسو نہیں ٹپکا، کیونکہ وہ انسان کو جانچتے تھے، مذہب سے، اور مذہب ہی نہیں انسان کو جانچتے تھے، تاریخی روایات سے، انسان کو جانچتے تھے، افسانوں سے اور کہانیوں سے، انسان کو جانچتے تھے، لوگوں کی افسانہ طرازیوں سے جس پر سیکڑوں برس نہیں ہزاروں برس گزر گئے، لیکن وہ ان کے نزدیک ایک زندہ چیز تھی، اور وہ خدا جو حیّ وقیّوم ہے، وہ ان کے نزدیک زندہ نہیں ہے؟ وہ انسانیت جو دنیا میں پنپ رہی ہے، پھل پھول رہی ہے، گل کھلا رہی ہے، شاہکار

بنا رہی ہے، کتابوں کے ڈھیر لگا رہی ہے، کتب خانے بھر رہی ہے، اور اب بھی اس کے اندر ذہانت کا خزانہ ہے، اب بھی اس کے اندر محبت کا خزانہ ہے، اب بھی اس کے اندر گُل کا کھلانا ہے، یہ انسان جس سے دنیا کی بہار ہے، اگر انسان نہ ہو تو دنیا کی کیا قیمت ہے، انسان ہی سے اس کی بہار ہے، انسان ہی سے اس کی رونق قائم ہے، انسان ہی سے اس کی چمک دمک برقرار ہے، چلے جائیے، آپ قبرستان میں کیا آپ کا دل وہاں لگے گا، چلے جائیے عجائب گھروں میں کیا وہاں رہنے کو دل چاہے گا، کیسے کیسے جانور ہیں کیسی کیسی شاہکار اور صنعت کی چیزیں ہیں لیکن وہاں آپ ٹھہر نہیں سکتے، دیکھیں گے اور چلے آئیں گے لیکن انسان کی بستی سے انسان نہیں گھبراتا، جنگل سے گزرتا ہے تو ڈرتا ہوا، خدا سے دعا کرتا ہوا کہ خیریت سے گزر جائے اور انسانوں کے پاس صحیح سالم پہنچ جائے، اگر انسان کو انسان سے محبت نہ ہو، انسان کو انسان کے دُکھ درد کا احساس نہ ہو، انسان انسان پر ترس نہ کھائے، انسان انسان سے ہمدردی نہ کرے تو وہ انسان نہیں بھیڑیا ہے، اور کون ہے جو بھیڑیے کی تعریف کرتا ہے، اور کون ہے جو بھیڑیے سے نفرت نہیں کرتا ہے، اور کون ہے جس کا بھیڑیے کی بُرائی سے دل نہیں دکھتا ہے، اتنے بڑے مجمع میں ہے کوئی شخص جو یہ کہے کہ آپ بھیڑیے کی بُرائی کیوں کر رہے ہیں، لیکن جب انسان بھیڑیا بن جائے تو کیوں آپ کا دل نہیں دُکھتا، کیوں آپ کے دل پہ چوٹ نہیں پڑتی، اس کے نام سے نفرت کا اظہار کیوں نہیں ہوتا، انسان بھیڑیا بننے کے لئے بنایا گیا ہے؟ انسان تو فرشتہ بننے کے لئے بنایا گیا ہے، انسان تو ولی بننے کے لئے بنایا گیا ہے، انسان تو ہمدردِ خلائق بننے کے لئے بنایا گیا ہے، انسان کو تو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا گیا ہے، اور ہماری شاعری، ہماری بول چال، ہمارے احساسات اور ہماری مجلسوں میں اسی حیثیت سے اس کا تذکرہ کیا گیا ہے، اور بھیڑیا بھیڑیا ہے، آج تک بھیڑیا ہے،

سیکڑوں برس سے بھیڑیا ہے، اور میں نے نہیں دیکھا کہ کسی شاعر نے بھیڑیے کی شان میں قصیدہ کہا ہو اور کسی صحیح الدماغ آدمی نے بھیڑیے کو اپنا ہیرو بنایا ہو اور اپنا آئیڈیل سمجھا ہو، سانپ بچھو سے تو ہم نفرت کریں، بھیڑیے اور تیندوے سے تو ہم نفرت کریں، شیر اور چیتے سے تو ہم نفرت کریں اور وہی کام ہم کریں اور ہمیں شرم نہ آئے۔

میں کہتا ہوں کہ ایک انسان کا ایک انسان پر ہاتھ اٹھنا کیسے ہے، اس ہاتھ کو دیکھنا چاہئے اس کو ڈاکٹروں کے پاس لے جانا چاہئے، اس کی طبّی جانچ کرانا چاہئے، اس کو کاٹ کر دیکھنا چاہئے کہ اس کے اندر کون سی چیز بھری ہوئی ہے اور کس کا خون اس کے اندر دوڑ رہا ہے، یہ ہاتھ انسان پر اٹھنے کے لئے نہیں بنایا گیا تھا، یہ ہاتھ بنایا گیا تھا، انسان پر ظلم روکنے کے لئے انسان خواہ یورپ کا ہو، انسان خواہ افریقہ کا ہو انسان خواہ امریکہ کا ہو، اس پر جہاں بھی زیادتی ہو ہمارا ہاتھ اٹھنا چاہئے اور زیادتی کو روکنا چاہئے، اگر گھر میں ہے تو وہاں بھی، راستہ چل رہا ہے تو وہاں بھی، بازار میں ہے تو وہاں بھی، مولانا حالی کہتے ہیں ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں[1]

اور ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔

الرَّاحمون یرحمھمُ الرَّحمٰنُ تبارك وتعالیٰ اِرحموا مَن فی الْاَرضِ یرحمْکُم مَن فی السماءِ (رحم کرنے والوں پر وہ خدا رحم کرتا ہے جس کا نام ہی رحمٰن ہے تم اہلِ زمین پر رحم کرو تم پر وہ رحم کرے گا جو آسمان میں ہے) مولانا حالی نے

---

[1] اونچے درجہ کے فرشتے مراد ہیں۔

اس کا ایک شعر میں خوب ترجمہ کیا ہے ؎

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

اور یہ وہ حدیث ہے جو حدیث کے حلقہ میں سب سے پہلے سنائی جاتی ہے اور اہلِ علم جانتے ہیں کہ اس حدیث کو کتنی اہمیت دی گئی ہے۔

موجودہ صورت حال کے پیش نظر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں لیکن اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ ہمارے مذہبی پیشوا اور ہمارے پولیٹکل لیڈر نکل آئیں اور ہاتھ پکڑ پکڑ کر کہیں کہ اس ملک کی عزّت رکھ لو، اس ملک کی شہرت پر بٹّہ نہ لگاؤ، آدمی بن کر رہو، ایک دوسرے سے محبت کرو، زندگی کا سارا لطف اس میں ہے کہ آدمی آدمی کو دیکھے، آدمی آدمی کو پہچانے اور امید رکھے کہ ہم پر اگر کوئی آفت پڑے گی ہم پر کوئی مصیبت آئے گی تو یہ بچائیں گے، اسی کا نام زندگی ہے، اسی کا نام تمدّن ہے اور اسی کا نام حبّ الوطنی ہے، اور اسی کا نام سیاست بھی ہے، سیاست بھی یہی ہے کہ ملک میں سب مل جل کر رہیں۔

بس حضرات میں یہ کہتا ہوں کہ ہمارے ملک پر اس وقت جنون کا دورہ پڑا ہے، دیوانگی کا جو دورہ پڑا ہے، جذباتیت کا جو دورہ پڑا ہے، مذہبی، سیاسی استحصال (EXPLOITATION) کا جو دورہ پڑا ہے یہ دورہ ہے، اور دورہ عارضی ہوتا ہے، یہ دورہ چلا جائے گا، مگر اس کے دور کرنے کے لئے علاج کرنے والوں کی ضرورت ہے، ہمدردوں کی ضرورت ہے، دل رکھنے والوں کی ضرورت ہے، جو اپنے گھروں سے گھبرا کر نکل آئیں اور اس کا بھی خیال نہ کریں کہ ہم کیا کھائیں گے کیا پئیں گے؟ اور دیوانے بن کر اس ملک میں

پھریں، جتھے بنا بنا کر دورے کریں عوام کو جمع کریں اور ملک کے نام پر، انسانیت کے نام پر، عقل و انصاف کے نام پر اور خدا کے خوف اور اس کی پہچان کے نام پر ان سے اپیل کریں کہ اب اسے ختم کرو، اب ٹھنڈے ہو جاؤ، اور اب جو تعمیری کام ہیں، ترقی کے کام ہیں، ملک کو بنانے والے کام ہیں، ملک کا نام روشن کرنے والے کام ہیں، اور ملک کی عزت بڑھانے والے کام ہیں، وہ کام کرو، یہ ملک بہت بدنام ہو چکا ہے، آپ کو شاید معلوم نہیں لیکن میں آپ سے کہتا ہوں، مجھے یاد نہیں اور تاریخ کے اندر ریکارڈ موجود ہے، اس ملک پر کبھی ایسا دھبہ نہیں آیا تھا، اور یہ ملک باہر کی دنیا میں کبھی اس نظر سے دیکھا نہیں گیا تھا، جیسا کہ آج کل دیکھا جا رہا ہے، اس میں ہم سب شریک ہیں، ہندو مسلمان سب شریک ہیں، اس لئے کہ ہم بھی ہندوستانی ہیں، اور ہندوستانی رہیں گے انشاء اللہ، ہندوستان ہمیں عزیز ہے، یہاں کی آب و ہوا ہمیں عزیز ہے، یہاں کی تہذیب ہمیں عزیز ہے، یہاں کی تاریخ ہمیں عزیز ہے، یہاں کا سویلیزیشن ہمیں عزیز ہے اور مسلمانوں نے اس ملک کو چھوڑا نہیں، وہ کہیں بھی جا سکتے تھے، ان کے لئے بہت سی جگہیں تھیں، لیکن ان سے اپنا وطن چھوڑا نہیں گیا اور نہ چھوڑا جائے گا، مگر اس کے لئے ہمت سے کام لیں، حوصلہ سے کام لیں، پاورسے کام لیں، تنظیم سے کام لیں، حکومتیں اپنا فرض انجام دیں، اسکول اور کالجز اپنا فرض انجام دیں، پولیس اپنا فرض انجام دے، پریس اپنا فرض انجام دے۔

ملک کی تین چولیں اگر بیٹھ جائیں تو ملک باقی رہ جائے گا اور وہ تین چولیں ہیں، ایجوکیشن، پولیس اور پریس، یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں کہ اگر یہ درست ہو جائیں تو پھر کوئی بڑا خطرہ نہیں ہے، آدمی پڑھ کر نکلے تو روشنی کا سبق پڑھ کر نکلے، انسان کی عزت کا

سبق پڑھ کر نکلے، اور اس کے بعد پولیس جس میں خدمت کا جذبہ ہو، تعاون کا جذبہ ہو، میں آپ سے صاف کہتا ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ یہاں پولیس کی کتنی نمائندگی ہے، لیکن میں ایک حقیقت بیان کرتا ہوں، میں کتنے ملکوں میں گیا ہوں، وہاں پولیس کو دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے، وہاں پولیس کو رہنما اور مددگار سمجھا جاتا ہے، مجھے خود اتفاق ہوا ہے کہ لندن میں ایک کانسٹبل سے پتہ پوچھ لیا تو پوچھ کر چھٹیا پا، صرف اتنا ہی نہیں کہ اس نے پتہ بتلایا بلکہ ساتھ ساتھ چلا، اور پولیس وہاں ہے ہی اس کام کے لئے کہ زیادتی نہ ہونے دے اور کمزور کی مدد کرے اور یہی نہیں بلکہ رہنمائی کرے، انگریزوں نے اپنا رُعب قائم کرنے کے لئے (کہ وہ سمندر پار سے آئے تھے) انھوں نے پولیس ایجنسی بنائی تھی کہ اس کے ذریعہ اپنا رُعب قائم کریں، انگریزوں کو پولیس کے ذریعہ مرعوب کرنا تھا، اب آج کل اس کی کیا ضرورت ہے؟ آج کل تو یہ ہونا چاہئے کہ آدمی پولیس کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرے کہ میں خطرہ میں پڑ گیا تھا، محلہ خطرہ میں پڑ گیا تھا، عورتیں بڑے خطرہ میں پڑ گئی تھیں، بچوں کی جانیں خطرہ میں پڑ گئی تھیں، یہ پولیس والے تھے جنھوں نے بچایا، ایسا ہونا چاہئے تھا، یہ احساس عام ہونا چاہئے تھا، میں کہتا ہوں ایجوکیشن، پولیس اور پریس یہ تینوں چیزیں اگر درست ہو جائیں تو اس ملک میں اس طرح کے واقعات پھر نہیں ہو سکتے جس طرح کے ہوئے ہیں، اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ دورہ پڑنے سے نہ گھبرائیے، بیماری پھیلنے سے نہ گھبرائیے، انسان ہے زندگی میں سب کچھ ہوگا، یہ نشیب و فراز یہ زندگی کے اتار چڑھاؤ ہے زندگی کا، لیکن ڈرنے کی بات یہ ہے کہ اس دورہ کا علاج کرنے کے لئے اس بیماری کا ڈر ختم کرنے کے لئے اس مریض کو بچانے کے لئے کوئی جماعت نہ ہو، کوئی آرگنائزیشن نہ ہو، کوئی پارٹی نہ ہو، اور محبِ وطن ہمدردِ انسانیت، صاحبِ دل اور منصف مزاج لوگ نہ ہوں، کسی بھی ملک کے لئے خواہ اس کی

زمین خزانہ اُگلے، اس کا آسمان سونا برسائے اور اس کے دریا سونے اور چاندی کے بن جائیں اور اس ملک میں بے کمائے اور بے محنت کئے سب کو روزی ملے، اطمینان نہیں اگر آپس کے تعلقات درست نہیں، اگر ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسا نہیں۔

یہ کیا بات ہے ہم آدمی کو دیکھ کر گھبرائیں، گھبرانے کی چیز بھیڑیا ہے، گھبرانے کی چیز تیندوا ہے، گھبرانے کی چیز سانپ ہے، گھبرانے کی چیز بچھو ہے، گھبرانے کی چیز آدمی نہیں ہے، کیا یہ آدمی اس لئے پیدا ہوا تھا کہ آدمی آدمی کو مارے، آدمی کے لئے اور اندیشے اور خطرات کیا کم تھے۔

میں کہہ رہا تھا کہ ان تاناریوں کو جس نے آدمی بنایا، قانون کا احترام دیا، تہذیب کا محافظ بنایا، وہ اللہ والے لوگ تھے، وہ دل والے لوگ تھے، وہ روحانی لوگ تھے، ہندوستان کا آزاد کرانا آسان نہ تھا، آپ دیکھئے انگریزوں کی سلطنت برٹش امپائر کہاں تک تھی، ہم نے بچپن میں یہ مثل سنی تھی کہ "انگریزوں کی سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا" کہیں نکلو گے کوئی نہ کوئی کونا ایسا مل جائے گا جہاں آفتاب روشن ہوگا، یہاں سے لے کر عدن تک ان کی حکومت تھی، اور یہ ایک خواب تھا کہ کبھی یہ ملک آزاد ہوگا، لیکن ہندو مسلمان جو محبّانِ وطن تھے، انھوں نے گاندھی جی کے ساتھ، مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے ساتھ، مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ساتھ، اور ان کے بعد مولانا حسین احمد مدنی اور نہرو خاندان کے ساتھ یہ نعرہ دیا کہ انگریزوں کا بائیکاٹ کرو، گاندھی جی اور مولانا آزاد سب سے آگے آگے تھے، اور اس وقت ہندو اور مسلمان اپنے کلچر کے اختلاف کے باوجود، اپنی زبان کے اختلاف کے باوجود، اس طرح باہم مربوط تھے، اور اس طرح ملے ہوئے تھے جس طرح گھی اور شکر اور دودھ اور پانی

ملاہونا ہے، یہ اثر شروع کا زمانہ تھا، میں نے امین آباد پارک میں گاندھی جی کی تقریر سنی ہے، میں نے موتی لال نہرو کو دیکھا ہے، مولانا آزاد سے تو ہمارے پرانے تعلقات تھے، ان لوگوں نے مل کر ان ہوتی بات ہونی کر دی کہ ہندوستان آزاد ہوا، اس وقت کوئی کہتا تو اس سے کہا جاتا کہ میاں اپنے دماغ کا علاج کراؤ، اپنے ہوش و حواس کا علاج کراؤ، نارمل حالت میں ہو؟ انگریزوں کو کوئی نکال سکتا ہے لیکن یہ ہندو مسلم اتحاد تھا، یہ حب الوطنی اور ملک کی محبت تھی جس نے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا۔

اس کے بعد تین چیزیں تھیں، گاندھی جی نے اور ان کے ساتھیوں نے اور مولانا آزاد نے (مولانا آزاد سب سے نمایاں اور سب سے آگے ہیں) تین چیزوں کو پیش کیا تھا کہ یہ تین شرطیں ہیں جب تک یہ رہیں گی ہندوستان آزاد رہے گا، پُرامن رہے گا، خوشحال رہے گا، اور محبت کا گہوارہ رہے گا، ایک سیکولرزم (SECULARISM) ڈیموکریسی (DEMOCRACY) اور نان وپولنس (NON-VIOLENCE) یہ تین چیزیں ہیں، جو ضروری ہیں ملک کی بقا کے لئے، یہ رہیں گی ملک رہے گا، اسکالرز بھی سن لیں، ہسٹورین بھی سن لیں اور سب سن لیں اور لوحِ دل پر محفوظ کر لیں، کچھ بھی ہو جائے یہ ملک ان تین چیزوں کے بغیر نہیں رہ سکتا، آج میں پھر کہتا ہوں کہ یہ ملک تین چیزوں پر باقی رہ سکتا ہے، ایک یہ کہ ڈیموکریٹ اسٹیٹ ہو، نان وپولنٹ ہو اور سیکولر ہو، اس لئے کہ تقدیر الٰہی نے یہ فیصلہ کر دیا ہے (اور خدا کا فیصلہ کوئی بدل نہیں سکتا) کہ اس ملک میں ہندو بھی رہیں گے اور مسلمان بھی، جینی بھی رہیں گے اور بودھ بھی، سکھ بھی رہیں گے اور عیسائی بھی، اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا کیوں باہر سے بھیجتا، کیوں یہ آسانی پیدا ہوتی، یہ ملک اسی طرح رہ سکتا ہے کہ یہ ملک سیکولر ہو، عرب شاعر کہتا ہے کہ "جب آگ کو کچھ اور کھانے کو نہیں ملتا تو وہ اپنے کو کھانے لگتی ہے" یہ اسلام سے پہلے کی

شاعری میں ہے کہ آگ اپنے کو کھانے لگتی ہے اگر اسے کچھ کھانے کو نہ ملے، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ آج اگر آپ نے مسلمانوں سے ——— خدا نخواستہ کس منھ سے کہوں مگر کہنا پڑتا ہے ——— فرصت کرلی، آپ نے مسلمانوں کے عزیز اور مقدس مقامات کو اپنی تحویل میں لے لیا تو یاد رکھئے پھر یہ اختلاف آپ کے اندر چلے گا، یہ بیک ورڈ کلاسز ہیں، جینی ہیں، بدھسٹ ہیں، کھڑے ہو جائیں گے اور کہیں گے کہ ہماری عبادت گاہیں واپس کرو، آٹھویں صدی عیسوی میں ساؤتھ میں شنکراچاریہ پیدا ہوئے تھے، انھوں نے تمام بودھ عبادت گاہوں کو ہندو مندروں میں تبدیل کر دیا تھا، میں نے وہاں جا کر دیکھا ہے، میں نے نالندہ کی بدھسٹ یونیورسٹی بھی دیکھی ہے جو کھدائی میں نکلی ہے، اور جگہ جگہ میں نے دیکھا ہے کہ جینیوں کے ہزاروں مندر بدل گئے، بدھوں کے سیکڑوں، ہزاروں مندر ہندوؤں کی تحویل میں چلے گئے، راجیو جی سے لے کر جو پرائم منسٹر آیا میں نے اس کو خط لکھا، میرے وہ خط چھپے ہوئے ہیں، میں نے لکھا کہ تاریخ کو اُلٹا سفر نہ کرائیے؛ تاریخ کو اُلٹا سفر کرانا بڑی غلطی ہے، تاریخ کو آگے بڑھائیے، فرصت کہاں ہے اتنی، کتنے دن کی زندگی ہے، کتنے ہمارے وسائل و ذرائع ہیں اور کتنے مواقع و امکانات ہیں، اور دنیا میں کیسے کیسے حوادث پیش آرہے ہیں، اور کتنے لوگ ہیں جن کی عمریں سو سے متجاوز ہوتی ہیں، پھر کیوں وقت ضائع کیا جا رہا ہے، کیوں تاریخ کو اُلٹا سفر کرایا جا رہا ہے، کیوں اپنی طاقت، اپنی انرجی، اپنی صلاحیت اور اپنی قابلیت کو برباد کیا جا رہا ہے، تاریخ کو آگے بڑھائیے، ملک کو آگے لے جائیے، یہ کیسا دورہ ہے کہ ملک کو پیچھے لے جانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اگر یہ ہوتا رہا کہ پہلے یہ تھا، وہ تھا، پھر اس سے فرصت نہیں ملے گی اور پھر ایسی خرابیاں پیدا ہوں گی کہ جینے کا مزہ نہ رہے گا، ہندوستان کا نام ڈوب جائے گا، اس کے نام پہ

خاک پڑ جائے گی، اور یہاں جو ہیروز، تھنکر اور فلاسفر پیدا ہوئے ہیں وہ سب چھپ جائیں گے اور سامنے صرف یہ رہے گا کہ وہ ہندوستان جہاں آدمی جلایا جاتا ہے، وہ ہندوستان جہاں آدمی کو ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا ہے، وہ ہندوستان جہاں آدمی کو آرا مشین میں لکڑی کی طرح چیر دیا جاتا ہے، وہ ہندوستان جہاں معصوم بچوں کو چلتی ٹرینوں سے اٹھا کر باہر پھینک دیا جاتا ہے۔

یہ باتیں خدا کو پسند نہیں، آپ ستاروں تک پہنچ جائیں، چاند تک پہنچ جائیں، لیکن جیسے کہ ایک انڈین فلاسفر نے کہا تھا، سی ایم جوڈ (C. M. JOAD) نے لکھا ہے، وہ لندن میں فلاسفک ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ تھا، اس نے لکھا ہے اور یہ بات ہندوستانیوں کے لئے فخر کی ہے، اس نے لکھا ہے کہ ایک انڈین فلاسفر آئے، غالباً رادھا کرشنن تھے، وہ آئے ہمارے یہاں کے ایک بڑے ذہین اور بولنے والے نے کہا آپ کو خبر ہے ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے، ہم چاند پر پہنچ گئے، ہم نے یہ مسافت اتنے گھنٹوں میں طے کرلی، ہم ایک براعظم کے فلاں کنارے سے دوسرے براعظم کے کنارے تک ہوائی جہاز سے پہنچ گئے، پہلے وہ سنتے رہے، پھر سب سننے کے بعد انھوں نے کہا کہ ہاں پانی پر تم مچھلیوں کی طرح تیرنے لگے اور فضا میں چڑیوں کی طرح اڑنے لگے، مگر زمین پر آدمیوں کی طرح چلنا تم کو نہیں آیا، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے اس بات کو کوڈ کیا ہے، جامعہ کی پچاس سالہ جبلی میں میں بھی وہاں موجود تھا کہ جو بچہ دنیا میں آتا ہے وہ اس بات کا ثبوت لاتا ہے کہ خدا انسان سے مایوس نہیں ہے، ورنہ اس بچہ کو دنیا میں نہ بھیجتا، مگر ہمارا فعل بتاتا ہے (اس زمانہ میں دہلی میں خنجر زنی کی ایسی وارداتیں ہو رہی تھیں) کہ ہم انسانوں سے مایوس ہیں، خدا مایوس نہیں، اگر وہ مایوس ہوتا تو بچہ کو اس دنیا میں نہ بھیجتا، آپ انسان کو آزما کر تو دیکھئے

کہ وہ ہے کیا چیز، اسے آزمایئے تو، اس کو خدا نے وہ دل دیا ہے جو اپنی مخلوقات میں کسی کو نہیں دیا، میں یہ کہدوں مذہب کا جاننے والا اور مذہب کا لکھنے والا ہونے کے باوجود کہ یہ دل فرشتوں کو بھی نہیں دیا گیا، خدا نے جو دل انسان کے درد میں جلنے والا پگھلنے والا تڑپنے والا، آنکھوں سے آنسو بہانے والا اور خدا سے مانگنے والا اس کے سامنے گڑگڑانے والا دِل انسان کو دیا ہے، وہ کس کو دیا ہے؟ یہ انسان تو اس قابل تھا کہ اس کو آنکھوں میں بٹھایا جائے، سر پر جگہ دی جائے، اپنے گھر میں اس کو رکھا جائے کہ ہمارا بھائی ہے لیکن اسی انسان پر ہاتھ اٹھتا ہے، اسی انسان کو روندا جاتا ہے، کمزور عورتوں اور معصوم بچوں کو ظلم کا نشانہ بنایا جاتا ہے، بمبئی، احمد آباد اور خاص طور پر سورت میں آپ دیکھئے کہ کیا ہوا، رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، میں آپ سے صاف کہتا ہوں، مجھے بہت جگہ جانا ہوتا ہے، میرے دوست احباب ہر جگہ ہیں، کہہ نہیں سکتا وہاں جو ہوا، عورتوں کو برہنہ کر کے سڑکوں پر چلایا گیا، ان کے ساتھ بُرا سلوک کیا گیا اور اس کے بعد گولی تک ماردی گئی، یہ کسی طرح سے نہ مذہب کے شایانِ شان ہے، نہ انسانیت کے، نہ علم کے، نہ عقل کے، نہ شرافت کے، اور نہ ہندوستانیت کے، آپ کو پتا نہیں کہ ہندوستان کو باہر کی دنیا میں کس نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور اس کو کیا مقام ملا ہوا تھا، یہاں اللہ کے ایسے ایسے بندے پیدا ہوئے بتانے پر آؤں تو شام ہو جائے، لیکن آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔

آخر میں پھر یہ کہتا ہوں، پنپنے کی بات ہے، توٹ کرنے کی بات ہے، بیماری ڈرنے کی چیز نہیں ہے، بیماری کا علاج کرنے والوں کا نہ ہونا ڈرنے کی چیز ہے، بیمار کی بیماری دیکھ کر تڑپنے والوں کی کمی، بیمار کی بیماری دیکھ کر علاج کا جذبہ رکھنے والوں کی کمی، یہ بات ہر ملک، ہر سوسائٹی، ہر تہذیب اور ہر عہد کے لئے خطرناک ہے، اور یہ دنیا جو اب تک باقی ہے

یہ انھیں علاج کرنے والوں کی بدولت باقی ہے، اوّلاً پیغمبروں کی برکت سے، پھر صوفیوں اور دل والوں، ہمدردوں اور انسان دوستوں کی برکت سے قائم ہے، جنھوں نے اپنا آرام چھوڑا، کھانا پینا بھول گئے، گھر والوں کو بھول گئے اور انسانوں کو دُکھ سے بچانے کے لئے اور انسانوں کو انسانوں کے خنجر سے محفوظ رکھنے کے لئے اور انسان دشمنی کا علاج کرنے کے لئے گھروں سے باہر آگئے، فاقے کئے، جاگ کر راتیں گزاریں، جان کو خطرہ میں ڈالا اور دیوانہ وار نکل پڑے، آج اس ملک میں اسی کی ضرورت ہے۔

ہم امید کرتے ہیں ہمارے یہ معزّز بھائی جو یہاں اسٹیج پر بیٹھے ہوئے ہیں اور بہت سے معزّز بھائی جن کو اسٹیج پر جگہ نہیں ملی یہ لوگ ہمّت کرکے اور دوسرے پولیٹیکل لیڈر اور مذہبی پیشوا باہر نکلیں اور اس صورتِ حال کو ختم کرنے کی کوشش کریں کہ اب یہ دوبارہ نہ ہونے پائے، کچھ بھی ہو جائے یہ نہ ہونے پائے، خدا اس سے خوش ہوتا ہے کہ آپ اس کا نام لیں، آپ اس کے بندوں کی خدمت کریں، خدا کو اس سے خوشی ہوتی ہے، اور یہ بتا دیا وہ بنا دیا خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے، انسانوں ہی کے لئے اس نے سب چیزیں بنائی ہیں، یہاں تک کہ مسجد و مندر بھی انسانوں ہی کے لئے ہیں کیا وہاں جا کر جانور عبادت کرتے ہیں۔

میں نے آپ کا بہت وقت لیا لیکن پھر میں وہ شعر پڑھوں گا امیر مینائی کا کہ ؎

امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
کہ التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

نہ زندگی کا بھروسا نہ ... لیے آپ کے جمع ہونے کا اطمینا ... معتدل زندگی کا یقین کہ آپ اس تعداد میں جمع ہوں جس تعداد میں آج جمع ہوئے ... شاید کسی کے دل کو لگ جائے اور کوئی کھڑا ہو جائے، پھر اس کے ساتھ اور لوگ بھی چلیں گے اور ملک کی صورتِ حال

جوشرمناک بھی ہے، اور دردناک بھی بدلے گی۔ اللہ ہمیں توفیق دے۔ آمین۔

ملک کی آزادی کا صحیح مطلب اور فائدہ

بھائیو اور دوستو! ہمارے چھوٹے وطن رائے بریلی اور بڑے وطن ہندوستان کے رہنے والو! میں بے تکلف کہتا ہوں کہ مجھے فخر ہے کہ وقت کی اہم ضرورت اور وقت کے تقاضہ پر ہمارے شہر رائے بریلی میں ایک آواز پر اتنا بڑا مجمع اکٹھا ہوگیا، میرے لئے بڑے فخر کی بات ہے، یہ رائے بریلی کی تاریخ کے لحاظ سے بھی (جس کا میں ایک طالب علم بھی ہوں، اور مصنّف بھی) رائے بریلی کے شایانِ شان ہے، اس رائے بریلی کا نام آپ تاجکستان و ترکستان اور ترکی میں جاکر لیں، افغانستان میں جاکر لیں، بہت سے عرب ممالک میں جاکر لیں، یورپ اور امریکہ کے ان حلقوں میں لیں جو اصلاحی تحریکوں اور ملکوں کی آزادی کی کوششوں کی تاریخ اور تحریکات سے واقف ہیں، اور اس موضوع پر لکھتے پڑھتے ہیں، تو وہ رائے بریلی کے نام سے واقف نکلیں گے اور احترام و توجہ کے ساتھ پیش آئیں گے۔

یہ کیوں؟ یہ شہر ہندوستان کا کوئی بہت بڑا شہر نہیں ہے، اور یہاں آثارِ قدیمہ اور قابلِ دید مقامات بھی نہیں ہیں، یہ بات صرف اس وجہ سے ہے کہ یہاں بعض بڑی باعظمت شخصیتیں پیدا ہوئیں، اور یہ بعض ایسی شخصیتوں کا وطن اور جائے پیدائش ہے، جنھوں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کی سب سے پہلے اور سب سے بڑی کوشش کا آغاز کیا، میری مراد حضرت سید احمد شہیدؒ سے ہے، جو یہیں (اس مقام سے کچھ فاصلہ پر) پیدا ہوئے، اور انھوں نے انگریزی حکومت کے خلاف جدّوجہد شروع کی اور ایک ایسی جماعت تیار کی جو اپنے اخلاق و سیرت، خدا ترسی و انسان دوستی، عالی ہمتی و بلند نگاہی،

جان بپاری وسرفروشی دور دور تک اور دیر دیر تک بھی اپنی نظیر نہیں رکھتی، اس کام کے لئے انھوں نے ہندوستان کے والیانِ ریاست اور اہلِ اثر واقتدار کو بھی آواز دی، ان کی انسانی غیرت، وطن دوستی اور خطرہ کے احساس کو بیدار کرنے کی کوشش کی، اس کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

وہ راجہ ہندو راؤ وزیر گوالیار کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"جناب کو خوب معلوم ہے کہ یہ پردیسی سمندر پار کے رہنے والے[1]، دنیا جہان کے تاجدار، اور یہ سودا بیچنے والے سلطنت کے مالک بن گئے، بڑے بڑے اہلِ حکومت کی حکومت اور ان کی عزت و حرمت کو انھوں نے خاک میں ملا دیا ہے، جو حکومت وسیاست کے مرد میدان تھے، وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، اس لئے مجبوراً چند غریب اور بے سروسامان کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو گئے۔"[2]

ریاست گوالیار کے ایک معتمد اور اعلیٰ عہدے دار غلام حیدر خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"ملک ہندوستان کا بڑا حصہ غیر ملکیوں کے قبضہ میں چلا گیا ہے اور انھوں نے ہر جگہ ظلم وزیادتی پر کمر باندھی ہے، ہندوستان کے حاکموں کی حکومت برباد ہو گئی کسی کو ان کے مقابلہ کی تاب نہیں، بلکہ ہر ایک ان کو اپنا آقا سمجھنے لگا ہے،

---

[1] انگریز مراد ہیں، جنھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں ہندوستان پر اپنا اقتدار جمانا شروع کر دیا تھا، اور اس کی سیاست میں دخیل ہو گئے تھے۔

[2] ماخوذ از مجموعۂ خطوط حضرت سید احمد شہیدؒ بزبان فارسی (سیرت سید احمد شہیدؒ حصہ اول تصنیف خاکسار مقرر میں صفحہ ۲۰۴ پر دیکھا جا سکتا ہے۔)

چونکہ بڑے بڑے اہلِ حکومت ان کا مقابلہ کرنے کا خیال ترک کرکے بیٹھ گئے ہیں، اس لئے چند کمزور اور بے حقیقت اشخاص نے اس کا بیڑہ اٹھایا۔[۱]

۱۸۵۷ء میں انگریزی اقتدار کے خلاف اور پورے ہندوستان کے انگریزی حکومت کی غلامی میں آجانے کے اندیشہ کے پیش نظر جس جنگ آزادی کا آغاز ہوا اور جس میں اس ملک کے باشندے عمومی طور پر شریک ہوئے اور جس کو انگریزوں اور ان کی نقالی کرنے والوں نے غدر (MUTINY) کا نام دیا ہے، جو ابھی تک چلا آرہا ہے اس کے بارے میں مشہور انگریز مصنّف سر ولیم ہنٹر (SIR WILLIAM HUNTER) نے صاف طور پر لکھا ہے کہ:-

"۱۸۵۷ء کے غدر میں سید صاحبؒ کی تحریک جہاد کی بچی کھچی چنگاریاں کام کر رہی تھیں۔"[۲]

ہندوستان کی جنگ آزادی کی کامیابی کا جو شہرہ ہوا اور دنیا میں اس جدّ و جہد اور اس کے مخلص اور صاحبِ بصیرت رہنماؤں کو جو عزّت ملی، ان کے کارنامہ کا جس طرح اعتراف کیا گیا، اور معاصر دنیا اور محکوم ملکوں کے لئے وہ جس طرح ایک شاندار نظیر اور ہمّت افزا کارنامہ بن گیا، اس نے جس طرح ہندو مسلم اتحاد کا ترک موالات (NON-COOPERATION) جیلوں کے بھر دینے اور قربانیوں کے نمونے پیش کرنے کا منظر دنیا کے سامنے پیش کیا، اس نے ہندوستان کا نام روشن کیا اور دنیا کے کئی ملکوں نے جو آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے، اس کو اپنے لئے نمونہ اور قابلِ تقلید مثال سمجھا، آج بھی بہت سے ایشیائی و مشرقی ملکوں میں ہندوستان کا نام بڑی عزّت سے لیا جاتا ہے اور جنگ آزادی کے سورماؤں (FREEDOM FIGHTER) کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

ملک کی آزادی کی اس نعمت اور کارنامہ کا حق یہ تھا کہ ہم ہر قیمت پر اور ہر طرح کی

---

[۱] ایضاً ص ۲۰۴
[۲] (THE INDIAN MUSALMANS) ص ۵۲

قربانی دے کر اس کی حفاظت کریں، اور اس کی آبرو اور عزّت قائم رکھیں، اس پر ہر دور میں اور ہر جگہ فخر اور شکر کے جذبات کا اظہار کیا جائے، غلامی کے دور کے تصوّر سے ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، اور ہمارے اندر کراہت و حقارت، نفرت اور "گھن" کا ایک جذبہ پیدا ہو، اور ہم کسی حال میں اس دور کے واپس آنے کا تصوّر اور اس کو ترجیح دینے کا تخیّل بھی گوارہ نہ کر سکیں۔

لیکن میں اب دل پر پتھر رکھ کر اور اپنے ضمیر (CONSCIENCE) اور سامعین سے معذرت کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ آج ہمارے ملک کی جو حالت ہو رہی ہے اور خاص طور پر (۶ دسمبر کے بعد سے) ہندوستان کے کئی بڑے بڑے شہروں میں اپنے ہم وطنوں اور ملکی بھائیوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا جس سفّاکی اور بے دردی کے ساتھ ہزاروں آدمیوں کا خون بہایا گیا، گھر اور دکانیں لوٹی گئیں، عورتوں کی بے عزّتی کی گئی، بچوں کو مٹّی کے برتنوں کی طرح توڑا اور خاک میں ملایا گیا، کروڑوں اور اربوں کا سرمایہ لوٹا گیا اور ضائع کیا گیا، میدانِ جنگ کی طرح خوف و ہراس کی فضا، باغ و بہار شہروں اور تماشا گاہ بستیوں پر ہفتوں طاری رہی، اس نے ملک کو ایک ایسی منزل پر کھڑا کر دیا کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد غلامی کے دور کو یاد کرنے لگی، اور اس زمانہ کو نہ صرف ترجیح دینے لگی بلکہ اس کی آرزو کرنے لگی، جب ملک میں ہر طرف امن و امان کا دور دورہ تھا، عزّتیں اور عصمتیں محفوظ تھیں، بچوں پر کوئی بُری نگاہ نہیں ڈال سکتا تھا، ساری خرابیوں اور بدکرداریوں کے ساتھ اور اس حقیقت کے ساتھ کہ سات سمندر پار کے رہنے والے انگریزوں کو اس ملک پر حکومت کرنے کا ہرگز حق نہ تھا، اور وہ ایک بدیسی راج تھا، جو یہاں سے دولت حاصل کر کے اپنے ملک کو منتقل کرتا تھا، عام شہریوں کو اس کا اطمینان تھا کہ وہ محفوظ ہیں، پولیس اور فوج ڈرنے کی چیز نہیں تھی، وہ کرایہ کے ٹٹّو تھے،

اور بدیسی حکومت کے غلام لیکن ان میں اپنے ہم مذہبوں اور اپنی ذات برادری کی حمایت و ترجیح کا جذبہ نہیں تھا، وہ امنِ عامّہ اور تحفّظ کا اپنے کو ذمّہ دار سمجھتے تھے، اس سے زیادہ اس دور اور اس دور کے حاکموں کی تعریف اور اعتراف میں کہنا اپنی غیرت و ضمیر کو گوارہ نہیں، اور یہ بھی جو کچھ کہا گیا وہ بھی دل پر جبر کر کے کہا گیا۔

اس سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں کی مختلف قومیں اور مذاہب اپنے عقیدے اور مذہب اور اپنی تہذیب و ثقافت (RELIGION AND CULTURE) کے مطابق زندگی گذارنے اور اس کو اپنی آئندہ نسل تک منتقل کرنے اور اس کے مطابق تعلیم گاہیں، مکاتب و مدارس قائم کرنے اپنی زبان میں لکھنے پڑھنے میں آزاد تھے، ان پر کوئی علم الاصنام (MYTHOLOGY) مسلّط کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی، اس وقت انگریزی کی ریڈروں اور نصابِ تعلیم (CURRICULAM) میں جانوروں کے قصے، کتّے بلّی کی حکایتیں اور تصویریں، یا عالمی تاریخی شخصیتوں (HISTORICAL PERSONALITIES) کے قصّے اور ان کا تعارف ہوتا، لیکن عیسائی مذہب (CHRISTIANITY) کے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں، عقیدۂ تثلیث (TRINITY) یا صلیب (CROSS) کی تصویر و تقدیس کی دعوت نہیں ہوتی تھی، اس لئے جن لوگوں کو مذہب سب سے زیادہ عزیز تھا، ان کو اس معاملہ میں کوئی بڑی تشویش نہ تھی، صرف مغربی تہذیب و معاشرت مغربی فیشن اور مغربی تخیلات و معیار اور کسی کسی وقت مذہبی آزادی الحاد اور بے راہ روی کا ڈر رہتا تھا۔[1]

لیکن اب اس سلسلہ میں صورتِ حال مختلف ہے، اور بعض جماعتوں اور سیاسی

---

[1] اس کے بارے میں لسان العصر اکبر الٰہ آبادی اور علّامہ اقبال کا کلام دیکھنا چاہئے اور علماء کی ان کوششوں کو جو انھوں نے اس کے اثر کو زائل کرنے میں صرف کیں، اور ان کے اچھے نتائج برآمد ہوئے

پارٹیوں نے اپنے تعلیمی و تربیتی منصوبوں کا صاف اعلان کر دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ اب ایک ہی زبان ہندی رہے گی، نصاب کی کتابوں میں ایک خاص میتھالوجی (دیومالا) ہی داخل کی جائے گی، ایک بدلی ہوئی تاریخ پڑھائی جائے گی، آزاد مدارس و مکاتب کا قیام مشکل ہو جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

حضرات! اب اس کے بعد دل کو تھام کر اور پوری معذرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بہت سے وہ لوگ جن کو اپنا مذہب عزیز ہے اور اپنے خاندانوں اور ہم قوموں کی عزت و ناموس عزیز ہے، اور پھر اس سے آگے بڑھ کر ملک کا امن و امان اور پُرسکون زندگی عزیز ہے، جس میں وہ دینی اصلاحی، تعلیمی، تصنیفی، ادبی اور فنّی کام اور مشاغل اطمینان سے انجام دے سکیں، اور اس سے بڑھ کر اپنی عبادت گاہیں، درسگاہیں، اور کتب خانے عزیز ہیں، وہ اس زمانہ کو یاد کرنے لگے ہیں (خواہ وہ کتنا ہی غیر فطری تھا) جب یہ سب چیزیں عام طور پر محفوظ اور خارج از بحث تھیں۔

میں آپ کو یہ بھی سنا دوں کہ میں نے ایک مرتبہ محترمہ اندراجی سے ان کی وزارتِ عظمیٰ کے زمانہ میں جب ایمرجنسی نافذ تھی، اور بعض جگہ بعض اقلیتوں کے ساتھ بڑی زیادتیاں ہوئی تھیں، کہا کہ اندراجی! اس سے زیادہ شرم کی کوئی بات نہیں کہ لوگ انگریزوں کے دور کو جو غلامی کا دور تھا یاد کرنے لگے ہیں، مجھے یقین ہے کہ ہمارے جنگِ آزادی کے رہنماؤں کو اس کا کسی وقت اندازہ ہوتا یا تصوّر بھی آتا کہ ملک کے آزاد ہونے کے بعد ایک ایسا وقت بھی آسکتا ہے کہ ملک کے ذمّہ داروں کی تنگ نظری اور غلط کاری کی بنا پر انگریزوں کی حکومت کا دور یاد آنے لگے گا اور وہ اس کی تمنّا کرنے لگیں گے، تو آپ یقین مانئے کہ ان کے عزم و ہمّت اور جوش و خروش میں (جو ملک کو آزاد کرانے کے لئے

ظاہر ہو رہا تھا) کمی ہو جاتی، اور ان کے دل اور قوتِ عمل (VIGOUR) کو بڑا دھکا لگتا، اور ان کی تقریروں میں وہ زور اور ان کی جدّ و جہد میں وہ جوش و خروش نہ رہتا، اور یہ جنگِ آزادی اس آسانی کے ساتھ اور نیک نامی کے ساتھ کامیاب نہ ہوتی، اور اپنی منزل کو نہ پہونچتی، جس پر پہونچی۔

ایک ایسا زمانہ جس میں آدمی اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش نہ ہو، اپنے مدرسوں اور کتابی ذخیروں کو دیکھ کر مطمئن نہ ہو، اپنی محنتوں کے حاصل، اور اپنے جوہر و قابلیت کے نتیجہ سے اس میں افتخار کیا اعتماد کا بھی جذبہ پیدا نہ ہو، انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے مستقبل کی طرف سے مشکوک و متردّد ہو، اس میں زندگی کا کیا مزا؟ اور ایسے ملک میں کس معنی میں آدمی اپنے کو آزاد شہری، ملک کی زندگی میں دخیل اور اس کی تعمیر و ترقی میں شریک اور سرگرم ہو؟ پوری انسانی تاریخ میں انسان کا ضمیر اس بات کو پکار پکار کر کہتا سنائی دیتا ہے کہ غلامی سے بڑھ کر عیب و ذلّت اور شرم کی کوئی بات نہیں، خدا نہ کرے کہ ایسی عدالت قائم ہو کہ مجھے گواہ پیش کرنے کی نوبت آئے، لیکن سیکڑوں کو پیش کیا جا سکتا ہے، جو یہ کہتے تو نہیں ہوں گے لیکن سوچتے ضرور ہوں گے، گھر میں بیٹھ کر باتیں بھی کرتے ہوں گے۔

پھر کسی آزاد ملک میں جس نے ملک کی آبادی کے تمام عناصر (SECTIONS) اور قوموں اور فرقوں (CASTES AND CREEDS) کے تعاون (COOPERATION) جدّ و جہد اور قربانیوں کے ذریعہ آزادی حاصل کی ہو، اس کی قیادت اور رہنمائی میں وہ ملک آزاد ہوا ہو، اس کا کوئی جواز نہیں کہ کوئی ایک فرقہ یا قوم (COMMUNITY) خواہ وہ کیسی کھلی اکثریت اور بڑی تعداد میں ہو، اور کیسا ہی سرمایہ دار اور با وسائل ہو، وہ نہ صرف اپنی تہذیب و ثقافت، اپنے عقائد اور دیومالا کی تعلیم و تبلیغ اور اس کو اپنی نئی نسل کی طرف

منتقل کرنے، اور اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنی زبان و رسم الخط کے نہ صرف رواج دینے اور قائم رکھنے میں، بلکہ پورے ملک پر اور نئی نسل پر اس کو جاری اور رائج کرنے میں آزاد ہو، اور دوسرا فرقہ (OTHER COMMUNITY) دوسرا مذہب رکھنے والے (خواہ وہ اپنی تعداد میں کئی ملکوں کے اسی مذہب کے باشندوں سے زیادہ تعداد رکھتے ہوں) اپنے دین و مذہب کے مطابق تعلیم دینے، اپنی زبان و رسم الخط کی ترویج و بقاء اپنی تہذیب و ثقافت (CULTURE AND TRADITIONS) کے تسلسل کی کوشش میں آزاد نہ ہو، روز بروز اس پر نئی نئی پابندیاں عائد کی جائیں، اور رفتہ رفتہ وہ محسوس کرنے لگے کہ وہ چلنے پھرنے، کھانے کمانے میں تو آزاد ہے لیکن لسانی، ثقافتی اور تعلیمی طور پر پابند اور غلام ہے، اہلِ علم و نظر جانتے ہیں کہ صرف رسم الخط (SCRIPT) کی تبدیلی سے ایک ملک کے پورے باشندوں کا اپنے قدیم علمی ورثہ (INTELECTUAL HERITAGE) اور پوری ثقافت (CULTURE) سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، اور وہ اپنے ماضی سے منقطع ہو جاتے ہیں، اسی بنا پر ایک فلسفی مؤرخ (ARNOLD TOYNBEE) نے لکھا ہے کہ "اب کسی کتب خانہ، اور علمی ذخیرہ کو نذرِ آتش کرنے اور برباد کرنے کی ضرورت نہیں، رسم الخط (SCRIPT) کا بدلنا کافی ہے، اس طریقہ سے اس ملک کا اپنے ماضی سے رابطہ بالکل ختم ہو جائے گا۔"[1]

ہم اس مضمون کو اور اس اظہارِ حقیقت کو کہ وہ آزادی ہی نہیں جس کا سایہ ملک کے ایک حصہ پر پڑے، دوسرا حصہ محروم رہے، ایک فرقے کے حق میں آزادی کی بہار آئے اور اس کا باغ نئے برگ و بار لائے اور دوسری جگہ خزاں کا دور دورہ ہو، اور نئے نئے علمی اور ذہنی، تعلیمی و تربیتی اور مذہبی و اعتقادی طوق و سلاسل اور رکاوٹوں اور پابندیوں کا منظر، اس مضمون کو اس دور کے مشہور و مقبول شاعر حضرت جگر مرادآبادی

---

[1] (A STUDY OF HISTORY p. 518, 519)

کی ایک غزل پر ہم اپنے اس مقالہ کو ختم کرتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں ؎

چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشہ گوشہ میں — کہیں بہار نہ آئے، کہیں بہار آئے
یہ میکدہ کی یہ ساقی گری کی ہے توہین — کوئی ہو جام بکف کوئی شرمسار آئے
خلوص و ہمت اہلِ چمن پہ ہے موقوف — کہ شاخ خشک میں بھی پھر سے برگ و بار آئے

دہلی کا سفر، وزیر اعظم صاحب سے ملاقاتیں اور پرسنل لا بورڈ کی عاملہ کا جلسہ

راقم سطور ۷، یا ۸ جنوری کو دہلی کے لئے روانہ ہوا اور اپنی قیام گاہ (مکان مولوی عبد اللہ عباس ندوی واقع اوکھلا) میں مقیم ہوا، دہلی میں محترمی محمد یونس سلیم صاحب (سابق گورنر بہار) اور جناب شری کرشن کانت جی گورنر آندھرا پردیش تشریف لائے ہوئے تھے، انھوں نے محترمی نرسمہا راؤ جی وزیر اعظم ہند سے ایک خصوصی ملاقات کا انتظام کیا، یہ ملاقات پرائم منسٹر صاحب کی قیام گاہ کے بجائے کرشن کانت جی کی دہلی کی قیام گاہ (آندھرا پردیش بھون) پر رکھی گئی، راقم کے ساتھ اس کے رفیق محترم و شریک کار مولانا عبد الکریم پاریکھ صاحب اور یونس سلیم صاحب اور پاریکھ صاحب کے ایماء پر عزیز القدر مولوی محمد رابع حسنی ندوی (صدر شعبۂ ادبیات عربی دار العلوم ندوۃ العلماء جو اس سفر میں ساتھ آئے تھے) اس ملاقات کے موقع پر موجود تھے، راقم نے بالقصد اور بالارادہ اپنی گفتگو ملک کی موجودہ صورتِ حال اور بہار اشٹر اور گجرات کے فسادات کے دائرہ میں محدود رکھی، اور صفائی کے ساتھ کہا کہ ملک اس وقت جل رہا ہے، اور تباہی کے دہانہ پر کھڑا ہوا ہے، اس کی جلد خبر لینے کی ضرورت ہے،

ورنہ معاملہ ہاتھ سے نکل جائے گا، اس نے اپنی لکھنؤ کی تازہ تقریر جو ۶ جنوری کو قیصر باغ کی بارہ دری میں ایک مخلوط مجمع عظیم کے سامنے ہوئی تھی، اور جو اوپر کے صفحات میں گزر چکی ہے نرسمہا راؤ جی کو پیش کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس کو ضرور ملاحظہ فرمالیں، انھوں نے اس کا وعدہ کیا اور جیب میں رکھ لی معلوم نہیں ان کو پڑھنے کی نوبت آئی یا نہیں؟ لیکن زبانی جو کچھ کہا جا سکتا تھا وہ کہا گیا اور انھوں نے سنجیدگی اور غور سے سنا اور عمل کا وعدہ کیا۔

اسی زمانۂ قیام میں بمبئی سے سنگین ترین فساد اور وحشیانہ کارروائیوں اور سفّاکانہ واقعات کی خبریں اخبارات اور ٹیلیفون سے ملتی رہیں، راقم کا تقریباً ہر سال ایک دو مرتبہ بمبئی میں اپنے مخلص دوست اور میزبان الحاج غلام محمد صاحب (محمد بھائی) مالک بمبئی آندھرا ٹرانسپورٹ کے دولت خانہ سہاگ پیلس سائکلی اسٹریٹ مدنپورہ میں کئی کئی ہفتے قیام رہا کرتا ہے، جہاں اس کو اپنی تحریری و تصنیفی کام کو راحت و سکون کے ساتھ انجام دینے کا موقع ملتا ہے، اور اس کی کئی اہم تصنیفات یا ان کا بڑا حصّہ وہیں تیار ہوا ہے، ان کے یہاں کے ٹیلیفون سے بھی بمبئی کی سنگین صورتِ حال کی اطلاع ملتی رہی، جس سے ہر وقت کسی سنگین واقعہ کے وقوع کا خطرہ محسوس ہوتا تھا، بمبئی کے مسلمانوں بلکہ شہریوں کا بھی حق سمجھ کر اور اپنے مخلص میزبان کی عنایات اور خلوص و محبت کے پیش نظر طبیعت میں ایک اضطراب پیدا ہوگیا اور میں نے ایک بار پرائم منسٹر صاحب کو براہ راست ٹیلیفون کیا کہ آپ جلد بمبئی کی خبر لیں اور وہاں جان و مال، عزّت و آبرو کے تحفّظ کا انتظام کریں، انھوں نے وعدہ کیا اور ٹیلیفون کی بعض اطلاعوں سے معلوم ہوا کہ کسی درجہ میں اس کا انتظام کیا گیا ہے،

اور محدود پیمانہ پر کارروائی ہوئی ہے لیکن شہر ابھی تک سکون و اعتدال کی منزل پر نہیں آیا ہے۔

دوسری طرف آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی عاملہ کا جلسہ بھی ہو رہا تھا، اس کے دوران بمبئی سے بڑی اضطراب انگیز خبریں ٹیلیفون اور دوسرے ذرائع سے پہنچیں، جلسہ نے یہ طے کیا کہ اسی وقت ایک وفد پرائم منسٹر کے پاس جائے اور ان سے درخواست کرے کہ وہ خود جلد سے جلد بمبئی تشریف لے جائیں، حالات کا خود معائنہ کریں اور صورت حال کی تبدیلی اور اصلاح کے لئے فوری قدم اٹھائیں اور انتظامیہ میں تبدیلی کریں، یہ وفد ان سے ملا اور انھوں نے اس کا وعدہ کیا لیکن وہ تاخیر سے اس پر عمل کر پائے، ان کا قیام وہاں بہت مختصر اور رسمی رہا اور صورتِ حال میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

یہاں پر مجبوری سے اس کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہماری نرسمہاراؤ جی سے جو پہلی ملاقات کرشن کانت جی کی قیام گاہ پر ہوئی وہ بہت سے ناقدین اور حوصلہ مند افراد کو (جو اس کو ایک شرف کی بات سمجھتے تھے) کھلی اور دہلی کے بعض اخبارات نے (جو اکثر محاسبہ اور آخرت کے مؤاخذہ کو اہمیت نہیں دیتے) قیاس آرائیاں شروع کیں اور قارئین کو تأثر دیا کہ معلوم نہیں اس انفرادی ملاقات میں کیا کیا سرگوشیاں ہوئیں اور اس سے کیا کیا فائدہ اٹھایا گیا؟

بمبئی کے عظیم دھماکے

۱۲ر مارچ ۱۹۹۳ء (مطابق ۱۷ر رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ) بمبئی میں جمعہ کی

نماز کے وقت وقفہ وقفہ سے تیرہ (۱۳) مقامات پر طاقتور بم پھٹے، سرکاری اطلاع کے مطابق ۳۱۷ آدمی ان دھماکوں میں ہلاک ہو گئے، غیر سرکاری اندازے کے مطابق اس کی تعداد کئی گنا زیادہ ہے، کہا جاتا ہے کہ گیارہ سو (۱۱۰۰) افراد سے زیادہ زخمی ہو گئے۔[1]

بمبئی کے وزیر اعلیٰ شرد پوار نے دھماکوں کو ہندوستان کی اقتصادی زندگی کو مفلوج کرنے کی سازش قرار دیا، وزیر داخلہ مسٹر چوان نے الزام لگایا کہ بم دھماکے ایک بین الاقوامی سازش کا حصہ ہیں تاکہ شہر میں بے چینی پھیلے۔

کلکتہ میں بھی بعض تجارتی و رہائشی عمارتوں میں زبردست دھماکے ہوئے جس کے نتیجہ میں کم از کم پچپن (۵۵) افراد ہلاک ہوئے اور سو (۱۰۰) سے زائد زخمی۔

یہ دھماکے مہاراشٹرا اور گجرات کے ان انسانیت سوز بے رحمانہ وسفاکانہ فرقہ وارانہ فسادات اور یک طرفہ (اقلیت کے خلاف کارروائی) کا ردِّ عمل کہے جا سکتے ہیں، جو قدرتی اور طبعی ہے، لیکن ابھی تک ان کی ذمہ داری ایک فریق پر ہونے یا کسی غیر ملکی ہاتھ کے کھیل ہونے کا قانونی اور مدلّل ثبوت نہیں مل سکا، پھر یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ تشدّد (VIOLENCE) ایک ایسا متعدّی مرض ہے جو ایک مرتبہ شروع ہونے کے بعد کسی طبقہ یا فریق میں محدود نہیں رہتا، مختلف محرکات، سیاسی، انتخابی، مالی واقتصادی اغراض و مقاصد سے اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

بمبئی کے ان دھماکوں کے بارہ میں بعض حقیقت پسند اور جری رہنماؤں اور صحیفہ نگاروں کے بیانات پیش کئے جاتے ہیں:۔

"اس وقت دو (۲) طاقتیں ہندوستان کو غیر مستحکم بنانے کے لئے دن رات

---

[1] ان مقامات اور ان میں متاثر ہونے والوں کی تفصیل طوالت طلب ہے۔

کام کر رہی ہیں، پہلی طاقت "ہندوتو" تواز عناصر ہیں جنھوں نے ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کو منہدم کر دیا، کوئی بھی ہوشمند ہندوستانی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ بابری مسجد کے وحشیانہ انہدام کے نتیجے میں ملک گیر پیمانہ پر خوفناک فرقہ وارانہ تشدد پھوٹ پڑا جس کے بعد بین الاقوامی دہشت گردوں کے لئے ہندوستان زرخیز زمین بن گئی، اس کے بعد ہی دوسری طاقت یعنی بین الاقوامی دہشت گردی ہندوستان کو کمزور کرنے کے لئے منظر عام پر آ گئی، یہ بات زیادہ سے زیادہ واضح ہوتی جا رہی ہے کہ بمبئی اور کلکتہ میں ہونے والے بم دھماکے انہدام مسجد کے خلاف ہونے والے ردّ عمل کا نتیجہ ہیں اور یہ ہمارے ملک کی معاشی ترقی کو روکنے کی ایک ناپاک کوشش ہے، بی جے پی اور اس کے لیڈران کو بین الاقوامی دہشت گرد تنظیموں کے لئے ہندوستان کے شہروں کو کھول دینے کی ذمہ داری قبول کرنی چاہئے، وزیر اعظم اور حکومت سے استعفیٰ طلب کرنے کے بجائے بی جے پی کے لئے مناسب یہی ہوگا کہ وہ اپنی سنگدلانہ، فرقہ پرست مہم کو بند کر دے اور عوام کو اس کے لئے چھوڑ دے کہ وہ بم دھماکوں کے صدمے سے باہر آئیں اور انھیں اجازت دے کہ اپنے ملک کو معاشی اور سیاسی لحاظ سے آگے بڑھانے کی کوششوں میں اپنی توجہ مرکوز کریں۔"

دی ہندو، مدراس

دی ہندو ۲۲/۳/۱۹۹۳ء

"گذشتہ دنوں بمبئی اور کلکتہ میں جو بم دھماکے ہوئے ان کو لے کر یہ افواہ پھیلانے کی کوشش کی جارہی تھی کہ مسلمانوں نے اجودھیا میں بابری مسجد کو توڑے جانے کا بدلہ لیا ہے میں اس بات سے متفق نہیں ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ سارے اجودھیا معاملہ میں مسلمانوں نے جس صبر و ضبط سے کام لیا ہے وہ اپنے آپ قابلِ ستائش ہے، بار بار یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی تھی کہ مسلمان ایک طرح سے شکست خوردگی کا احساس کررہے ہیں، میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں، شکست کا سوال تب اٹھتا ہے جب کسی طرح کے فتح کی امید بندھی ہو، اجودھیا میں جو کچھ ہوا اس میں کسی کی جیت نہیں ہوئی اس میں تو انسانیت کی ہار ہوئی تھی۔

لیڈر آپس میں چاہے جو بھی دعویٰ کریں یا پھر لوگوں کو بہکانے کے لئے بیان دیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس ہار کو ہر ایک شخص نے محسوس کیا ہے، یہ دھرم کا سوال نہیں تھا، بہرحال ان حالات کے پیش نظر میں سوچتا ہوں کہ بھارت میں رہنے والے مسلمانوں نے بہت ہی سوجھ بوجھ سے کام لیا تھا، انھوں نے کسی وقت بھی اشتعال سے کام نہیں لیا اور نہ ہی غصہ سے، اگر غور سے دیکھا جائے تو جہاں بھی فسادات ہوئے اس میں وہ عناصر زیادہ شامل تھے جو کہ غنڈہ گردی سے اپنی زندگی بسر کررہے تھے، ان لوگوں کو اکسانے والے سیاسی نیتا ہیں ان کو اپنے مفاد کی جو پڑی ہے، افواہیں یہ پھیلائی جاتی رہیں کہ مسلمان انتقامی جذبہ سے کام کررہے ہیں، ایک یا دو ایسے ہوں بھی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ

اس کے لئے سارے فرقے کو بدنام کیا جائے یہ تو سیاسی نیتاؤں کے ہاتھوں میں کھیلنے کے مترادف ہوگا، اس لئے گمبھیرتا سے احساس کرنا چاہیئے کہ عام مسلمان کا کوئی قصور نہیں وہ تو اپنی روزمرہ کی ضروریات کی تکمیل میں مصروف رہتا ہے، اس لئے کہ وقت ہی کہاں ہے کہ وہ داؤ پیچ میں شامل ہو، یہ تو خود غرض لوگوں کی سازش ہوتی ہے، جنھیں مسلمانوں سے کوئی ہمدردی نہیں، ان کا اسلام سے بھی کوئی تعلق نہیں لیکن اس کی وساطت سے ان کی لیڈری بنی رہتی ہے تو وہ اس کا استعمال کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کریں گے، یہی سب ہو رہا ہے۔"

(روزنامہ ہندی ملاپ حیدرآباد)

چندر شیکھر کی حق بات

سابق وزیر اعظم اور سماج وادی جنتا پارٹی کے لیڈر مسٹر چندر شیکھر نے گذشتہ روز وارانسی میں اخباری نمائندوں کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ بمبئی میں ہوئے بم دھماکوں کے لئے کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر پاکستان پر الزام لگانا معقول بات نہیں ہے، انھوں نے کہا کہ اس قسم کے الزامات اس ملک کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات کو ضرور متاثر کریں گے۔

وزیر اعظم صاحب سے بورڈ کے وفد کی دوبارہ ملاقات اور میمورنڈم

مسلم پرسنل لا بورڈ نے وزیر اعظم سے دوبارہ ملاقات اور ان کی خدمت میں

ایک واضح اور مفصل میمورنڈم پیش کرنا مناسب سمجھا اور وزیر اعظم صاحب نے اس کا موقع دیا'
بورڈ کے صدر کی قیادت میں؛ ۵ اپریل ۱۹۹۳ء کو یہ وفد ملا اور اس نے میمورنڈم
پیش کیا، وزیر اعظم نے میمورنڈم رکھ لیا اور کہا کہ وہ اس پر غور کریں گے، انھوں نے
اظہار خیال اور تأثر میں بہت احتیاط برتی اور اس کا کوئی ردّ عمل ظاہر نہیں ہونے
پایا، صدر وفد نے گفتگو کا آغاز کیا، پھر دوسرے مؤقر ارکان نے بھی اظہار خیال کیا،
اور وفد واپس آگیا۔

عارف محمد خاں صاحب کا ایک بیان اور اس کی تردید

عارف محمد خاں صاحب جو راجیو جی کے زمانہ میں وزیر مملکت تھے، آل انڈیا
مسلم پرسنل لا بورڈ کے اس مطالبہ اور جدّ وجہد سے اتفاق نہیں رکھتے تھے، جو اس نے
نفقۂ مطلّقہ کے سلسلہ میں شریعت کے موقف کی بقا و حفاظت اور سپریم کورٹ کے
فیصلہ کی تبدیلی کے بارہ میں شروع کر رکھی تھی، انھوں نے پارلیمنٹ کی بحث میں بھی
مخالفانہ موقف اختیار کیا تھا، اور اس کی بنا پر ان کو مستعفی ہونا پڑا تھا، انھوں نے
انھیں دنوں میں یہ شگوفہ چھوڑا کہ بورڈ کے صدر (ناچیز راقم سطور) نے راجیو جی سے
یہ سودا کیا کہ آپ بورڈ کے مطالبہ کو تسلیم کریں اور پارلیمنٹ سے اس کی تائید میں
بل پاس کروا دیں اور ہم اجازت دیتے ہیں کہ آپ بابری مسجد کا تالا کھلوا دیں
اور اس کو اکثریتی فرقہ کے حوالہ کر دیں۔

ان کا یہ بیان بعض اخبارات میں چھپا اور بہت سے لوگوں نے جو ایسے بیانات
و الزامات کو فوراً تسلیم کر لیتے ہیں اس کا تذکرہ اور چرچا کیا، حیرت کی بات ہے کہ

خاں صاحب کو معلوم تھا کہ مسجد کا تالا پہلے سے کھلا ہوا تھا اور مسٹر جارج فرنانڈیز کے بیان کے مطابق یہ اقدام اندراجی کے زمانہ میں ہو چکا تھا، انھوں نے اکثریتی فرقہ کو خوش کرنے اور ان سے سیاسی فائدہ اٹھانے کے لئے یہ سمجھوتا کر لیا تھا[1] پھر معلوم نہیں اس الزام تراشی اور اس "تجاہلِ عارفانہ" کی بنیاد کیا ہے؟ شاید انھوں نے اس داغ کو مٹانے کے لئے جو حکومت سے علیحدگی کا ان پر لگا تھا یہ تدبیر اختیار کی کہ وہ اس کی ذمّہ داری پرسنل لا بورڈ اور اس کے صدر پر ڈال دیں، متعدد اردو اخبارات نے اس کے خلاف بیانات اور مضامین شائع کئے، جن میں لکھنؤ کا "قومی آواز" پیش پیش رہا اور اکثر لوگوں نے اس کو ایک انتقامی جذبہ اور احساس کمتری پر محمول کیا۔

بورڈ کے طریق کار کے بارہ میں

دہلی کے پرسنل لا کے جلسہ کے بعد جس میں اچانک ایک سات رکنی کمیٹی کی تشکیل ہوئی جس میں ایسے متعدد افراد شامل کئے گئے جو مسئلہ کے حل کرنے اور مسلمانوں کے نہ صرف عائلی قانون بلکہ پورے شرعی قانون کے تحفّظ کے لئے نیز بابری مسجد کی بازیابی کے لئے اس جمہوری، دستوری اور مثبت اور تعمیری طریق کار سے پورے طور پر ہم آہنگ نہیں تھے، جو بورڈ کے محترم بانی امیر شریعت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی کا طرز فکر اور مزاج تھا، اور اس راقم (موجودہ صدر) اور اس کے متعدد بلکہ اکثر رفقاء کا طرز فکر اور مزاج ہے' اس میں بعض ان تنظیموں اور مجالس کا بھی دخل ہے جو محاذ آرائی، میدانی جدّ و جہد اور مسلمانوں میں نیا جوش و جذبہ اور

---

[1] کتاب کے پچھلے صفحات میں اس کا تذکرہ آچکا ہے۔

حفاظت خود اختیاری کا سامان پیدا کرنے کی ضرورت وافادیت پر یقین رکھتے ہیں، راقم جیسا کہ اس کی پچھلی مساعی اور تحریروں سے قارئین پر واضح ہو گیا ہو گا کہ وہ ہندوستان میں اسی فضا کو قائم اور باقی رہنے کو ضروری سمجھتا ہے کہ جس میں اسلام کے تعارف اور اس کی دعوت و تبلیغ کا کام بھی ہو سکے "پیام انسانیت" کی تحریک بھی چلائی جا سکے اور "تفاہم باہم" کی ضرورت کا احساس اور اس کے لئے فضا ہموار ہونے کی کوشش بھی باقی رہے۔

دہلی کے اجلاس کے بعد سے اس مسئلہ میں بہت خلط ملط اور اشتباہ پیدا ہو گیا جس کی ایک بڑی وجہ بعض دوسری تنظیموں کے محترم و مؤثر ارکان کی طرف سے بورڈ کی ترجمانی اور بابری مسجد کے قضیہ کی وکالت تھی، اور اکثر ایک جگہ دونوں تنظیموں کے اجلاس کو بھی دخل تھا۔

راقم نے اس صورت حال کو پیش نظر رکھ کر ضروری سمجھا کہ وہ کم سے کم بورڈ کے مسلک اور طریق کار اور اپنے ذہن و طریق فکر کی محتاط طریقہ پر ترجمانی کر دے۔ اس نے "قومی آواز" کے نمائندہ حسین امین صاحب کو اسی موضوع سے متعلق استفسار کرنے پر جواب میں ایک بیان دیا جس کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے:۔

"مولانا نے کہا کہ مسلم پرسنل لا بورڈ ہندوستان میں ملت کے مسائل کو حل کرنے کے لئے شریعت اسلامی کے احکامات کے دائرہ میں دستوری اور جمہوری طریق کار ہی کو اختیار کرنا مناسب اور بہتر سمجھتا رہا ہے، اور یہی اس کے پیش نظر اب بھی ہے، ملت کے مسائل کو دیگر مختلف

طریقوں سے حل کرنے کے لئے مسلمانوں کی سیاسی جماعتیں ہوسکتی ہیں، ان کی ایک مشترک جماعت "مسلم مجلس مشاورت" اور کچھ مدّت سے "آل انڈیا ملّی کونسل" بھی ہے، جو اپنے اپنے انداز سے ذمّہ داریاں انجام دیتی ہیں، مسلم پرسنل لا بورڈ ان جماعتوں سے مخاصمت نہیں رکھتا، کیوں کہ ہر ایک کا اپنا طریق کار ہے، پرسنل لا بورڈ کے متعدد ذمّہ دار ارکان بھی ان جماعتوں میں ہیں جو ان کے پلیٹ فارموں سے طریق کار کی ترجمانی کرتے ہیں، بورڈ کے اور ان تنظیموں کے بعض اوقات ایک جگہ جلسے ہونے سے یہ اشتباہ اور قوی ہوجاتا ہے، بس نے پرسنل لا بورڈ سے اپنے کو اس وجہ سے وابستہ رکھا ہے کہ وہ ملّت کا ایک فعّال اور نمائندہ پلیٹ فارم ہے اور زیادہ تر علماء پر مشتمل ہے اور اس کا مرکزی موضوع حفاظت قانون شریعت، اصلاح معاشرہ اور مسلمانوں میں دینی، ملّی اور معتدل اور تعمیری سیاسی شعور پیدا کرنا ہے[1]۔"

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی ایک اہم میٹنگ اور ایک اہم اور ضروری اقدام

دہلی میں ۹ جنوری کو مسلم پرسنل لا بورڈ کی میٹنگ میں، رکنی کمیٹی کی تشکیل ایسی عجلت میں اور ایک ایسی جذباتی فضا میں عمل میں آئی تھی کہ اس سے مسلم پرسنل لا بورڈ کے مزاج و روایات سے ہٹ کر بابری مسجد کی تحریک چلانے اور خود پرسنل لا بورڈ کے بارہ میں غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، مزید برآں بعض ہندی کثیر الاشاعت

---

[1] "قومی آواز" ۱۳ ر اپریل ۱۹۹۳ء ملخصاً۔

تحریکی مزاج رکھنے والی تنظیموں اور مجالس کے ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں جلسوں کے انعقاد سے غلط فہمیوں اور دونوں کے ایک دوسرے میں ادغام یا مکمل وابستگی کا تاثر پیدا ہونے کا اندیشہ ہو گیا، ضرورت تھی کہ ان تنظیمات و مجالس کی ضرورت و افادیت کے اعتراف و احترام اور بوقت ضرورت و بقدر ضرورت ان کے ساتھ تعاون اور ان کی اعانت کے ـــــ امکان و جواز کے ساتھ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا تشخص اس کی انفرادیت اور اس کے دائرہ کار و طریقہ کار کا تعیّن واضح رہے۔

اس ضرورت کے پیش نظر اور اس کے ساتھ نئے حالات و مسائل کا جائزہ لینے کے لئے مجلس عاملہ کی میٹنگ بلانے کا فیصلہ ہوا اور اس کے لئے ۱۵ مئی ۱۹۹۳ء کی تاریخ اور لکھنؤ کا مقام طے ہوا اور بعض مصالح کے پیش نظر یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ اس میں صرف عاملہ کے ارکان شریک ہوں، مولانا سید نظام الدین صاحب جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی دعوت و اطلاع پر، بورڈ کے تقریباً تمام ارکان تاریخ مقرر پر لکھنؤ تشریف لائے اور دار العلوم ندوۃ العلماء میں (مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کے ہال میں) مجلس عاملہ کی میٹنگ منعقد ہوئی، اجلاس نے سات رکنی کمیٹی کا نام بدل کر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ (برائے بازیابی بابری مسجد) کمیٹی تشکیل دی اور اس کے ارکان میں آٹھ ارکان کا اضافہ کیا اور طے کیا کہ کمیٹی کا دائرہ کار صرف بابری مسجد ہو گا، اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے معروف موقف کے دائرہ میں کمیٹی کام کرے گی یہ بھی طے کیا گیا کہ بورڈ بابری مسجد کی بازیابی کے لئے اپنی جدّ و جہد جاری رکھے گا، کمیٹی کے کنوینر بدستور جناب

ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب رہیں گے اور اس کا صدر دفتر دہلی ہوگا، راقم نے اس کی صاف طریقہ پر وضاحت کی کہ بورڈ واضح دینی و شرعی مقاصد کی تکمیل کے لئے بنایا گیا ہے، اس کا طریقہ کار اور لب ولہجہ بھی دینی و دعوتی ہونا چاہیے، ساتھ ہی اس کمیٹی اور بورڈ کو اس انداز سے کام کرنا چاہیئے کہ وہ خود مختار معلوم ہو، کسی دوسرے ادارہ یا تحریک کا تابع نہ معلوم ہو۔

اصلاح معاشرہ کے موضوع پر بحث کے دوران طے کیا گیا کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل کردہ اصلاح معاشرہ کمیٹی جلسوں اور کانفرنسوں کا انعقاد کرے اور بورڈ کے فیصلہ کو روبعمل لائے، بورڈ کے خلاف دائر مقدمات کا بھی جائزہ لیا گیا اور قانونی جائزہ کمیٹی کو مشورہ دیا گیا کہ کمیٹی بلاکر بورڈ کی طرف سے قانونی تیاری جلد مکمل کی جائے، تدوین قوانین اسلامی کا جو اہم کام بانی مسلم پرسنل لا بورڈ امیر شریعت جناب مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحب نے شروع کرایا تھا، اور جس پر حال میں نظر ثانی کا کام ہوا ہے، اس کی کتابت کا کام شروع کرادیا جائے، اور بقیہ حصّہ پر نظر ثانی کا کام جلد مکمل کر لیا جائے، اس علمی دستاویز کا انگریزی اور ہندی ترجمہ بھی ہوگا تاکہ عدالتیں اور قانون داں حضرات اس سے استفادہ کر سکیں اور اسلامی اور عائلی قانون کے سلسلہ میں اس کو سند کا درجہ دیں۔

بورڈ کی اس میٹنگ اور اس کے ان فیصلوں سے جن میں حقیقت پسندی سے کام لیا گیا اور بورڈ کے تشخّص و انفرادیت کے اظہار کی مخلصانہ کوشش اور اس کے اس طریقۂ کار کی وضاحت کی گئی جو شروع سے اس کا شعار اور امتیاز رہا ہے اور جس کی وجہ سے وہ کامیابی حاصل ہوئی جو اس دور اخیر کی کم عوامی اور مذہبی تحریکوں کو

حاصل ہوئی ہے، بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگیا ہے اور بورڈ بہت سے ان اعتراضات، شبہات اور بدگمانیوں سے بچ گیا جو دہلی کی مجلس عاملہ کی میٹنگ کے بعد سے عام رواج و مزاج کے مطابق اس کے بارہ میں کی جا رہی تھیں۔

چند حوادث و وفیات

کتاب میں چونکہ اس کا التزام کیا گیا ہے (چونکہ وہ ایک شخصی داستانِ حیات اور کاروانِ زندگی ہے) کہ مصنّف سے تعلق رکھنے والے حلقہ میں جو اہم حوادث و وفیات ہوں ان کا اور ان کے اثر کا بھی ذکر کر دیا جائے اس لئے کتاب ختم کرنے اور اس مضمون جس میں ہندوستانی مسلمانوں کو کتاب و سنّت کی روشنی، دین کی تعلیمات اور تاریخ کے تجربوں کی رہنمائی میں ہندوستان میں رہنے، اپنا تشخّص برقرار رکھنے اور اپنی ضرورت و افادیت ثابت کرنے کے لئے مشورے دیئے گئے ہیں، تین حوادث کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ایک اپنے عزیز رفیق کار و معاون اور عربی کے فاضل اور راقم اور اس سے متعلق مجالس اور تنظیمات کے سلسلہ میں معاون خاص اور لائق ترجمان مولوی عبدالنور صاحب ندوی معروف بہ نور عظیم صاحب ندوی کا حادثۂ وفات ہے، جو ۷ر شعبان ۱۴۱۳ھ ۳۱ر جنوری ۱۹۹۳ء کو پیش آیا، موصوف دارالعلوم ندوۃ العلماء اور جامع ازہر کے ممتاز فاضل، ندوہ کے فکر و خصوصیات کے حامل، عربی زبان پر تقریراً و تحریراً اچھی قدرت رکھنے والے، عالمی رابطۂ ادب اسلامی کے ایک سرگرم کارکن تھے، ادبی و علمی مجالس کو کنڈکٹ کرنے کی ان میں غیر معمولی صلاحیت تھی، اور

وہ راقم اور رابطۂ ادب اسلامی کے سکریٹری جنرل مولوی محمد رابع ندوی کے معاون خاص اور شریک کار تھے، وہ ترکی کے رابطۂ ادب اسلامی کے جلسہ اور ہندوستان کے مختلف مقامات پر ہونے والے جلسوں کے منتظم کرنے والے اور ان کو صحیح رُخ پر چلانے والے اور ان کو مفید بنانے کی خصوصی صلاحیت رکھنے والے فاضل وادیب تھے، تحریری طور پر بھی وہ راقم کی اور ندوۃ العلماء کی قابل اعتماد ترجمانی کرنے والے تھے، تقدیر الٰہی کہ وہ بعض سخت امراض میں مبتلا ہوئے، کئی ہفتے سنجے ہاسپٹل میں داخل رہے، پھر دارالعلوم میں اپنی قیام گاہ پر واپس ہوئے، اور ۷ر شعبان ۱۴۱۳ھ (۳۱ر جنوری ۱۹۹۳ء) کو اچانک داغ مفارقت دیا، راقم رائے بریلی میں یہ خبر سن کر لکھنؤ آیا اور ان کی نماز جنازہ پڑھانے کی سعادت حاصل کی اور ڈالی گنج کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے، انھوں نے اپنے پیچھے ایک فرزند ذکی نور عظیم اور اہلیہ اور لڑکیاں چھوڑیں غفر اللہ لہٗ۔

دوسرا حادثۂ جانکاہ برادر زادۂ عزیز، فخر خاندان بلکہ فخر ہندوستان[1] سید محمد الحسنی مرحوم کی بیوہ اور عزیزان عزیز القدر مولوی عبداللہ حسنی، عمار عبدالعلی اور بلال عبدالحی کی والدہ کے انتقال کا واقعہ ہے، جنھوں نے تین[۳] ہی چار[۴] روز بیمار رہ کر اور سخت تکلیف اٹھاکر ۲۴ر شوال ۱۴۱۳ھ (۱۷ر اپریل ۱۹۹۳ء) کو پورے خاندان کو داغ مفارقت دیا اور نہ صرف اپنے بوڑھے ماں باپ بلکہ اپنے لائق اور فخر زمانہ شوہر محمد میاں کے قدر دانوں کو

[1] اس کے ثبوت اور تصدیق کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "پرانے چراغ" کے دوسرے حصہ کا مضمون جو مرحوم پر ہے۔

اس کا صدمہ ہوا، جس کا اظہار مؤثر اور کثیر التعداد تعزیتی خطوط سے ہوتا ہے۔

تیسرا حادثہ جو ان سطور کے تحریر کے وقت تار کے ذریعہ معلوم ہوا وہ ۱۱ر مئی ۱۹۹۳ء کو مدراس میں مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاری کی وفات کا حادثہ ہے، جو راقم کے قدیم مخلص دوست اور دیوبند میں مولانا مدنی کے درسِ حدیث اور لاہور میں مولانا احمد علی کے درس قرآن میں اس کے رفیق رہ چکے تھے، اور جو دینی رہنمائی کے ساتھ روحانی تربیت اور سلوک کا بھی ذوق رکھتے تھے اور ان سے مدراس سے متصل رائے چوٹی (آندھرا پردیش) کے علاقہ میں دینی وروحانی فائدہ پہنچ رہا تھا۔ غفر اللہ لہ ورفع درجاتہ۔

چند اقتباسات اور خطابات

اس موقع پر مسلمانوں کی موجودہ صورت حال، ذہنی انتشار واضطراب اور مخالفین کی عمیق ووسیع سازشوں، پروپیگنڈہ اور مساعی کو سامنے رکھتے ہوئے چند خطابات کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے جو حالات کے لحاظ سے ضروری تھے۔

ایک نیا چیلنج اور اس کا مقابلہ[1]

صدیوں کے بعد یہ بات پیش آئی ہے کہ یہودی دماغ اور عیسائی طاقت

[1] یہ تقریر دار العلوم ندوۃ العلماء کی انجمن الاصلاح میں ۱۴ر مئی ۱۹۹۳ء میں کی گئی۔

دونوں متحد ہوگئے ہیں، حالانکہ دو مذہبوں میں جو زیادہ سے زیادہ تضاد ہو سکتا ہے، وہ یہودیت اور عیسائیت میں ہے، عیسائیت کی بنیاد اس پر ہے کہ مسیح "ابن اللہ" ہیں، اور یہودی حضرت مسیح پر نسبی تہمت لگاتے ہیں، جو کوئی عیسائی برداشت نہیں کر سکتا تھا، لیکن اس کو فراموش کر دیا گیا یہاں تک کہ پاپائے اعظم نے یہودیوں کے قصور کو معاف کر دیا۔

اس وقت یہ ایک بڑی گہری سازش ہے جس کا عنوان اختیار کیا گیا ہے، روس کے زوال کے بعد امریکہ، برطانیہ اور ساری یورپ کی طاقتوں نے سمجھ لیا ہے کہ اگر اب خطرہ ہو سکتا ہے اور کوئی حریف میدان میں آسکتا ہے تو وہ صرف اسلام اور مسلمان ہیں، اس لئے انھوں نے بڑی ہوشیاری سے (اور اس میں یہودی دماغ کا زیادہ حصّہ ہے) اس کو عنوان دیا ہے (FUNDAMENTALIST) کا یعنی اصول پرست، قدامت پرست، بنیاد پرست اور قدیم ذخیرہ کے پرستار، ہمارے بچپن میں اس مقصد کے لئے "دقیانوسی" کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی، یعنی لکیر کا فقیر اور ہر پرانی چیز کا حامی اور پرستار، اسی طرح اس وقت اس "دقیانوسی" کی اصطلاح کی جگہ پر (FUNDAMENTALIST) کی اصطلاح استعمال کی جارہی ہے، اور اس کا اس قدر پروپیگنڈا ہے، اور اس زور وشور، بلند آہنگی اور منظم طریقہ پر یہ بات کہی جارہی ہے کہ آدمی کے لئے مشکل ہوگیا ہے کہ وہ اقرار کرلے اور کہے کہ میں (FUNDAMENTALIST) ہوں، حالانکہ ایک مذہبی آدمی کے لئے دینی عقائد، معیّن شریعت، کچھ مسلّمات وقطعیات اخلاقی اصول اور بلند معیار کا پابند ہونا ضروری ہے اور (FUNDAMENTALIST) کے معنی ہی یہی ہیں کہ وہ منصوصاتِ قطعیہ پر آسمانی

صحیفوں پر اور کتاب اللہ میں آئی ہوئی باتوں پر (اگر وہ عیسائی ہے تو انجیل پر) اور اگر مسلمان ہے تو اللہ کے آخری کلام قرآن مجید کے بیانات پر اس کی تعلیمات اور اس کے احکام پر یقین رکھے۔

اس وقت (FUNDAMENTALIST) کی اصطلاح اتنی عام ہو گئی ہے کہ اب یہ اصطلاح ممالک عربیہ میں پہنچا دی گئی ہے، وہاں اس کے لئے "مبدئین" "رجعیین" "متزمتین" "منطرفین" کے الفاظ پہلے سے موجود تھے، اور اس کے مقابلہ میں "متنورین" اور "تقدمیین" (روشن خیال اور ترقی پسند) کے الفاظ اہلِ قلم اور مقررین استعمال کرتے تھے، ابھی ہمارے پاس ایک عرب علاقہ سے خط آیا ہے کہ متشددین کے بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟ ہم چند مفکرین اور علماء کے نام ایک سوال نامہ بھیج رہے ہیں کہ جو احکامِ شریعت اور اسلام کی تعلیمات کے مطابق حکومت اور معاشرہ کو ڈھالنا چاہتے ہیں، اور اسلامی قانون کے نفاذ کا مطالبہ کرتے ہیں، ان کے بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟

(FUNDAMENTALIST) کا ترجمہ تو اصل میں "مبدئین" ہے جو بنیادی اصول پر یقین رکھتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کا سارا فساد یہ ہے کہ کسی اصول پر، کسی بنیاد پر یقین نہیں ہے، خالص نفس پرستی ہے اور اپنے نفس کی تسکین کا سامان کرنا ہے وہ خواہ تمام مسلمہ اصولوں کے خلاف ہو اور پورے معاشرہ پر، انسانیت پر، عہد پر اس کا خواہ کچھ بھی اثر پڑے لیکن اپنا کام نکالنا ہے، یہ معنی تھے بے اصولی کے اور اسی بے اصولی نے دنیا کو آج اس جگہ پہنچا دیا ہے کہ کسی وقت بھی اس کی قیامت آسکتی ہے، اصل قیامت تو اللہ تعالیٰ اپنے وقت پر لائے گا لیکن قیامتِ صغریٰ کسی بھی وقت ہو سکتی ہے، پہلی جنگِ عظیم بھی ایک طرح کی قیامت صغریٰ تھی،

دوسری جنگِ عظیم بھی، ایسی جنگیں پھر ہو سکتی ہیں، اور اس سے بڑے پیمانہ پر ہو سکتی ہیں، وہ صرف برطانیہ اور جرمنی کی جنگ تھی، اس میں کچھ اور طاقتیں شامل ہو گئی تھیں، اور دوسری جنگ بھی ایسی تھی، اس وقت ایٹمی ہتھیار بھی نہیں تھے، اب ایٹمی ہتھیار بھی ہیں، دوسرے اس جنگ کا رقبہ اس سے کہیں زیادہ ہو گا، اور وہ سب نتیجہ ہو گا بے اصولی کا، نفس پرستی کا، مطلق آزادی کا اور دین سے دوری کا، لیکن ان ترقی پسندوں اور اسلام دشمنوں کو شرم نہیں آتی انھوں نے یہ اصطلاح ایجاد کی حالانکہ سارا فساد ہی یہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

"ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ
لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ"[1]

یہ کیا ہے؟ قرآن مجید کی اس آیت کے پورے سیاق وسباق پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ "ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ" میں "بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ" جو کہا ہے اس میں یہی بے اصولی، نفس پرستی، "مکمل آزادی" ہر طرح کی چھوٹ اور نفس کی تسکین کا ہر قیمت پر سامان کرنا ہے (FUNDAMENTALIST) کے منکروں کے خیالات اور ان کے مقاصد میں اور ان کی دعوت میں یہ ساری چیزیں موجود ہیں جس کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ" خیال تو کیجئے قرآن مجید کی بلاغت کا کہ اس کی نسبت "أَيْدِي النَّاسِ" کی طرف کی ہے، اس کی نسبت کسی اور کی طرف نہیں کی "بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ" جو لوگوں کے ہاتھوں نے کیا ہے، ان لوگوں کے ہاتھوں نے کیا ہے جو کسی اصول پر ایمان نہیں رکھتے

---

[1] سورۂ روم آیت ۴۱

کسی بنیاد پر ان کا اتفاق نہیں تھا، ان کے لئے کوئی حدود مقرر نہیں تھیں کہ یہاں تک جائیں گے، اور اس کے بعد آگے نہیں جائیں گے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ وقت بڑا نازک اور خطرناک ہے، اس میں تحریری صلاحیت، بیانی صلاحیت، خطابت کی صلاحیت، تفہیم کی صلاحیت، نیا دلائے خیال کی صلاحیت، ان سب چیزوں کی ضرورت ہے، یہ ایک عالمی سازش ہے جو وسیع پیمانہ پر بھی ہے اور نہایت گہرے پیمانہ پر بھی، اس کے مضمرات بہت دقیق اور عمیق ہیں، اتنی بڑی سازش کم سے کم میرے محدود مطالعہ میں نہیں ہوئی ہے، یہودی و عیسائی اس پر متحد ہو گئے ہیں کہ دنیا میں (FUNDAMENTALIST) کا مقابلہ کیا جائے یعنی کوئی اصول ہی باقی نہ رہے، حدود بھی باقی نہ رہیں، سب کر سکتے ہو، جیسا کہ یونان کا ایک فلسفہ تھا لذّتیت (عربی میں ابیقوریة) (EPICUREANISM) اس کا تاریخ اخلاق یورپ میں اسی طرح ذکر آتا ہے، لذّتیت کے معنی یہ تھے کہ جس میں مزہ آئے وہ کرنا چاہیئے، آج کا یورپ گویا بالکل اسی انداز سے سوچ رہا ہے، یورپ کا پورا دماغ گویا لذّتی ہی بن کر رہ گیا ہے، جس میں مزہ آئے، جس میں فائدہ ہو وہ کرو، البتہ لذّت کو انھوں نے اور وسیع کر دیا ہے کہ لذّت بطن یا لذّت لسان ہی نہیں بلکہ وہ لذّتِ ذہن بھی ہے، لذتِ سیاسی بھی اور لذتِ سائنسی بھی اس میں شامل ہے، اور وہ جو ایک فاتحانہ خوشی ہوتی ہے وہ بھی اس میں شامل ہے، یہ اس وقت کی اتنی گہری سازش ہے جس سے بڑھ کر کوئی سازش نہیں اور اس کے آثار نظر آرہے ہیں، عرب ممالک میں بھی، خلیج میں بھی یہ بات اب داخل ہو گئی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ متشدّدین کا مقابلہ کرنا چاہیئے، الجزائر، تونس اور لیبیا میں تو یہ معرکہ پہلے سے گرم تھا اور

وہاں مذہبی جذبہ، وسیع دینداری، اور اسلام کے غلبہ کی کوشش کے خلاف صلیبی جنگ ہو رہی ہے۔

متشدّدین کی کیا مانگیں ہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ معاشرہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہو، اس میں خوف خدا ہو، خوف آخرت ہو، اس میں دوسروں کے حقوق کا لحاظ ہو، جو لوگ "احکام شرعیہ" کو جاری کرنا چاہتے ہیں (تعزیرات تو بڑی چیزیں ہیں) جو روزمرہ کے حالات میں اور قابلِ عمل حدود کے اندر احکام شرعیہ کا اجراء چاہتے ہیں، ان سے بھی حکومتیں ڈر رہی ہیں اور وہاں سے نکلنے والے اخبارات اور وہاں سے آنے والے خطوط سے یہ حقیقت جھلکتی ہے۔

امریکہ اور برطانیہ (FUNDAMENTALIST) کے بارہ میں بالکل اسی طرح سوچ رہا ہے، پروپیگنڈا کر رہا ہے بلکہ اس کی صدائے بازگشت اب مشرقی ممالک سے بھی آرہی ہے۔

یہ ایک بڑی اور گہری سازش ہے جس کے لئے آپ کو بڑے پیمانہ پر عملی تیاری کرنی ہے، عقیدہ، ایمان، تعلق مع اللہ، دین کی پابندی اور آخرت کے خیال کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ یہ سب "بنیادی" باتیں ہیں، دقیانوسی خیالات ہیں، فرسودہ باتیں ہیں، یہ لوگ حرام وحلال، طاعت ومعصیت ومعروف ومنکر کے فرق کو ختم کردینا چاہتے ہیں، اس کے مقابلہ کے لئے عالمِ اسلام کے عالموں، دانشوروں، ادیبوں، اہلِ قلم واہلِ صحافت اور قائدین کو ایک منظم اور طاقتور محاذ قائم کرنا ہے، ورنہ دینی بنیادیں ہی متزلزل نہیں ہوں گی، نظامِ عالم اور امنِ عالم بھی متزلزل ہو جائے گا، اور مذاہب ہی نہیں پورا نظامِ عالم خطرہ میں پڑجائے گا، اور وہ

اقرانقری، انارکی، اور اجتماعی و عالمی خودکشی کی صورت پیدا ہوگی کہ دنیا کی اس بساط کو الٹ کر رکھ دینا ہی مناسب معلوم ہوگا۔

ملّی تشخّص کی حفاظت

جہاں تک ملّتِ اسلامیہ کا تعلق ہے اس کے لئے محض جسمانی و نسلی بقا و تسلسل، جان و مال کا تحفّظ، تعلیمی، اقتصادی، سیاسی اور جمہوری مواقع و منافع سے انتفاع و استفادہ کی آزادی اور اس سے بھی بڑھ کر کسی جمہوری ملک میں انتظامیہ و حکومت میں شرکت و حصہ داری بھی قطعاً کافی نہیں، اور یہ ایک صاحبِ عقیدہ، صاحبِ دعوت و پیغام اور مثالی اُمّت کے شایانِ شان نہیں، اس کے لئے ہر دور اور ہر ملک میں "ملّی تشخّص" کا برقرار رہنا، شعائرِ اسلام کا حامل ہونا، اپنے دینی عقائد کے مطابق زندگی گزار سکنا، دینی احکام پر عمل کی آزادی، عائلی قانون کا تحفّظ، مخصوص تہذیب و معاشرت کے مطابق زندگی گزارنا، بلکہ اس مخصوص زبان و ثقافت کا محفوظ رہنا بھی ضروری ہے جو اس کے اپنے دین سے واقف اور اپنے ماضی سے مربوط ہونے کا ذریعہ ہے، اگر اس کے ملّی تشخّص کی یہ ضمانتیں اور شرائط مفقود ہو جائیں تو کسی ایسے ملک یا ماحول میں ملّتِ اسلامیہ کو آزاد، محفوظ، باعزّت اور جمہوری زندگی کا شریک و رکن باور نہیں کیا جا سکتا۔

خاص طور پر ایک ایسے ملک میں جو اپنے مزاج، روایات، مذہبی ساخت اور ہزاروں برس سے ایک قطعۂ زمین میں محصور ہونے اور باہر کی متمدّن دنیا سے کٹے رہنے کی وجہ سے دوسرے مذاہب و ادیان، تہذیبوں اور ثقافتوں (CULTURES)

کو اپنے مذہب و تہذیب اور طریقۂ زندگی میں تحلیل کرنے کے لئے معروف و مشہور ہو، وہاں اس اجتماعی و معنوی تشخّص کو برقرار رکھنے کے لئے غیر معمولی جد وجہد اور ہمہ وقت بیداری و مستعدی کی ضرورت ہے، خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم نے ہندوستان اور اس کی تہذیب و مزاج کو "أکّال الأمم" کا خطاب دیا تھا،[۱] یعنی جو قوم یہاں آئی وہ تحلیل ہوگئی اور اس نے اپنی قومی خصوصیات و امتیازات کو کھو دیا اور "ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد" کا منظر سامنے آتا رہا، ایسے ملک میں ملّی تشخّص اور دینی و تہذیبی ذکاوتِ حس (SENSITIVENESS) اور حقیقت پسندانہ محاسبہ اور احتسابِ قومی کی دوسرے ممالک کے مقابلہ میں زیادہ ضرورت ہے۔

پھر جب اس ملک میں جہاں خاص تاریخی، سیاسی انتخابی اسباب کی بنا پر اور غیر ملکی سازش کے ماتحت تاریخ کی منافرت انگیز ترتیب عمل میں آئی ہو اور وہاں کم سے کم تہذیبی و ثقافتی اور معنوی نسل کشی کا کام ایک مرتب منصوبہ اور ایک قومی فیصلہ کے انداز میں شروع ہو گیا ہو، جس کی تفصیل اوپر کے صفحات میں فرقہ پرست جماعتوں کے رہنماؤں کے اعلانات کی شکل میں آچکی ہے،[۲] تو وہاں یہ ذمّہ داری دو چند بلکہ دہ چند ہو جاتی ہے، اور اس فرض کی ادائیگی میں ذرا سی غفلت یا مداہنت ملّت کو اگر دینی نہیں تو ذہنی اور تہذیبی ارتداد میں مبتلا کر سکتی ہے، اور (خاکم بدہن) ایک ایسے ملک کو جہاں ملّتِ اسلامیہ کے ایک حصّہ نے صدیوں حکومت کی اور ملک کو عقیدۂ توحید، مساوات، احترامِ انسانیت اور نئے علوم، آداب و افکار سے

---

[۱] علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی اپنے بعض خطوط میں ایسا ہی لکھا ہے۔ [۲] ملاحظہ ہوں گرو گول والکر اور بال ٹھاکرے کے وہ اعلانات اور منصوبے جن کا تذکرہ پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے۔

نہ صرف آشنا کیا بلکہ مالا مال کیا، اسپین بنا سکتی ہے۔

یہ خطرہ اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب ملّتِ اسلامیہ میں کچھ ایسے افراد (خواہ وہ کیسی ہی قلیل تعداد میں ہوں) میدان میں آجائیں جو "ملّی تشخص" کی ضرورت کا انکار کریں، اور اس کو نہ صرف غیر ضروری بلکہ ملک کے لئے بھی، ملّت کے لئے بھی مضر بتانے لگیں وہ دین کے کسی حصّہ اور مطالبہ کی تکمیل اور اس کے لئے سعی وجہد کو انتشار انگیزی ہی سے تعبیر نہ کرنے لگیں بلکہ اس کو ملّت اور اس کے قائدین کی سادہ لوحی، جذباتیت اور نافہمی پر محمول کریں، یہاں تک کہ مسلمانوں کے عائلی قانون کے تحفّظ کے لئے بھی جو کامیاب اور نتیجہ خیز جدّوجہد کی گئی، اس کو بھی ایک بے ضرورت کام اور وقت وقوّت کی اضاعت کا مرادف بتائیں، وہاں اس ملّی تشخّص کو (اپنے تمام شعبوں کے ساتھ) برقرار رکھنے اور اس کی حفاظت کے سلسلہ میں بیدار مغزی، مستعدی اور دینی حمیّت کی اور زیادہ ضرورت ہے۔

آج سے تیرہ ۱۳ سال پہلے دار العلوم دیوبند کے صد سالہ جشن کے موقع پر جو مارچ ۱۹۸۰ء میں منعقد ہوا تھا، اور جب ایسے خطرات واعلانات واضح طور پر سامنے نہیں آئے تھے، راقم الحروف نے اس مجمع عظیم کے سامنے جو لاکھوں سامعین پر مشتمل تھا، اپنی تقریر میں کہا تھا:۔

"ہم صاف اعلان کرتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی اعلان کریں کہ ہم ایسے جانوروں کی زندگی گزارنے پر ہرگز راضی نہیں جن کو صرف راتب (RATION) اور تحفّظ (SECURITY) چاہیئے، ہم ہزار بار ایسی زندگی گزارنے اور ایسی حیثیت قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں، ہم اس سرزمین پر اپنی اذانوں

اور نمازوں کے ساتھ رہیں گے، بلکہ ہم تراویح اور اشراق و تہجد ادا کرنے کی آزادی کو بھی چھوڑنے کے لئے راضی نہیں، ہم ایک ایک سنّت کو سینہ سے لگا کر رہیں گے اور رسول اکرمؐ کی سیرت کو سامنے رکھ کر کسی ایک نقش بلکہ کسی نقطہ سے بھی دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں"۔[۱]

اس سے بھی پیشتر جب ۱۹۷۹ء میں شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کی کتاب "اقتضاء الصراط المستقیم مخالفۃ أصحاب الجحیم" کا ترجمہ "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" ندوۃ العلماء کی طرف سے "اسلام اور غیر اسلامی تہذیب" کے نام سے شائع ہوا[۲] تو راقم نے اس کے پیش لفظ میں جو لکھا تھا اس کا ایک حصّہ یہاں نقل کیا جاتا ہے کہ اس سے تہذیب و معاشرت اور شعائر و عادات کے نفسیاتی اور عمیق و وسیع اثرات کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے:۔

"علم جدید اور انفرادی و اجتماعی نفسیات کے مطالعہ نے اب جو چند حقیقتیں عالم آشکارا کر دی ہیں، اور تہذیب و معاشرت، شعائر اور عادات و خصائص کے جن اثرات کا مکرر و مسلسل تجربہ خصوصیت کے ساتھ اس صدی کے آغاز سے ہو رہا ہے، اس نے اس حقیقت کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے کہ تہذیبوں اور معاشرتوں کا مسئلہ اتنا سرسری اور سطحی نہیں جتنا کچھ عرصہ قبل سمجھا جاتا رہا اور جیسا کہ اس صدی کے آغاز میں

---

[۱] ماخوذ از رسالہ: "زندہ رہنا ہے تو میر کارواں بن کر رہو" ص۱۷ شائع کردہ مکتبۂ فردوس لکھنؤ۔

[۲] یہ ترجمہ مولوی شمس تبریز خاں صاحب کے قلم سے ہے جو اُس وقت "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کے رفیق تھے۔

مغربی تہذیب اختیار کرنے کی دعوت دینے والوں اور اس صدی کے وسط
میں قومی یکجہتی کے علم برداروں نے پیش کیا، اب یہ بات مسلّمہ حقیقت بن گئی
ہے کہ عادات و معمولات، میلانات و رجحانات قلب و دماغ میں اپنی
گہری جڑیں رکھتے ہیں، اور اقوام و ملل کی صورت گری اور شخصیات سازی
میں ان کا بڑا گہرا اثر ہے، تہذیب، جذبات و رجحانات، پسندیدگی و
ناپسندیدگی اور ذہنی رویّہ کی بیرونی شکل ہوتی ہے، تہذیب کے مضمرات
اور اس کے عناصر ترکیبی کو کسی خوردبین سے بھی نہیں دیکھا جا سکتا، اس کے
خمیر میں شرک، جہل، ظلم، تکبّر، تعیّش کے رجحانات اور غفلت کے
عناصر و اجزا کس تناسب سے شامل ہیں، اور وہ اس کا کیا جزو لاینفک
بن گئے ہیں، اس تہذیب نے کن فکری، نفسیاتی، اخلاقی، سیاسی
و اقتصادی حالات میں پرورش پائی ہے، اور ارتقاء کے منازل طے کئے
ہیں، اور انھوں نے اس پر اپنی کیسی گہری چھاپ اور انمٹ نقش چھوڑا
ہے، اس کی تحلیل و تجزیہ کا کام فلسفۂ اجتماعیات کے بڑے سے بڑے
عالم و مؤرخ کے لئے بھی آسان نہیں ہے، اور اس کے لئے ابھی تک کوئی
کیمیاوی معمل (LABORATORY) قائم نہیں ہوا، جہاں اس کے تجزیہ
و تحقیق کا کام کامیابی کے ساتھ انجام دیا جا سکے، اخذ و قبول اور تقلید
و اقتباس کا عمل جو تہذیبوں اور معاشرتوں کے میدان میں انجام پاتا
ہے، ملّت کی نفسیات پر کس قدر اثر انداز ہوتا ہے، اس کو اپنے اصل مقام
سے کس قدر ہٹا دیتا ہے، برّ و اِثم، طاعت و معصیت، اسلام و جاہلیت،

حیا و بے حیائی، عدل و ظلم اور قناعت و اسراف کے پیمانے اس سے کس طرح بدل جاتے ہیں، اور وہ ملّت اپنی ظاہری شکل اور خول میں رہتے ہوئے اندر سے کس قدر تبدیل ہو جاتی ہے، اس کا صحیح اندازہ کرنا بڑے سے بڑے باریک بیں رہنما اور مصلح کے لئے بھی ممکن نہیں، یہ خدائے علیم و خبیر ہی کی ذات ہے، جو دین و شریعت اور کتاب الٰہی کے نصوص و احکام کے ذریعہ اس ملت کی حفاظت کا انتظام کرتی ہے، جس کو دنیا میں اپنی جداگانہ شخصیت کے ساتھ باقی رکھنا اور اس سے دعوت و رہنمائی کا کام لینا ہوتا ہے، مشابہت و تقلید کے بارہ میں اسلام کی بڑھی ہوئی احتیاط اور اسلامی تعلیمات کا زیادہ مفصل و معیّن ہونا اور ان پر شریعتِ اسلامی کا اصرار اس بات کا نتیجہ ہے کہ اسلام محض چند عقائد و رسوم کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ پورے مسلکِ زندگی کا حامل و داعی ہے اور وہ "صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً" کا نعرہ لگاتا ہے اور ہر اس تہذیب و معاشرت کو "جاہلیت" کا نام دیتا ہے جس کا سرچشمہ حکمِ الٰہی اور ہدایتِ ربّانی کے بجائے ہوا و ہوس، مصلحت و مفاد، لذّت و عزّت یا محض تجربہ و قیاس ہو، اس نے پہلی مرتبہ اس حقیقت سے نقاب کشائی کی ہے کہ کوئی انسانی فرد مجرد عقائد پر زندگی نہیں گزار سکتا، اور تہذیب و معاشرت کو عادات و اخلاق اور عقائد و عبادات پر اثر انداز ہونے سے روکا نہیں جا سکتا، ان دونوں کے درمیان دیوار کھڑی کرنے کی کوشش غیر فطری ہے، جو نشأۃ ثانیہ کے موقع پر

مغربی تہذیب نے مذہب کو انسان کا "پرائیویٹ معاملہ" قرار دینے کی صورت میں کی، انسان کی زندگی متفرق اکائیوں کا مجموعہ نہیں جن کو جب چاہا ملا دیا، جب چاہا الگ کر دیا بلکہ وہ خود ایک اکائی ہے اور اس اکائی کو "عبودیت"، "اسلام"، "دین" اور "طاعت" کے کسی لفظ سے ادا کیا جا سکتا ہے، اور یہی تفسیر ہے فرمانِ خداوندی "يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ[1] ؀ کی"۔

کانگریس کا اجلاس عام اور اس کا التوا

کانگریس جو ایک عوامی تحریک کے بجائے صرف حکومت اور انتظامیہ میں عرصہ سے محدود ہو کر رہ گئی ہے، اور جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ کوئی بہتر انتظامیہ (ADMINISTRATION) تحریک کے قائم مقام نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ انتظامیہ سے اس کی قائم مقامی اور خانہ پُری نہیں ہو سکتی، انتظامیہ سے ہر اس شخص اور عنصر کو شکایت ہو سکتی ہے جس کا اس نے کام نہیں کیا اور اس کی مطلب برار ی نہیں ہوئی۔

شاید اخیر دنوں میں اس حقیقت کو کسی درجہ سمجھا گیا اور اس کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اس کی پچھلی تاریخ کی یاد تازہ کی جائے یا اس کے ذریعہ سے عوام میں مقبولیت حاصل کی جائے بہر حال (مقصد کچھ بھی رہا ہو) اس کا ایک عظیم

[1] سورۂ بقرہ آیت ۲۰۸

سالانہ اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور آنجہانی راجیو کی نسبت اور رشتہ سے اس کے انعقاد کے لئے موضع کٹھورا ضلع رائے بریلی کا انتخاب کیا گیا، جو ان کا حلقۂ انتخاب تھا، اور اس کے لئے ۲۹، ۳۰ رمئی ۱۹۹۳ء کی تاریخیں مقرر ہوئیں، اور وہاں اجلاس کے انعقاد کے لئے شاہی پیمانہ پر انتظامات شروع کئے گئے، سڑکیں اور ذیلی راستے بنائے گئے، پنڈال اور مہمانوں کے ٹھہرنے کے لئے اعلیٰ پیمانہ پر انتظامات کئے گئے جن پر لاکھوں روپیوں کا صرف آیا،[۱] راقم جس نے اس سے پہلے کانگریس کے متعدد سالانہ اجلاسوں کی کارروائی پڑھی اور دیکھی ہے اور ان کے اثرات سے واقف ہے، اس اجلاس کو جو کٹھورا میں ہونے والا تھا، کانگریس کا "عرس" یا راجیو کا "عرس" کہنا شروع کیا کہ وہ ایک عہد آفریں، تاریخ ساز، سیاسی اجلاس کے بجائے جس سے لوگوں کو زندگی یا جوشِ عمل کا نیا پیغام ملے بعض عظیم شخصیتوں اور راہنمایانِ ملک کے "عرس" سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے، جہاں صرف ماضی کی تاریخ دہرائی جاتی ہے، جانے والوں کے فضائل و مناقب بیان کئے جاتے ہیں اور جمع ہونے والوں کے لئے تفریح اور دلچسپی کا سامان مہیا کیا جاتا ہے۔

لیکن اچانک ۲۷ رمئی کو دن، ڈھائی بجے دن کو رائے بریلی اور اس کے اطراف میں

---

[۱] بعض اندازوں کے مطابق کروڑوں کا اس اجلاس کے شاہی انتظامات کے بارہ میں شہر رائے بریلی اور اس کے اطراف میں افسانوی طرز کی روایات مشہور تھیں، مثلاً یہ کہ مہمانوں کے لئے تیس بتیس لاکھ روپیوں کی آئس کریم کا آرڈر دیا گیا ہے، تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر ریسٹوران بنائے گئے ہیں، بیٹھنے کے لئے لکڑی کا فرش بنایا گیا ہے کہ گرمی کا زمانہ ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

شدید باد و باراں کا طوفان آیا، اور ایسی تیز ہوا چلی کہ بعض پختہ دیواریں بھی گر گئیں، جا بجا حوادث پیش آئے اور رلائے بریلی میں اموات بھی ہوئیں، اجلاس کے انتظامات جو زیادہ تر لکڑی کی چھتوں، شامیانوں، اور فرش و فروش پر مشتمل تھے، درہم برہم ہو گئے، تقدیر الٰہی سے اگلے دن ۲۸ رمئی تقریباً اسی وقت پھر تیز آندھی آئی اور بارش بھی ہوئی، جلسہ کے منتظمین اور ذمہ داروں نے اجلاس کے التوا کا فیصلہ کیا اور اس کا اعلان کر دیا بعض شخصیتوں نے جن کو پارٹی اور حکومت سے شکایت تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی اس کو "غضب الٰہی" سے تعبیر کیا، بہر حال یہ اجلاس اسی سال کے ماہ اکتوبر تک کے لئے ملتوی ہوا، اندازہ ہے کہ پچاس ہزار کروڑ کے قریب نقصان ہوا۔ والغیب عند اللہ۔

موجودہ حالات میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے راہِ عمل

اب ہم اس تصنیف میں بلکہ اس "کاروانِ فکر و خیال" اور تبلیغ و دعوت میں ایک ایسے مضمون کا اضافہ کرتے ہیں، جس میں کتاب و سنّت کی روشنی، سیرت و تاریخِ اسلام کے واقعات اور علمائے ربّانیین و مصلحین کبار کی ہدایات و تجربات کی روشنی میں وہ راہِ عمل پیش کی گئی ہے جو ہر زمانہ میں اور خاص طور پر ایسے دور اور ملک کے لئے دستور العمل اور رہنمائے طریق بن سکتی ہے اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک مشعلِ راہ

کا کام دے سکتی ہے، وبید اللہ التوفیق۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ وحدہٗ والصلاۃ والسلام علی من لا نبی بعدہٗ۔

اس وقت پورا عالمِ اسلام خاص طور پر ہمارا ملک ہندوستان (جو صدیوں تک اسلامی اقتدار، عزت وشرف اور اسلامی علوم وفنون کا مرکز رہا ہے، اور جہاں ایسی زبردست اصلاحی تحریکیں، مصلحین اور علمائے ربّانیین پیدا ہوئے جن کی دعوت واثرات عالمِ اسلام کے دور دراز ملکوں تک پہنچے) ایک ایسے آزمائشی دور سے گزر رہا ہے جس کی نظیر گزشتہ تاریخ میں صدیوں تک نہیں ملتی اس دورِ آزمائش میں مسلمانوں کا صرف ملّی تشخّص دین کی دعوت وتبلیغ کے مواقع وامکانات اور ملک ومعاشرہ کو صحیح راستہ پر لگانے اور اس کائنات کے خالق ومالک کی صحیح معرفت اور عبادت اور دینِ صحیح کی طرف رہنمائی کی صلاحیت اور استطاعت تو بڑی چیز ہے (کم سے کم اس ملک ہندوستان میں) ان کی زندگی کا تسلسل جسمانی وجود، عزت وآبرو، مساجد ومدارس اور صدیوں کا دینی وعلمی اثاثہ اور قیمتی سرمایہ بھی خطرہ میں پڑ گیا ہے، وہ نہ صرف دور دراز قصبات اور دیہاتوں میں بلکہ بڑے بڑے مرکزی شہروں میں بھی جہاں وہ بڑی تعداد میں بستے ہیں، اور ممتاز صلاحیتوں، ذہنی امتیازات اور مہارتوں کے مالک ہیں، کچھ عرصہ سے خوف وہراس کی زندگی گزار رہے ہیں، اور کہیں کہیں ان کا نقشہ بعینہٖ وہ ہو گیا ہے، جس کی تصویر قرآن مجید نے اپنے بلیغ ومعجزانہ الفاظ میں اس طرح کھینچی ہے۔

ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود

بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ (سورۂ توبہ - ۱۱۸)
ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں بھی ان پر دو بھر ہو گئیں۔

اس صورت حال کی اگر کوئی مثال پچھلی تاریخ میں مل سکتی ہے تو وہ ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) میں تاتاریوں کا ترکستان، ایران اور عراق پر حملہ ہے، جس نے شہر کے شہر بے چراغ اور تودۂ خاک بنا دیئے تھے، اور عالم اسلام کی چولیں ہل کر رہ گئی تھیں، لیکن وہ ایک نیم وحشی قوم کی فوجی یلغار تھی جس کے ساتھ کوئی دعوت، تہذیب، فلسفہ، مذہبی نفرت و تعصب اور جسمانی و معنوی نسل کشی (CULTURAL GENOCIDE) کا منصوبہ یا ارادہ نہ تھا، اور نہ وہ کسی متوازی تہذیب و فلسفہ کے حامل تھے، اس وقت خوش نصیبی سے وہ اہل دل، صاحب روحانیت، دین کے مخلص اور صاحبِ تاثیر داعی و مبلّغ بھی موجود تھے، جن کے اثر و صحبت سے پوری کی پوری تاتاری قوم (جو لاکھوں کی تعداد میں تھی) اسلام کی حلقہ بگوش ہی نہیں، دینِ حق کی حامی و محافظ اور علمبردار بن گئی اور اس نے متعدد وسیع و زبردست اسلامی سلطنتیں قائم کیں مشہور مؤرخ پروفیسر (T. W. ARNOLD) اپنی کتاب "دعوت اسلام" (PREACHING OF ISLAM) میں لکھتا ہے:-

"لیکن اسلام اپنی گذشتہ شان و شوکت کے خاکستر سے پھر اٹھا اور واعظینِ اسلام نے انھیں وحشی مغلوں کو جنھوں نے مسلمانوں پر کوئی ظلم اٹھا نہ رکھا تھا مسلمان کر لیا۔"[1]

آج کی صورتِ حال خاص طور پر جن ملکوں میں مسلمان عددی اقلیت میں ہیں، اور

[1] (T. W. ARNOLD), THE PREACHING OF ISLAM, LONDON, 1935, P. 227

ماضی میں وہ حکومت واقتدار کے منصب پر فائز رہ چکے ہیں، دوسرے اسلامی ممالک سے مختلف اور زیادہ نازک ہے، یہاں ان کی تاریخ (ایک علمی اور سیاسی سازش کے تحت) اس طرح مرتّب اور پیش کی گئی ہے کہ وہ اکثریت میں بغض ونفرت اور "انتقامی جذبہ" پیدا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے، پھر بعض اوقات ان ملکوں کی سیاسی قیادتوں یا وقتی پیش آمدہ مسائل میں مسلمانوں کی رہنمائی ونمائندگی کرنے والی تنظیموں اور جماعتوں نے غیر معتدل جذباتیت، ناعاقبت اندیشی اور نام ونمود حاصل کرنے کے شوق میں ہنگامہ خیزی سے کام لینے کی غلطی کی، وہاں مسلمان شدید مذہبی منافرت اور تعصب، تہذیبی وثقافتی محاذ آرائی (CONFRONTATION) کا شکار ہوئے، پھر نصاب تعلیم، صحافت (PRESS) اور ابلاغ عامّہ (PUBLIC MEDIA) کے ذریعہ مسلمانوں کی آئندہ نسل کو اوّلاً تہذیبی وثقافتی ارتداد، ثانیاً (خاکم بدہن) ایمانی واعتقادی ارتداد کا شکار بنانے کا منصوبہ بنایا گیا اور اس کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے، یہ حالات یقیناً نہ صرف ایمانی ومذہبی غیرت اور پختہ دینی شعور رکھنے والوں کے لئے بلکہ حالات پر سطحی نظر رکھنے والے عام مسلمانوں کے لئے بھی جو گردوپیش کے حالات کو دیکھتا، اخبارات پڑھتا اور خبریں سنتا ہے، سخت تشویش انگیز ہیں، وہ کبھی مایوسی اور بعض اوقات حالات کے سامنے سپر انداز ہو جانے پر بھی آمادہ کرتے ہیں۔

لیکن اس خدائے واحد پر ایمان رکھنے والے مسلمان کے لئے جس کے ہاتھ میں اس کارخانۂ عالم کی باگ ڈور ہے، اپنے دین کا محافظ، حق کا حامی، مظلوم کی مدد کرنے والا پامال اور خستہ حال کو اٹھانے والا اور سرکش ومتکبّر کو نیچا دکھانے والا ہے اور جس کی شان ہے کہ "أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ" (دیکھو سب مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا چلتا ہے)

کوئی انقلاب اور تغیرِ حال ناممکن نہیں، اس خدائے واحد کے بارے میں مسلمان شہادت دیتا ہے کہ:۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ	کہو کہ اے خدا (اے) بادشاہی
تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ	کے مالک! تو جس کو چاہے بادشاہی
وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ	بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی
تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ	چھین لے اور جس کو چاہے عزت
وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ	دے اور جسے چاہے ذلیل کرے
بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى	ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ تُوْلِجُ اللَّيْلَ	اور بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے
فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ	تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے
فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ	اور تو ہی دن کو رات میں داخل
الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ	کرتا ہے اور تو ہی بے جان سے
الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ	جاندار پیدا کرتا ہے اور تو ہی
بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝	جاندار سے بے جان پیدا کرتا ہے
(سورۂ آل عمران ۲۶-۲۷)	اور تو ہی جس کو چاہتا ہے بے شمار
	رزق بخشتا ہے۔

ایک ایسے موقع پر جب ایک مفتوح و مغلوب قوم کے غالب آنے اور ایک فاتح اور غالب ملک کے مغلوب ہونے کے بارہ میں نہ کوئی امید تھی نہ کوئی پیشین گوئی کی جرأت کر سکتا تھا قرآن مجید میں صاف فرمایا گیا ہے:۔

لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ	پہلے بھی اور پیچھے بھی خدا ہی کا حکم ہے
بَعْدُ ۚ وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ	اور اس روز مومن خوش ہو جائیں گے
بِنَصْرِ اللّٰهِ ۚ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ	خدا کی مدد سے وہ جسے چاہتا ہے مدد
وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ[1]	دیتا ہے اور وہ غالب اور مہربان ہے۔

لیکن اس تبدیلیٔ حال اور اس خطرہ سے بچنے کے لئے جواب مشاہدہ اور تجربہ کی شکل میں آگیا ہے کچھ خدائی قانون، اس کے بھیجے ہوئے آخری پیغمبر انسانیت کی تعلیمات اور خود اس کا اُسوہ اور سنّت اور اس کے تربیت یافتہ اصحاب کاملین کا نمونہ و عمل ہے پیش نظر

---

[1] سورۂ روم آیت ۴ ۔ ۵ ساتویں صدی کے آغاز میں ساسانی مملکت "ایران" کے بازنطینی سلطنت (روم و شام و مشرقی یورپ) پر مکمل غلبہ پانے کے بعد اس کی پسپائی اور شکست اور رومیوں کے غلبہ کی طرف اشارہ ہے ۵ سنہ بعثت نبوی اور ۶۱۶ء میں رومۃ الکبریٰ کی عین اس حالتِ نزع میں قرآن نے پیشین گوئی کی کہ رومی نو ۹ سال کے اندر غالب ہو جائیں گے اور ایسا ہی ہوا، مشہور یورپین مؤرخ ایڈورڈ گبن (EDWARD GIBBON) لکھتا ہے :۔

"محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایرانی فتوحات کے عین شباب میں پیشین گوئی کی کہ چند سال کے اندر اندر رومی جھنڈے دوبارہ فتح کے ساتھ بلند ہوں گے، جب یہ پیشین گوئی کی گئی تھی، اس سے زیادہ بعید از قیاس کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تھی، کیونکہ ہرقل کے ابتدائی بارہ ۱۲ سال سلطنت روما کی قریبی تباہی اور خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے۔"

(DECLINE & FALL OF THE ROMAN EMPIRE)

تاریخ زوال روما ج ۳ ص ۳۰۳ مطبوعہ ۱۸۹۰ء

مقالہ میں قرآن وحدیث، سیرت نبوی اور اسوۂ صحابہؓ کی روشنی میں چند شرائط وہدایات کو پیش کیا گیا ہے۔

۱۔ اس وقت دنیا کے تمام مسلمانوں اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے پہلا فرض اور ضروری کام رجوع الی اللہ، انابت، توبہ و استغفار اور دعا و ابتہال (گریہ وزاری) ہے۔

قرآن مجید کی صریح آیت ہے :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ۔ (سورۂ بقرہ ۱۵۳)	اے ایمان والو! مدد حاصل کرو صبر اور نماز سے بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا :۔

أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ (سورۂ نمل۔ ۶۲)	بھلا کون بے قرار کی التجا کو قبول کرتا ہے جب وہ اس سے دعا کرتا ہے اور کون (اس کی) تکلیف کو دور کرتا ہے اور (کون) تم کو زمین میں (اگلوں کا) جانشین بناتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا گیا :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَصُوحًا عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُكَفِّرَ عَنْكُمْ	اے ایمان والو! اللہ کے آگے سچی توبہ کرو، عجب کیا ہے کہ تمہارا پروردگار (اسی سے) تمہارے گناہ

سَيِّاٰتِكُمْ ۝ (سورہ تحریم۔ ۸) تم سے دور کردے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک تھا کہ ذرا بھی کوئی پریشانی کی بات پیش آتی تو فوراً نماز کے لئے کھڑے ہوجاتے اور دعا میں مشغول ہوجاتے، حضرت حذیفہؓ روایت کرتے ہیں :۔

کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم اذا حزبہ أمر صلّٰی[1]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب کوئی پریشانی کی بات پیش آتی تو آپ نماز شروع کردیتے۔

حضرت ابوالدرداءؓ کی روایت ہے :۔

کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم اذا کان لیلۃ ریح شدیدۃ کان مفزعہ الی المسجد حتی تسکن الریح واذا حدث فی السماء حدث من خسوف شمس أو قمر کان مفزعہ إلی الصلاۃ حتی ینجلی[2]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب تیز ہوا والی رات ہوتی تو آپ کی پناہ گاہ مسجد ہوتی، آپ وہاں اس وقت تک تشریف رکھتے کہ ہوا ٹھہر جاتی اگر آسمان میں سورج یا چاند کو گہن پڑتا تو نماز ہی کی طرف آپؐ کا رجوع ہوتا اور آپؐ اس وقت تک مشغول رہتے کہ گہن ختم ہوجاتا۔

اس بنا پر اس وقت دعا و مناجات، تلاوت قرآن پاک خاص طور پر ان آیات

---

[1] روایت ابوداؤد۔ [2] الطبرانی فی الکبیر۔

اور سورتوں کی تلاوت کا اہتمام کیا جانا چاہیے، جن میں امن وامان اور فتح ونصرت کا مضمون آیا ہے، مثلاً "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" "لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ" اور آیت کریمہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ" کا ورد۔

۲۔ دوسری شرط اور ضروری اور فوری قدم یہ ہے کہ معصیتوں سے توبہ کی جائے، گناہوں سے اجتناب اور احتراز برتا جائے، حقوق کی ادائگی ہو، اس سلسلہ میں خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (م ۱۰۱ھ) کے اس ایک فرمان کا حوالہ دینے پر اکتفا کی جاتی ہے، جو انھوں نے اپنی افواج کے ایک قائد کو بھیجا۔

وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"اللہ کے بندہ امیر المومنین عمر کا یہ ہدایت نامہ منصور ابن غالب کے نام جبکہ امیر المومنین نے ان کو اہلِ حرب سے اور ان اہلِ صلح سے جو مقابلہ میں آئیں، جنگ کرنے کے لئے بھیجا ہے، امیر المومنین نے ان کو یہ حکم دیا ہے کہ ہر حال میں تقویٰ اختیار کریں، کیونکہ اللہ کا تقویٰ بہترین سامان، مؤثر ترین تدبیر اور حقیقی طاقت ہے، امیر المومنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے دشمن سے زیادہ اللہ کی معصیت سے ڈریں، کیونکہ گناہ دشمن کی تدبیروں سے بھی زیادہ انسان کے لئے خطرناک ہے، ہم اپنے دشمن سے جنگ کرتے ہیں، اور ان کے گناہوں کی وجہ سے ان پر غالب آجاتے ہیں، اگر ہم اور وہ دونوں معصیت میں برابر ہو جائیں تو وہ قوت اور تعداد میں ہم سے بڑھ کر ثابت ہوں گے، اپنے گناہوں سے زیادہ کسی کی دشمنی سے چوکنّا نہ ہوں، جہاں تک ممکن ہو اپنے گناہوں سے زیادہ کسی چیز کی

فکر نہ کریں"۔[1]

۳۔ غیر مسلموں کو اسلام سے متعارف کرانے کی کوشش کریں اور ایسے کسی موقع کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیں، ہمارے پاس سب سے بڑی طاقت وہ فطری، معقول، پرکشش اور دل و دماغ کو تسخیر کرنے والا دین، قرآن مجید کا اعجازی صحیفہ اور نبی آخر الزماں کی دلکش اور دل آویز سیرت اور اسلام کی قابلِ فہم اور قابلِ عمل اور عقلِ سلیم کو متأثر کرنے والی تعلیمات ہیں، جو اگر کھلے دماغ اور صاف ذہن سے پڑھی جائیں تو اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتیں، اور انھیں نے دنیا کے وسیع ترین رقبہ اور متمدّن اور ذہین قوموں کو اپنا عاشق اور اپنے اوپر کار بند بنا لیا اور ملک کے ملک (جو اپنی صد ہا سال کی تہذیبیں، فلسفے اور حکومتیں رکھتے تھے) ان کے حلقہ بگوش اور ان کے داعی و مبلغ بن گئے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے اس ملک میں اس فرض کی ادائگی میں اور اپنی اس ذمہ داری کے احساس و شعور میں بڑی کوتاہی کی، اس کا نتیجہ ہے کہ یہاں کی اکثریت اسلام کی ان روز مرّہ کی خصوصیات، نشانیوں اور اذان و نماز (جو شہروں، دیہاتوں اور محلوں میں پنج وقتہ ہوتی ہے) کے بارہ میں بعض اوقات ایسے سوالات کرتے ہیں کہ بجائے ان پر ہنسی آنے کے اپنی کوتاہی پر رونا آنا چاہیئے، وہ ان کے مفہوم و مطلب سے اتنے ناواقف ہیں جن کا قیاس میں آنا مشکل ہے، ان کے سلسلہ میں ایسے تجربے کثرت سے سفر کرنے والوں اور غیر مسلموں سے میل جول رکھنے والوں کو دن رات پیش آئے ہیں۔[2]

اس مقصد کے لئے اُردو انگریزی اور ہندی میں اسلام کے تعارف میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں،

---

[1] سیرت عمر بن عبد العزیز (ابن عبد الحکم) ترجمہ ماخوذ "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ اول ص ۴۵-۴۶

[2] راقم نے اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں" میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس پر اظہار تعجب و شکوہ۔

ان سے کام لیا جا سکتا ہے۔[1]

۴۔ اس سب کے ساتھ اس ملک میں جس میں صدہا سال سے مسلمان رہتے چلے آئے ہیں، اور بظاہر ان کو اسی ملک میں رہنا ہے بقائے باہم (CO-EXISTENCE) انسانی اور شہری بنیادوں پر اتحاد و تعاون اور انسانی جان اور عزّت و آبرو کے تحفّظ اور انسان کے احترام اور اس سے محبت کی تبلیغ اور تلقین ضروری ہے، جو اس ملک کی فضا کو مستقل طور پر معتدل اور پُرسکون بلکہ پُر راحت اور باعزّت رکھنے کی ضامن ہے، اور جس کے بغیر اس ملک کے (جس کے لئے مختلف مذاہب اور تہذیبوں کا مرکز اور دیس ہونا مقدر ہو چکا ہے) ترقی اور نیک نامی الگ رہی، امن و امان اور سکون و اطمینان کے ساتھ باقی رہنا بھی مشکل ہے، یہ تحریک "پیام انسانیت" کے نام سے کئی سال پہلے شروع کی گئی اور ہندوستان کے تقریباً تمام مرکزی شہروں میں اس کے بڑے بڑے جلسے ہوئے جن میں خاصی تعداد میں غیر مسلم دانشور، فضلاء، سیاسی کارکن اور رہنما بھی شریک ہوئے، اس کے تعارف اور اس کی ضرورت کی تشریح اور اس کے پیغام پر خاص لٹریچر اُردو، ہندی اور انگریزی میں تیار ہو چکا ہے، اور اہلِ شوق کو آسانی کے ساتھ دستیاب ہو سکتا ہے۔[2]

---

[1] مثال کے طور پر "اسلام کیا ہے" (از مولانا محمد منظور نعمانی) "ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں" (از راقم) "رحمت عالم" اور "رسولِ وحدت" (از مولانا سید سلیمان ندویؒ) "محسن عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" (از راقم) ان سب کے ہندی، انگریزی ترجمے ہو چکے ہیں، "رحمۃ للعالمین" (از قاضی محمد سلیمان منصورپوری) (INTRODUCTION TO ISLAM) (از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب حیدرآبادی مقیم پیرس) ان کے علاوہ دوسری مفید کتابیں اور رسائل۔

[2] دفتر "پیام انسانیت" پوسٹ بکس ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ سے یہ رسائل اور مضامین مل سکتے ہیں۔

۵۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں (خاص طور پر جہاں وہ اقلیت میں ہیں، اور وہاں خطرات اور آزمائشوں کا امکان ہے) صلح پسندی صبر و تحمل بلکہ ایثار و فیاضی کے ساتھ عزم و ہمّت، صبر و ثبات، شجاعت و دلیری کی صفت، راہِ خدا میں مصائب برداشت کرنے اور اس پر اللہ کے اجر و ثواب کی طمع اور جنّت اور لقائے رب کا شوق اور شہادت فی سبیل اللہ کے فضائل کا استحضار بھی موجود و زندہ رہنا چاہیئے، اس کے لئے ان کو صحابۂ کرام کے حالات اور داعیانِ اسلام کے کارناموں کا مطالعہ اور ان کا سننا سنانا جاری رکھنا چاہیئے، جنھوں نے راہِ خدا میں بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں اور قربانیاں دیں، اور اس کو افضل اعمال اور تقرّب خداوندی و حصولِ جنّت کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا۔

کچھ عرصہ پہلے پڑھے لکھے اور دیندار گھرانوں میں واقدی کی "فتوح الشام" کا منظوم اُردو ترجمہ "صمصام الاسلام"[1] گھروں اور مجلسوں میں پڑھا جاتا تھا، اور اس کا بڑا اثر پڑتا تھا، اب بھی "حکایاتِ صحابہ" از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ "شاہنامۂ اسلام" از حفیظ جالندھری، راقم سطور کی کتاب "جب ایمان کی بہار آئی" سے یہ کام لیا جا سکتا ہے، ان کے مسجدوں مجلسوں اور گھروں میں پڑھنے کا رواج ڈالنا چاہیئے۔

---

[1] یہ منشی سید عبدالرزاق صاحب کلامی کی تصنیف ہے جو تیرہویں صدی ہجری کے عظیم مجاہد و مصلح حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، وہ دو مرتبہ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہوئی، ضرورت ہے کہ پھر اس کی طباعت و اشاعت ہو اور وہ گھروں اور مجلسوں میں پڑھ کر سنائی جائے۔

۶۔ بڑی ضروری اور آخری بات یہ ہے کہ اس وقت ہر گھر کے ذمّہ داروں، بچوں کے والدین اور موجودہ نسل کے لوگوں کو اپنے بچوں اور اپنی آئندہ نسل کو دین کی ضروریات سے، اسلامی عقائد، دینی فرائض اور اسلامی اخلاق سے واقف کرانے اور بنیادی تعلیم دینے کی ذمّہ داری خود قبول کرنا ہے، اور ان پر لازم ہے کہ اس کو اپنا ایسا ہی انسانی و اسلامی فرض سمجھیں، جیسا بچوں کی خوراک و غذا و لباس و پوشاک، صحت اور بیماری کے علاج کی ذمّہ داری کو سمجھتے ہیں، اور اس کا انتظام کرتے ہیں، بلکہ حقیقت میں دین کی ضرورت، عقائد کی تعلیم، اور صحیح اسلامی عقیدہ کی حفاظت اور تقویت کا کام ان جسمانی و طبعی ضروریات کی تکمیل اور ان کے انتظام سے بھی زیادہ ضروری ہے، اور اس سے غفلت ان انسانی وجسمانی ضروریات کی تکمیل سے غفلت برتنے اور اس کے بارہ میں سہل انگاری سے کام لینے سے زیادہ خطرناک اور بُرے دائمی نتائج کا سبب ہے، اس لئے کہ دینی تعلیم و تربیت اور صحیح اسلامی عقائد کا معاملہ ایک لافانی و ابدی زندگی (حیات بعد الموت) کے انجام اور اچھے بُرے نتائج سے تعلق رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ صاف صاف ارشاد فرماتا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا[1] — اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے

اور صحیح حدیث میں آتا ہے "كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته"[2] تم میں سے ہر ایک ایک حاکم اور زیر دست اور زیر فرمان لوگوں کے ذمّہ دار کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر ایک سے اس کی اپنی اس رعیت (زیر اثر لوگوں) کے بارہ میں سوال کیا جائے گا،

---

[1] سورۂ تحریم آیت ۶ [2] صحیح بخاری کتاب الجمعہ۔ باب الجمعہ فی القریٰ والمدن۔

اس لئے گھر گھر، محلّہ محلّہ، مسجد مسجد اور مکتب مکتب اور مدرسہ مدرسہ بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے اور ہر عاقل و بالغ مسلمان اور عیال دار آدمی کو یہ ذمہ داری قبول کرنی چاہیئے۔

پٹنہ کا سفر اور پیام انسانیت کا غیر معمولی جلسہ

جون ۱۹۹۳ء کی آخری تاریخوں میں پٹنہ میں کئی تقریبات اور اجتماعات جمع ہو گئے تھے، جن کے لئے صحت کی کمزوری، مشاغل کی کثرت اور بعض تفکرات کے باوجود سفر کرنا ضروری اور مفید معلوم ہوا، ان اجتماعات اور تقریبات میں ایک جمعیۃ شباب الاسلام کا تربیتی کیمپ تھا، جس میں پٹنہ اور دور دراز کے مقامات کے نوجوانوں کی شرکت متوقع تھی، اس کے بانی اور روح رواں عزیز گرامی مولوی سید سلمان حسینی ندوی استاد دار العلوم ندوۃ العلماء ہیں، پھر اس کا بھی علم ہوا کہ پٹنہ کے بزرگ و احباب جن میں مولانا سید نظام الدین صاحب جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور پٹنہ کے مشہور و مقبول سرجن ڈاکٹر احمد عبد الحی صاحب پیش پیش ہیں، "پیام انسانیت" کا بھی ایک جلسہ بڑے پیمانہ پر کرنا چاہتے ہیں، اس علم و احساس کی بنا پر کہ بہار کے اس اہم اور مردم خیز خطّہ میں جو دانشوروں اور کثیر التعداد سیاسی رہنماؤں اور اس کے ساتھ ہند گیر بلکہ عالم گیر شہرت و عزّت رکھنے والے علماء و فضلاء کا مرکز رہا ہے، اور اسی کے ساتھ بدقسمتی سے وہ عظیم فرقہ وارانہ فسادات کا بار بار شکار ہوا ہے، جس میں جمشید پور، راوڑکیلا اور رانچی کا وسیع اور مہیب فساد سب سے زیادہ شہرت رکھتا ہے جو ۱۹۶۴ء میں بڑے پیمانہ پر پیش آیا تھا، اور راقم سطور نے اس زمانہ میں اس علاقہ کا دورہ بھی کیا تھا، اور اس سلسلہ میں جے پرکاش نرائن جی

اور دونوبا بھاوے جی سے خصوصی ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں، جس کا ذکر "کاروان زندگی" کی جلد اول میں آچکا ہے[1]، لیکن اس سب کے باوجود وہاں ابھی تک "پیامِ انسانیت" کا کوئی جلسہ نہیں ہوسکا۔

راقم نے اس خیال کی بنا پر کہ موجودہ حالات میں یہ سب سے بڑا انسانی، اخلاقی، وطنی (بلکہ ایک لحاظ سے دینی و اسلامی فریضہ بھی ہے اور وقت کا تقاضہ بھی یہ دعوت قبول کرلی اور اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ ۲۸ر جون کو رائے بریلی سے (جہاں ان دنوں قیام تھا) پٹنہ کے لئے روانہ ہوگیا، پٹنہ اسٹیشن پر معزّزین شہر، احباب اور ندوی فضلاء کی (جن کی بڑی تعداد بہار میں پائی جاتی ہے) استقبال کے لئے موجود تھی، اور سہولت کا سامان مہیّا تھا، قیام ڈاکٹر احمد عبدالحی صاحب کی وسیع اور شاندار قیام گاہ واقع اکزبیشن روڈ پٹنہ میں ہوا، جہاں راقم مُحِبّ گرامی منزلت مولانا عبدالکریم صاحب پاریکھ اور اپنے رفقاء و معاونین کے ساتھ ٹھہرا، اور وہاں وہ سب سہولتیں، انتظامات اور اسبابِ راحت و استراحت حاصل تھے، جو کسی بڑے سے بڑے ہوٹل میں یا کسی رئیس کی قیام گاہ میں بھی مشکل سے میسّر آسکتے ہیں، اور جن کا باعث ڈاکٹر احمد عبدالحی صاحب کا مخلصانہ تعلق و محبت، کریم النفسی اور دینی و علمی احترام تھا۔

شباب الاسلام کے جلسہ میں

۲۹ر جون ۱۹۹۳ء کو انجمن اسلامیہ کے ہال میں جمعیۃ شباب الاسلام کے زیر اہتمام تربیتی کیمپ میں شریک ہونے والے نوجوانوں سے خطاب کا پروگرام تھا،

---

[1] ملاحظہ ہو "کاروانِ زندگی" حصہ اول ص ۴۹۶-۵۰۳

راقم نے سورۂ کہف کی آیت "اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ" کی تفسیر کرتے ہوئے کہا کہ انقلاب برپا کرنے اور ہوا کے رُخ کو موڑنے والے لوگ ہمیشہ کم تعداد میں ہوتے ہیں،[1] پھر بتایا کہ اس آیت میں ان کے عمل، اقدام اور ارتقاء کی جو ترتیب آئی ہے، وہ مطابق واقعہ ہونے کے ساتھ اپنے اندر بڑی حکمت و موعظت رکھتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا معاملہ ایمان کا ہے، جوان کو خود طے کرنا ہوتا ہے' (اٰمنوا بربهم) پھر ہدایت ربّانی اور ترقی ایمانی کا مرحلہ آتا ہے (وَزِدْنَاهُمْ هُدًى) پھر مخالفتوں اور ایذا و مقاطعہ کا مرحلہ سامنے آتا ہے جس میں اللہ کی طرف سے ثابت قدمی، تقویتِ قلبی اور تائیدِ الٰہی، استقامت اور ایثار و قربانی کی توفیق شامل حال ہوتی ہے (وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ) انبیاء علیہم السلام کے تابعین اور اپنے اپنے زمانہ میں ہدایت و اصلاح کا بیڑا اٹھانے والوں اور اس میدان میں قدم رکھنے والوں کی تاریخ اور واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

پھر اس آیت کی روشنی میں کہا گیا کہ ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا میں ایمان کی پختگی، کردار کی عظمت، اور اُسوۂ حسنہ کی ضرورت ہے، ایسے سرپھرے نوجوانوں کی ضرورت ہے جو کرسی و منصب اور مادّیت کی دل فریبیوں سے بالاتر ہو کر

---

[1] آیت میں فِتْيَةٌ کا لفظ آیا ہے جو جمع قلّت ہے، عربی زبان میں تین ہی لفظ جمع قلّت کے پائے جاتے ہیں، فتیۃ، صبیۃ، غلمۃ، اس وزن کے لفظ کے استعمال کرنے میں علاوہ اس کے کہ وہ تاریخی واقعہ کے بھی مطابق ہے کہ ان باہمت نوجوانوں کی تعداد (جیساکہ خود قرآن مجید نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے) سات سے زیادہ نہیں تھی، یہ حکمت اور اعجاز قرآنی بھی ہے کہ قلیلُ التعداد افراد جو کسی اصلاح اور دعوت کے لئے کھڑے ہوں اپنی تعداد کی کمی کی وجہ سے خائف اور بددل اور مایوس نہ ہوں۔

انسانیت کی بے لوث اور مخلصانہ خدمت کریں[1]، اور غیر مسلموں کے سامنے ایسا پاکیزہ نمونہ پیش کریں، جس کو دیکھ کر وہ اسلام پر غور کرنے اور اس موضوع پر مطالعہ کرنے پر مجبور ہوجائیں، تاریخ بتاتی ہے کہ وہ چند نوجوان ہی تھے، جنھوں نے نگاہوں اور دلوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا، اور رومن ایمپائر میں جس کے پیچھے ایک دلفریب تہذیب' ایک انتہائی ترقی یافتہ تمدّن' اور مادّی اسباب وذخائر کی فراوانی تھی، ان نوجوانوں نے اس وقت کی سب سے بڑی شہنشاہیت کے دور میں چھائی ہوئی مادّہ پرستی کے خلاف خدا پرستی، دینی ثبات واستقامت اور ایثار وقربانی کی مثال پیش کی، آج بھی ایسے ہی نوجوانوں کی ضرورت ہے جو خم ٹھونک کر میدان میں آئیں' اور ثابت کریں کہ عہدہ، اعزاز، دولت، اور حکومت کی طاقت ہی سب کچھ نہیں، اصل چیز کردار کی عظمت' ایمان کی پختگی، ایثار وقربانی اور اخلاقی اقدار ہیں، آج کے دور میں "رازق" کا تخیّل ہی بدل گیا، خاص طرز کی جدّوجہد کرنا، زندگی کا ایک خاص معیار اور اخلاقی اقدار پوری زندگی پر حاوی ہیں' ان چیزوں نے مصنفوں اور دانشوروں' سیاست دانوں، معلّموں اور مصنفین وادباء کا طرزِ فکر ہی بدل کر رکھدیا ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ

---

[1] تاریخ کی ان قدیم کتابوں سے جو غیر اسلامی زبانوں میں لکھی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوجوان زیادہ تر سلطنت روما کے اعلیٰ عہدیداروں اور منصب داروں کے فرزند تھے' جن سے ترقیات ومعاشی کامیابیوں اور خوش حالی کی امیدیں تھیں' اور جن پر حضرت شعیبؑ کے عزیزوں اور اہلِ وطن کا یہ قول صادق آتا ہے "یَا شُعَیْبُ لَقَدْ کُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ ھٰذَا (اے شعیب تم سے تو بڑی بڑی معاشی ترقی اور اعزاز کی امیدیں وابستہ تھیں) (تم خاکم بدہن) اس کفر وایمان کے جھگڑے میں کیسے پڑ گئے؟ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب "معرکۂ ایمان ومادیت" مطبوعہ "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" لکھنؤ۔

پوری دنیا میں مادّیت ایک وبا کی طرح پھیل گئی ہے، لوگ پیسے اور کرسی کے پجاری بن کر رہ گئے ہیں۔

ملک کی موجودہ اخلاقی بحران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ ایسے سنگین حالات میں آپ جیسے نوجوانوں نے اگر اخلاقی جرءت سے کام لے کر ایمان کی پختگی اور کردار کی عظمت کو ثابت کر دیا، اور یہ بتا دیا کہ آپ کسی قیمت پر بِک نہیں سکتے، کوئی آپ کا سودا نہیں کر سکتا، تو یقین مانئے اس ملک میں انقلاب آجائیگا، اور ہوا کا رُخ ہی تبدیل ہو جائیگا۔

تقریر کو علامہ اقبالؒ کے ان دو شعروں پر ختم کیا گیا ؎

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم

پیام انسانیت کا غیر معمولی اور تاریخی اجلاس

۳۰ رجون ۱۹۹۳ء (۹ محرم الحرام ۱۴۱۴ھ) کو سری کرشنا ہال[۱] پٹنہ میں بعد مغرب "پیام انسانیت" کے جلسے کے انعقاد کا اعلان ہوا تھا، لوگوں کو اس میں بڑا شبہ تھا کہ یہ ہال پُر ہو سکے گا اور جلسہ حاضرین کی تعداد، توجہ اور قدر افزائی کے لحاظ سے کامیاب ہو گا، بعض مخلصین نے مولانا نظام الدین صاحب کو مشورہ دیا کہ جلسہ ہال میں ہوتے

---

[۱] یہ پٹنہ کا سب سے وسیع اور عظیم ہال ہے جس میں ۳۰۰۰ کرسیوں کا انتظام ہے، ہال کا کرایہ چودہ ہزار روپے ہے دوسرے شہروں میں بھی ایسے وسیع ہال کم دیکھے گئے، ہال ایر کنڈیشنڈ ہے۔

اور اس پر اتنا خرچ کرنے کے بجائے گاندھی میدان میں ہو لیکن مولانا نے توکلاً علی اللہ اور کچھ اس خیال سے بھی کہ بارش کا موسم ہے اور ممکن ہے اس وقت بارش ہو رہی ہو اس ہال ہی میں جلسہ رکھنے کا فیصلہ اور اعلان کیا، اس جلسہ کی خلاف توقع غیر معمولی کامیابی حاضرین کے اژدحام اور توجہ اور دلچسپی میں موضوع اور مقصد کی اہمیت اور اس کے مطابق وقت ہونے کے علاوہ مولانا نظام الدین صاحب کے اخلاص اور ڈاکٹر احمد عبدالحی صاحب کے اخلاق کا بھی بڑا دخل تھا۔

راقم سطور جب نماز مغرب کے بعد اس ہال کی طرف روانہ ہوا، تو وہ سمجھ رہا تھا کہ معلوم نہیں ہال آدھا بھی بھرا ہوگا کہ نہیں؟ لیکن جب اس نے اپنے رفقاء کے ساتھ ہال میں قدم رکھا تو دیکھا کہ پورا ہال بھر چکا ہے، بعد میں معلوم ہوا کہ ہال کے باہر بھی سامعین کی ایک بڑی تعداد ایستادہ اور گوش بر آواز تھی، ڈائس پر بہار کے وزیر اعلیٰ مسٹر لالو پرشاد یادو[1] سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا، آئی جی پولیس مسٹر میکورام، ریٹائرڈ فوجی جنرل ایس، کے سنہا، مسیحی گرجا گھر کے سربراہ فادر پال جیکسن، میجر بلبیر سنگھ، بہار گورنمنٹ کے سابق چیف سکریٹری، مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری مولانا سید نظام الدین صاحب، مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب اور ڈاکٹر احمد عبدالحی صاحب تشریف رکھتے تھے۔

"پیام انسانیت" کے عام جلسوں کے معمول کے خلاف جلسہ کی تلاوتِ کلام پاک سے ابتدا کی گئی اور اجلاس پر اس مصرعہ کا پرچم لہرا رہا تھا۔ ع

مرا پیام محبت ہے، جہاں تک پہونچے

---

[1] غالباً جلسہ انھیں کی صدارت میں تھا۔

آیات کا انگریزی اور ہندی ترجمہ بھی پیش کیا گیا، خطبۂ استقبالیہ ڈاکٹر سید احمد عبدالحی صاحب نے پیش کیا جس میں تحریک پیام انسانیت کے اغراض و مقاصد اور موجودہ ہندوستان میں اس کی اہمیت و افادیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی گئی تھی، اسی دن ۳۰ رجون کو ٹائمز آف انڈیا کے پٹنہ ایڈیشن نے راقم کا ایک انٹرویو اور پیام انسانیت کی تحریک اور اس دعوت کے مقاصد و پس منظر پر ایک مضمون مع تصویر کے شائع کیا تھا، اس کے علاوہ ہندی، انگریزی، اردو اخبارات میں بھی کانفرنس سے متعلق تائیدی و تعارفی بیانات اور خبریں شائع ہوئی تھیں، خصوصی ملاقاتوں کا بھی اہتمام کیا گیا تھا، اس لئے "پیام انسانیت" کے زیر اہتمام اب تک منعقد ہونے والے تمام جلسوں میں یہ جلسہ سب سے بڑا اور کامیاب ترین جلسہ تھا، جو انتہائی سکون کے ساتھ ساڑھے بجے مغرب بعد شروع ہوا، اور ٹھیک دس بجے ختم ہوا[۱]۔

راقم کی تقریر

راقم نے اتفاقی طور پر اپنی تقریر کا آغاز خود بہار کے عظیم المرتبت روحانی پیشوا اور نہ صرف فخر بہار بلکہ فخر ہند اور فخر عہد ساتویں، آٹھویں صدی ہجری کے بزرگ، مصلح و داعی، اور عارف و محقق، مخدوم الملک حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری[۲] (۶۶۱ھ-۷۸۶ھ) کے ایک حکیمانہ مقولہ سے اپنی تقریر یہ کہہ کر شروع کی کہ

لہ اس رپورٹ میں مولوی نذر الحفیظ ندوی ازہری کے مقالہ سے بھی مدد لی گئی جو "تعمیر حیات" کے شمارہ مورخہ ۱۰ رجولائی میں شائع ہوا ہے۔

ٹہ مولود قصبۂ منیر بہار ۶۶۱ھ، متوفی بہار شریف ۷۸۶ھ۔

"قصۂ زمین برسر زمین" ہم اپنی تقریر کا آغاز خود آپ کے صوبہ بہار کے ایک جلیل القدر شخصیت کے بیان کئے ہوئے ایک واقعہ سے شروع کرتے ہیں کہ نہ صرف یہ مقام و محل کے مطابق ہے، بلکہ وہ اس موضوع کے لئے مناسب ترین تمہید اور اس کے لئے صحیح زمین فراہم کرتا ہے، مخدوم صاحب اپنے ایک مکتوب (خط) میں تحریر فرماتے ہیں، جو اپنے ایک ارادت مند کو لکھا تھا:[1] ــ

"ایک شخص نے ایک پہاڑ کی چوٹی پر محل تعمیر کیا، وہاں انواع و اقسام کی نعمتیں جمع کیں، جب اس کا آخیر وقت ہوا تو اس نے لڑکے کو وصیّت کی کہ اس محل میں جو ترمیم و تصرّف چاہنا کرنا، لیکن ایک خوشبودار گھاس کا ایک حصہ جو میں چھوڑ کر جا رہا ہوں وہ چاہے خشک ہو جائے، اس کو باہر نہ کرنا۔

جب پہاڑ کی چوٹی پر بہار آئی تو پہاڑ و میدان سب سر سبز ہو گئے، بہت سی تازہ اور خوشبودار گھاس پیدا ہو گئی، جو اس پرانی گھاس سے زیادہ تر و تازہ تھی، اس میں سے بہت سی گھاس اور پھول اس محل میں آئے جن کی خوشبو نے سارے محل کو معطر کر دیا، اور ان کے سامنے اس پرانی سوکھی ہوئی گھاس کی خوشبو دب گئی، لڑکے نے سوچا کہ میرے والد نے یہ پرانی گھاس اس محل میں اس لئے رکھی تھی کہ اس کی خوشبو پھیلے اور یہ جگہ اس سے معطّر ہو، اب یہ سوکھی گھاس کس کام آئیگی؟ اس نے حکم دیا کہ اس گھاس کو باہر پھینک دیا جائے۔

---

[1] "مکتوبات سہ صدی"، "مکتوب ہفت دہم (۱۷)" ترجمہ از فارسی "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ سوم ص ۳۰۶-۳۰۷

جس وقت محل اس گھاس سے خالی ہوگیا، ایک کالے سانپ نے سوراخ سے سر نکالا اور لڑکے کو ڈس لیا، اور اس کا کام تمام ہوگیا، سبب اس کا یہ تھا کہ اس گھاس کے دو فائدے تھے، ایک یہ کہ وہ خوشبو دے، اور دوسرے اس میں یہ خاصیت تھی کہ وہ جہاں ہوتی ہے سانپ اس کے قریب نہیں جا سکتا، گویا وہ سانپ کا تریاق تھی، یہ خاصیت کسی کو معلوم نہیں تھی، لڑکے کو اپنی ذہانت پر ناز تھا، وہ سمجھا کہ جو اس کے معلومات کے دائرہ میں نہ ہو گویا کہ قدرت خداوندی کے خزانہ میں موجود نہیں ہے، اس کو اس آیت کا مفہوم نہیں معلوم تھا: "وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا" وہ اپنی ذہانت کے غرّہ میں مارا گیا۔[۱]"

اس واقعہ کے بیان کرنے کے بعد راقم نے عرض کیا کہ وہ ایک چھوٹے قطعۂ زمین کا ذکر تھا، جہاں ایک گھاس یا پودے کی افادیت اور مصلحت کا معاملہ تھا، اور اس کے باغیچہ سے نکال دینے سے ایک زہریلا سانپ نکل آیا جس نے باغ کے مالک کو ڈس لیا، اور اس کا کام تمام کر دیا، لیکن ہمارا ملک (ہندوستان) ایک وسیع و عظیم ملک ہے، یہاں کم سے کم ایسے تین پودے تھے جن کا باقی رہنا ضروری تھا، اور ان کے ختم کر دینے سے اس ملک کے رقبہ اور وسعت کے تناسب سے تین بڑے زہریلے سانپ نکل آئے، ایک عدم تشدّد (NON-VIOLENCE) کا پودہ، دوسرا مذہبیت (SECULARISM) کا پودہ، تیسرا جمہوریت (DEMOCRACY) کا پودہ۔

عدم تشدّد کے پودہ کے نکال دینے اور تباہ کر دینے سے تشدّد (VIOLENCE)

---

[۱] مکتوب ہفت دہم۔ ۱۷

کا اژدہا منہ پھاڑ کر نکل آیا، اور اس نے سارے ہندوستان میں قتل و غارت گری، اور ظلم و سفّاکی کا میدان گرم کر دیا، ایک ملک کے رہنے والے انسان کا اسی ملک کے رہنے والے انسان پر ایسا ہاتھ اٹھا اور ایک فرقہ نے دوسرے فرقہ کے ساتھ سنگ دلی اور بے رحمی کا ایسا مظاہرہ کیا جس کا نمونہ درندوں اور جانوروں میں بھی کم دیکھنے میں آتا ہے، شاعر کا یہ مصرعہ یاد آتا ہے۔ ؎

ستم یہ ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

ہم نے کبھی نہیں سنا، اور آپ نے بھی نہیں سنا ہوگا کہ کسی جنگل میں ایک علاقہ کے بھیڑیوں نے فوج بنا کر دوسرے علاقہ کے بھیڑیوں پر حملہ کیا، (اور آپ بُرا نہ مانیں) کسی شہر کے ایک محلہ کے کتّوں نے دوسرے محلہ کے کتّوں پر لشکر کشی کی، اور اجتماعی طور پر ان سے زور آزمائی لیکن ہندوستان میں جو اپنی امن پسندی، انسانیت دوستی، اور "اہنسا" کے لئے باہر کی دنیا میں مشہور تھا، وہاں آئے دن ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، جو اس ملک کے نام کو بٹّہ لگاتے ہیں، اور ملک سے باہر جانے والوں کو شرمندگی سے سر جھکا لینا پڑتا ہے، میں آپ سے بے تکلف کہتا ہوں کہ ۹ رجنوری (۱۹۹۳ئ) کو میری ملک کے وزیر اعظم نرسمہا راؤ جی سے دہلی میں ملاقات ہوئی، انھیں تاریخوں میں مجھے اسلامی دنیا کی سب سے بڑی نمائندہ اور معزّز تنظیم رابطۂ عالمِ اسلامی (WORLD ISLAMIC LEAGUE) واقع مکّہ معظّمہ کی طرف سے جس کا میں فاؤنڈر ممبر ہوں، دعوت نامہ وصول ہوا تھا اور سفر کے سب انتظامات تھے، میں نے جانے سے اس لئے معذرت کر دی کہ اگر ۶ر دسمبر کے واقعہ اور اس کے بعد کے فسادات کا ذکر آیا اور مجھ سے سوال کیا گیا، تو میں کیا جواب دوں گا؟ جھوٹ بول نہیں سکتا، سچ کہہ نہیں سکتا،

اس لئے میں نے نہ جانے کو ترجیح دی اور ایسا ایک ڈاوٹ ٹو یار پیش آیا۔

پھر ان فرقہ وارانہ فسادات میں نہ عورت کا لحاظ رکھا جاتا ہے نہ بچوں پہ رحم آتا ہے نہ بوڑھے پر ترس کھایا جاتا ہے، فرقہ وارانہ فسادات (COMMUNAL RIOTS) ہی میں نہیں مطلوبہ جہیز کے نہ لانے اور فرمائشیں پوری نہ کرنے کے جرم میں بے زبان، شریف، شرمیلی اور بے گناہ بیاہتا ناریوں کو جس طرح جلایا جاتا ہے، زہر دیا جاتا ہے، اوران سے چھٹی پائی جاتی ہے، وہ ایک ایسا سنگ دلانا بلکہ وحشیانہ فعل ہے جس کی مثال دوسرے ملکوں میں کیا تاریخ میں بھی ملنی مشکل ہے، اور وہ ستی کی رسم سے بڑھ گئی ہے، جس میں بیوہ بیوی خود اپنے کو آگ لگا لیتی تھی۔

یہ سب نتیجہ عدم تشدّد کے اصول کو چھوڑ دینے کا ہے تشدّد (VIOLENCE) کا خاصہ ہے کہ وہ ایک ہی قسم اور دائرہ میں محدود نہیں رہتا، وہ پھیلتا ہے اور نئی نئی شکلیں اختیار کرتا ہے، اور جب اس کو کوئی باہر کا شکار نہیں ملتا تو پھر وہ اندر ہی اندر شکار تلاش کر کے اپنی پیاس بجھاتا ہے، کسی عرب شاعر نے سیکڑوں برس پہلے ایک شعر کہا تھا، جس میں بڑی حقیقت اور صداقت ہے۔ شعر یہ ہے ؎

والنار تأكل نفسها — إن لم تجد ما تأكلُ

(آگ اپنے کو کھانے لگتی ہے جب اس کو باہر کی کوئی چیز (لکڑی، کپڑا) وغیرہ) کھانے کو نہیں ملتا، جب یہ تشدّد کسی ملک یا قوم میں آجاتا ہے تو پھر دوسرے مذہب والے ہی نہیں، اپنی ہی قوم اور مذہب کی ذاتیں اور برادریاں، خاندان اور محلے اور کمزور اور محتاج انسان، اور جن سے ذرا بھی اختلاف ہو ان کا نشانہ بنتے ہیں۔

یہ تو عدم تشدّد (NON-VIOLENCE) کا معاملہ ہے کہ اس پودے کو (جس کی

اہمیت اور ضرورت کا احساس ملک کے سچّے بہی خواہوں اور دانشوروں کو ملک کی آزادی سے پہلے ہوگیا تھا، اور مذاہب و اخلاقیات نے بھی اس کی بڑی اہمیت اور تاکید کے ساتھ تعلیم دی ہے) اکھاڑ دینے سے فسادات اور خون ریزی، انسان کشی کا سلسلہ مہیب تشکل میں اور وسیع پیمانہ میں شروع ہوگیا، اور اندیشہ ہے کہ (مجھے معاف کیا جائے) اونچی ذات والے نیچی ذات والوں کے ساتھ، دولت مند غریبوں کے ساتھ، افسران ماتحتوں کے ساتھ، اور ایک فریق دوسرے فریق کے ساتھ تشدّد کرنے لگے۔

اب نامذہبیت (SECULARISM) کو لیجئے کہ برسرِ اقتدار جماعت (RULING POWER) اس ملک کو (جو مذاہب کا، تہذیبوں، ثقافتوں (CULTURES) زبانوں، رسم الخط (SCRIPT) اور مختلف علوم و فنون کا گہوارہ تھا، اور یہ اس کا امتیاز اور باعثِ افتخار پہلو تھا) ایک ہی مذہب نہیں بلکہ ایک ہی تہذیب اور ایک ہی زبان اور کلچر اور ایک ہی طرح کے رسوم و عادات کا پابند بنانا اور ایک ہی سانچہ میں ڈھلا ہوا دیکھنا چاہتا ہے، اور اس کے لئے پورے نظامِ تعلیم، اور زبان و رسم الخط کی تبدیلی کا مکمل منصوبہ ہی نہیں بناتا، اور ملک کی پوری آبادی کو اس کا پابند کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتا بلکہ تاریخ کو بھی بدلنے کا کام شروع کر دیتا ہے، اور ایسی تاریخ کی بنیاد ڈالتا ہے جس سے باہمی منافرت مستقل تشکل اختیار کرلیتی ہے، اور جو کام انگریز اور برطانی مؤرخ نہیں کرسکے، وہ انجام دیا جاتا ہے، اس سے دوسرے مذاہب کے لوگوں اور اقلیتی فرقوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں، ان کو اپنے مذہب، خود اعتمادی دماغی سکون، اور نسلی طور پہ مذہبی و تہذیبی تسلسل کو قائم رکھنے کی فکر پیدا ہوجاتی ہے، اور جو صلاحیت و طاقت (TALENT & ENERGY) ملک کی تعمیر و ترقی دینے کے مشترک

کام میں صرف ہونی چاہیئے تھی، وہ اپنے تحفظ اور اپنی عزیز چیزوں کی بقا و تحفظ میں لگ جاتی ہے، جس میں ان کا بڑا خسارہ ہے۔

تیسری چیز جمہوریت (DEMOCRACY) کے متعلق زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اب ساری دنیا نے جمہوری نظام کو ضروری سمجھ لیا ہے، اور ہر ملک میں وہ قائم ہے، اور اس کا مطالبہ ہے، مطلق العنانی اور جبر و تشدد کا دور ختم ہو گیا ہے، اور جہاں ہے اس کے خلاف احتجاج اور جد و جہد جاری ہے۔

دوسری بیماری جو اس ملک کو شدت اور عمومیت کے ساتھ لگ گئی ہے، اور وہ پورے معاشرہ اور زندگی کے لئے جنجال بن گئی ہے، وہ پیسے کی حد سے بڑھی ہوئی محبت اور پرستش اور عبادت کی حد تک اس کی تقدیس و تعظیم (REVERENCE & WORSHIP) ہے، دولت جس طرح اور جس راستہ سے ہاتھ آئے، اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور اس کے لئے تمام طریقوں اور ذرائع کو جائز سمجھا جاتا ہے، محکموں میں رشوت کا بازار گرم ہے، آپ کے پاس پیسہ ہے تو جو کام چاہیئے کرا لیجئے، ملک کے راز بیچے جاتے ہیں، بینکوں کے شیئرز (SHARES) اور ان کی دلالی میں کروروں اور اربوں کا گھپلہ کیا جاتا ہے، الیکشن میں کھلی رشوتیں دی جاتی ہیں، اور ووٹ خریدے جاتے ہیں، روزمرہ کی زندگی مشکل ہو گئی۔

اس ملک کی ایک بڑی خصوصیت دولت سے عدم مرعوبیت، اخلاقی جرءت، دولت والوں اور طاقت والوں کا لحاظ کئے بغیر حق بات کہنے کی ہمت، زاہدانہ زندگی، اور ایثار و قربانی کے نمونے و روایات تھیں، پھر باہر سے جو روحانی پیشوا اور معلّمِ اخلاق آئے، انھوں نے تو زہد و ایثار و قربانی، اور سادہ زندگی بلکہ فاقہ کشی،

اور مجاہدہ کے ایسے نمونے پیش کیے، جن کی نظیر باہر کے ملکوں میں بھی ملنی مشکل ہے، اور یہی یہاں کی قدیم آبادی واکثریت کا طرۂ امتیاز اور باعثِ افتخار تھا، لیکن اب اس وقت معاملہ برعکس ہے، اور دولت وطاقت اس وقت سب سے بڑا مقصدِ زندگی، کامیابی کی دلیل وعلامت اور ایک طرح سے معبود (پرستش کی چیز) بن گئی ہے۔

حضرات! اگر دل کو چیر کر، یا آنسوؤں کو بہا کر اس ملک کے پہاڑوں، درختوں اور دریاؤں کے ذریعہ ہم آپ کو اس ملک کی کراہ سنوا سکتے تو ضرور اس کراہ کو آپ تک پہونچاتے، اگر درخت اور جانور بولتے تو وہ آپ کو بتاتے کہ اس ملک کا ضمیر مجروح ہو چکا ہے، اس کی عزّت اور ناموری کو بٹہ لگایا جاچکا ہے، اور وہ زوال وآزمائش کے ایک بڑے خطرہ سے دوچار ہے، آج سنتوں، مذہبی لوگوں، دانشوروں، مصنفوں اور معلّموں کو میدان میں آنے، نفرت کی آگ بجھانے اور محبت کے چراغ جلانے کی ضرورت ہے، اس ملک کی ندّیاں، ہمالیہ پہاڑ، اور ملک کے ذرّات بھی آپ سے درخواست کر رہے ہیں کہ آپ انسانوں کا خون نہ بہائیے، نفرت کے بیج مت بوئیے، معصوم بچوں کو یتیم ہونے سے اور بیویوں کو بیوہ ہونے سے بچائیے، ہندوستان کو جن لوگوں نے آزاد کرایا تھا، انھوں نے عدم تشدّد، رواداری، اور جمہوریت کے پودوں کی حفاظت کی ذمہ داری ہمارے سپرد کی تھی، اور ہدایت کی تھی کہ ان پودوں کو ہاتھ نہ لگایا جائے، مگر ہم اس کی حفاظت میں ناکام ہو گئے، جس کے باعث تشدّد وتصادم کا عفریت (دیو) ہمارے سامنے منھ کھولے کھڑا ہے، نفرت اور تشدّد کی آگ ہماری ساری روایات کو جلا دینے پر آمادہ ہے، جن کے لئے ہم ساری دنیا میں مشہور تھے، اور عزّت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، ہماری غلطیوں نے بیرونِ ملک میں ہمارا سر نیچا کر دیا، اور ہماری حالت یہ ہو گئی کہ

ہم منھ دکھانے کے لائق نہیں رہ گئے ہیں۔

ان حالات کے باوجود میں مایوس نہیں ہوں اس وقت آپ کا اتنی بڑی تعداد میں آنا، اور اتنے شوق و سکون کے ساتھ بات سننا خود اس بات کی دلیل ہے کہ ملک کا ضمیر بالکل سو نہیں گیا (مردہ ہونا تو الگ بات ہے) اور یہ حالت غیر فطری ہے، زیادہ عرصہ باقی رہنے کی اس کے اندر صلاحیت نہیں ہے، مگر اس کے لئے اتنی ہی بڑی جدّوجہد بلکہ اس سے بڑی جدّوجہد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو آزاد کرانے کے لئے کی گئی۔

راقم کے بعد معزّز حاضرین میں سے اکثر حضرات نے تائیدی تقریریں کیں، صدر اجلاس بہار کے وزیر اعلیٰ مسٹر لالو پرشاد یادو نے تقریر کی، اہم مقررین میں سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا، آئی جی پولیس مسٹر میکو رام، ریٹائرڈ فوجی جنرل ایس کے سنہا، مسیحی گرجا گھر کے سربراہ فادر پال ریکین[1]، میجر بل بیر سنگھ، بہار گورنمنٹ کے سابق چیف سکریٹری .... مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری مولانا سید نظام الدین صاحب اور مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب شامل تھے، مقررین میں حسب معمول اور حسب توقع مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب کی تقریر بڑی زوردار مدلّل اور مؤثر تھی، اور بڑی توجہ سے سُنی گئی[2]، بہار کے خوش گو اور مقبول شاعر کلیم عاجز صاحب نے ایک مؤثر نظم بھی پڑھی

---

[1] معلوم ہوا کہ انھوں نے حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ [2] جلسہ کی روئیداد کے سلسلہ میں مولوی نذر الحفیظ ندوی کے مضمون شائع شدہ "تعمیر حیات" ۱۰ر جولائی ۱۹۹۳ء سے بھی مدد لی گئی لیکن راقم نے اپنی تقریر میں بعض ان باتوں کا اضافہ کرکے جو "پیام انسانیت" کے دوسرے جلسوں کی تقریروں میں تفصیل و وضاحت سے کہی گئی ہیں اور کچھ مواد کا اضافہ کرکے جلسہ کی اس رپورٹ کو مستقل مقالہ اور رسالہ بنا دیا۔

جو اسی موقع کے لئے لکھی گئی تھی۔

پٹنہ کی دوسری مشغولیتیں

پٹنہ آکر امارت شرعیہ اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے مرکزی دفتر میں حاضری مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب میموریل ہاسپٹل معائنہ کرنا، اور پھلواری شریف حاضری دیتے اور وہاں کی بزرگ شخصیتوں سے شرف ملاقات حاصل نہ کرنا ممکن نہ تھا، اس لئے اس کے لئے بھی وقت نکالا گیا، اور یہ سعادت حاصل کی گئی۔

دفتر امارت شرعیہ میں مولانا نظام الدین صاحب نے قضا و افتاء کی تربیت حاصل کرنے والوں سے خطاب کرنے کا موقعہ بھی دیا، جس میں اس کام کی اہمیت اور ہندوستان بالخصوص بہار میں امارتِ شرعیہ کے نظام کے قیام اور موجودگی کو ہندوستان کا ایک بڑا امتیاز اور قابلِ فخر کارنامہ بتایا گیا، اور اس کی نزاکتوں اور ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی گئی، نفقۂ مطلّقہ کے مسئلہ میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی اس کامیابی کے (جس کی نظیر دینی تحریکوں اور مساعی میں کم ملتی ہے) اسباب بیان کئے گئے، اور اس کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی، اور مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحبؒ کے امتیاز اور انفرادیت، ان کے کارنامے اور شخصیت پر روشنی ڈالی گئی، اور ان کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔

پھلواری شریف جاکر محترم سجادہ نشین شاہ رضوان اللہ صاحب اور اس تاریخی واصلاحی وتربیتی مرکز کے ایک ممتاز عالم وشخصیت مولانا شاہ عون احمد صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل کیا گیا۔

شہدائے اسلام کے جلسہ منعقدہ مولانا عبدالشکور ہال لکھنؤ میں ایک اہم تقریر

۱۵ محرم الحرام ۱۴۱۴ھ (۸ جولائی) کو دار المبلغین کے ماتحت ہونے والے ان جلسوں کو جو شہدائے اسلام کی یادگار میں مولانا عبدالشکور ہال احاطہ شوکت علی لکھنؤ میں راقم نے بھی اپنی شدید مصروفیتوں اور بعض پریشانیوں اور افکار کے باوجود شرکت کی سعادت حاصل کی، اور وہاں ایک تقریر کے ذریعہ حالاتِ حاضرہ سے متعلق مسلمانوں کو ایک پیغام دیا، جو قابلِ نقل و اشاعت ہے، اور اپنے اندر خاص معنویت اور اہمیت رکھتا ہے، اس کا خلاصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے[1]:۔

"اپنے خطاب میں شہدائے اسلام کے جلسوں کی عظمت اور ان کے بانی مولانا عبدالشکور صاحب مرحوم کے خلوص کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ یکم محرم سے اب تک ان جلسوں میں جن علمائے کرام نے بیانات کئے ہیں، میرے دل میں ان تمام بیانات اور خطابات کی بڑی قدر ہے، میں آپ کو صرف اس وقت ایک ایسا پیغام دینا چاہتا ہوں کہ جو آپ کی زندگیوں میں انقلاب اور معاشرہ میں تبدیلی پیدا کر سکے، میں اپنی حاضری کا اپنے اوپر یہ حق سمجھتا ہوں کہ آپ کے سامنے کوئی رہنما اصول پیش کروں۔

میں ایک تجربہ کار سیّاح اور تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے کہنا چاہتا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام کو چھوڑ کر سب سے بڑا تاریخ ساز انقلاب انگیز،

---

[1] "قومی آواز" مورخہ ۱۰ر جولائی ۹۳ء کی اشاعت سے وہ نقل کیا جاتا ہے جس میں تقریر کی روح اور اس کا مضمون خوبی کے ساتھ آگیا ہے۔

عہد آفریں فقرہ جس نے ایک نئی تاریخ کی بنیاد ڈالی ذہنوں میں انقلاب برپا کیا، ہزاروں مصلحین، مفکرین، فلاسفر اور عظیم ترین انسان پیدا کئے، پوری ادبیاتِ عالم میں اور ادیان و مذاہب کی تاریخ میں اور معاشرہ پر اثر ڈالنے والے جملوں کی فہرست میں کسی نے اتنا اثر نہیں ڈالا جتنا صدیق اکبرؓ کے جملے "أَيَنْقُصُ الدِّيْنُ وأَنَا حَيٌّ" (میرے جیتے جی دین میں کمی ہو؟) نے اعتقادی، ذہنی، فکری اور عملی اعتبار سے اسلامی تاریخ میں ڈالا، یہی وہ کلمہ ہے جو دل کی ترجمانی کرنے والا، اور لوحِ دل پر نقش کرنے کے لائق ہے، اللہ نے صدیق اکبرؓ کو دین کی بقا و حفاظت کے لئے پیدا فرمایا تھا، اگر آپؓ عزیمت اور استقامت سے کام نہ لیتے تو دین اسلام کی بقا خطرہ میں تھی، آج منکرین زکوٰۃ نے اسلام کے ایک رکن پر حملہ کیا تھا، کل آہستہ آہستہ دوسرے ارکانِ اسلام پر حملہ کیا جاتا، دیگر مذاہب و ادیان کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب ترمیم و تحریف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو پھر وہ نہیں رکتا، یقیناً صدیق اکبرؓ کا یہ قیمتی اور وزنی فقرہ شاعروں کے دیوان اور اسلامی ادبیات میں اپنا ممتاز مقام رکھتا ہے۔

سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے حاضرین کو اس طرف توجہ دلائی گئی کہ اس وقت ملک میں مسلمانوں کے ملی تشخص، دینی عقائد اور اسلامی شعائر کے خلاف منصوبے تیار ہو رہے ہیں، زبان، اور رسم الخط کو بدلنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، پورے ملک میں یکساں سول کوڈ کے لئے راہیں بنائی جا رہی ہیں، اگر آپ R.S.S. اور شیوسینا کے لیڈر بال ٹھاکرے کی

کتابیں پڑھیں تو ان تمام سازشوں کا پتہ چلے گا، نہایت ذہانت، غور وفکر اور فاتونی دانش مندی کے ساتھ ایسا نقشہ بنایا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کی آئندہ نسلیں زبان، لباس کے اعتبار سے بالکل مختلف ہوں، اس لئے ہمیں اپنی ملّی تشخّص کی حفاظت کے لئے نعرۂ صدیقی کو اپنا منشور بنانا چاہئے، گھر لُٹ جائے، جان چلی جائے، مگر ایمان نہ جائے، بھوکے رہ جائیں، مگر نماز نہ چھوٹے، آپ اپنے گھر کے ماحول میں تبدیلی پیدا کریں، انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرت اور صحابہ کرامؓ کے واقعات اپنے بچوں کو سنائیں، اور ان میں اپنے دین پر قائم رہنے اور اس کے لئے ہر طرح کا ایثار اور خطرہ مول لینے کی ہمّت و عزیمت پیدا کریں، اور اسلام و ایمان پر فخر کرنا سکھائیں اور کفر و شرک اور دوسروں کی نقّالی سے نفرت و وحشت پیدا کریں، وہ قرآن شریف کی تلاوت کر سکیں اور اردو میں لکھ پڑھ سکیں، سیرت نبوی، صحابۂ کرام کے کارناموں اور اپنی قدیم تاریخ سے واقف ہوں[1]۔"

راقم کی تقریر کے بعد مولانا قاری محمد صدیق صاحب باندوی نے جو صلحائے وقت اور علمائے کبار میں ہیں مختصر تقریر کی جس میں راقم کی تقریر کی تائید میں چند جملے کہے اور دعا پر جلسہ کا اختتام کیا۔

بعض تلخ حقائق اور قابلِ فکر و تشویش واقعات

قبل اس کے کہ "کاروانِ زندگی" اپنے سفر کے آگے کی منزلیں طے کرے، اور

---

[1] "قومی آواز" مورخہ ۱۰ر جولائی آخری سطروں کے اضافہ کے ساتھ۔

روئیداد سفر بیان کی جائے، دل تھام کر اور ایک ناخوشگوار لیکن ضروری فرض سمجھتے ہوئے ان دو تلخ حقیقتوں اور تکلیف دہ لیکن غور طلب اور قابلِ فکر صورتِ حال کی طرف متوجہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، جو ایک طرف عالمِ اسلام کی سطح پر رونما اور تشویش انگیز ہے، دوسری طرف اندرونِ ملک اور مسلم معاشرہ میں اس سے واسطہ پڑ رہا ہے، اور عزم و عجلت کے ساتھ اس پر قابو پانے کی ضرورت ہے۔

"بنیاد پرستوں" اور "بنیاد پرستی" کے خلاف امریکہ کی عالمی مہم

بعض بلیغ اور عمیق المعانی اشعار ایسے ہیں جو کثرتِ استعمال اور موقعہ بے موقعہ ان سے کام لینے کی وجہ سے اپنی معنویت و گہرائی اور غور طلبی یا سنسنی خیزی کو کھو چکے ہیں، اور یہ معاملہ ہر زبان کے ساتھ پیش آیا ہے، انھیں میں سوداؔ کا یہ شعر ہے ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

اسلامی ذہن و اعتقاد، فکر و نظر اور مسلم معاشرہ و ماحول کو تاریخ کے مختلف وقفوں میں بہت سی انتشار انگیز اور گمراہ کن یا تشکیکی تحریکوں اور دعوتوں کا سامنا کرنا پڑا جن میں اعتزال اور خلق قرآن کا عقیدہ، فلسفۂ یونان سے حد سے بڑھی ہوئی مرعوبیت، اور اس کے مطابق دین کے حقائق و عقائد کی تاویل و تشریح، پھر دورِ آخر میں مغربی فلسفہ اور مغربی تہذیب سے مرعوبیت، اس کے سامنے سپر اندازی، اور اس کے مطابق دین کی اور بعض اوقات قرآن کی تفسیر و تاویل، پھر آخر میں الحاد و لادینیت کا رجحان جو جدید تعلیم اور مغربی اقتدار کے اثر سے بہت سے

مسلم ممالک اور جدید تعلیم یافتہ طبقوں میں پیدا ہوا۔

لیکن ان میں سے کوئی چیز (اپنی وقتی اور مقامی سحر انگیزی اور دل کشی کے باوجود) اسلام کے وجود و بقا کے لئے خطرہ اور اس کو زندگی سے خارج کرنے اور ہر طرح کے اثر اور کامیابی سے محروم کرنے کے لئے ایک گہری سازش اور پھر پورے عالمِ اسلام کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت نہیں رکھتی تھی جتنی امریکہ سے اٹھنے والی بنیاد پرستی اور بنیاد پرستوں (FUNDAMENTALISTS) کے خلاف نعرہ، جدّوجہد اور ایک منصوبہ بند عالمگیر تحریک و دعوت ہے جس میں یہودی دماغ، امریکہ اور یورپ کا دینی و علمی، و فکری، دعوتی سطح پر احساس کہتری . . . (INFERIORITY COMPLEX) اسلام کے دائرہ کی وسعت اور خود مغرب میں اس کی اشاعت و مقبولیت کا خطرہ اور آخر میں روس کے انقلاب کے بعد اسلام اور ایک طاقتور اسلامی دنیا کا (جس میں اسلام کے احیاء اور اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہے، اور اس میں دنیا کے سامنے ایک سحر انگیز نمونہ پیش کرنے کی صلاحیت ہے) مادّہ پرست مغرب کے خلاف ایک طاقتور محاذ بن جانے کا خطرہ شامل ہے، اس کا اصل محرک ہے۔

یہ تحریک جو نشر و اشاعت کے ذرائع، ترغیب و ترہیب، سیاسی و فوجی رشوتوں، وفود کی آمد و رفت، بین الاقوامی مجلسوں اور سب سے بڑھ کر خود اسلامی ملکوں کو اس طبقہ سے خوف زدہ کرنے کے ذریعہ جو ان اسلامی ملکوں میں اسلام کو زندگی میں داخل کرنے اور اس کے احکام پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دینا ہے، پہونچائی اور پھیلائی جا رہی ہے، اور خود مسلم و عرب ممالک میں صاحبِ اقتدار طبقہ، اور نظام تعلیم اور

صحافت و اشاعت کے ذرائع پر قابو رکھنے والے طبقہ میں یہ ہراس پیدا کیا جا رہا ہے، کہ اگر یہ اسلام پسند طبقہ (جس کے لئے "بنیاد پرست" کی اصطلاح ایجاد کی گئی ہے) کامیاب اور حاوی ہو گیا، تو یہ حکومتوں اور رہنما اداروں کے لئے پیغام موت ہوگا، ان کو ہر طرح کے اقتدار اور نفوذ و اثر سے محروم ہونا پڑے گا، بلکہ ان کو ان ملکوں میں زندگی گذارنی بھی مشکل ہو جائیگی، جہاں وہ سیاہ سپید کے مالک اور مطلق العنان حاکم ہیں۔

یہ خیال مسلم و عرب ممالک میں تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے اور مقبولیت حاصل کر رہا ہے، بعض ملکوں میں (جن میں افریقہ کے متعدد عرب ممالک الجزائر، تیونس، لیبیا پیش پیش ہیں، اور مصر نے بھی اب اس دائرہ میں قدم رکھ دیا ہے) اب ساری توجہ اور جدّ و جہد اسی طبقہ اور جماعت کو بے اثر بنا دینے، بلکہ ان کے خطرہ سے مستقل طور پر مامون و محفوظ ہو جانے پر مرکوز ہو گئی ہے جو دین کا علانیہ نام لیتا ہے، معاشرہ کو دینی تعلیمات اور اسلام کی معاشرتی و اخلاقی اور شرعی تعلیمات کا عامل و حامل اور اس کا نمونہ دیکھنا چاہتا ہے، کہیں اس طبقہ کے لئے "متشدّد دین" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، کہیں "متزمتین"، کہیں "رجعیین" کا، کہیں "مبدئیین" کا، کہیں "اصولیین" کا، ان کے خلاف بڑے بڑے ذمہ داران حکومت تقریریں کرتے ہیں، ان کے متعلق عالم اسلامی کے علماء سے استفسار اور استفتاء کیا جاتا ہے، حکومت کے ترجمان یا ہم خیال اخبارات و رسائل میں مضامین نکلتے ہیں، کانفرنسیں اور سیمینار ہوتے ہیں، اور اب ڈر یہ ہے کہ شاعر کا یہ مصرعہ۔ ع

تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

——— حقیقت نہ بن جائے، بلکہ اس سے بڑھ کر مرغ قبلہ نما کی زبان سے یہی الفاظ نہ نکلنے لگیں، جو بہ ترقی پسند ممالک اور امریکہ کے غاشیہ بردار بے محابا اپنی زبان سے نکالتے ہیں، اس وقت یہودیوں اور مسیحیوں کی سازش کو ناکام بنانے کے لئے جو عالم اسلام کے لئے صلیبی جنگوں اور تاتاری حملوں سے بھی زیادہ خطرناک ہے، علمی و فکری، بلاغی (اشاعتی) وسیاسی و تنظیمی، ملکی و بین الاقوامی ہر سطح پر مؤثر جدّ و جہد کی ضرورت ہے کہ جب اسلام کو زندگی سے خارج کر دیا جائیگا، اور اصول و مبادی خطوط و حُدود سب مٹا دیئے جائیں گے، تو پھر وہ دین کہاں باقی رہ جائیگا، جو کفر و ایمان، توحید و شرک، یہاں تک کہ سنّت و بدعت، طاعت و معصیت، صلاح و فسق، صدق و کذب اور حلال و حرام میں فرق کرتا ہے، اور جو صاف کہتا ہے "قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی" (سورۃ البقرہ ۲۵۶) (ہدایت تو گمراہی سے صاف صاف کھل چکی ہے تو جو کوئی طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے اس نے ایک بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا) اور اس کا مطالبہ ہے "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ" (سورۃ البقرہ ۲۰۸) (اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو وہ تو تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے) اور جس کا صاف اعلان ہے "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" (سورۃ آل عمران ۱۹) (یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔)

اس لئے اس وقت اسلام اور مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا چیلنج اور اس کے لئے سب سے بڑا خطرہ وہ تحریک اور مغربی سازش ہے، جو "بنیاد پرستوں" اور "بنیاد پرستی"

کا نام دے کر عمومی مذاہب اور خاص طور پر (اور حقیقتاً) اسلام کے خلاف شروع کی گئی ہے۔

ذہنی انتشار، کردار کشی کی مہم اور شریعتِ اسلامی کے بارے میں بے اعتمادی و پریشان خیالی کی تحریک

ہندوستان میں ملّت اسلامیہ ہندیہ کو اس کے خصائص، اس کی اجتماعی و ملّی شخصیت اور اس کو اس کی ثقافت و تہذیب، بلکہ امتیازی عقائد سے منقطع و محروم کر دینے کی جو منصوبہ بند تحریک چند سال سے ہندوستان میں چل رہی ہے اور جس کی تفصیل و شواہد کتاب کے ابتدائی صفحات میں پیش کئے جاچکے ہیں، اس کا تقاضہ تھا کہ ملّت میں ممکن حد تک اتحادِ خیال، باہمی اعتماد بلکہ علمی تعاون اور علمائے دین اور قائدینِ ملّت کا احترام پایا جائے اور ان کے ساتھ (سُنی سنائی باتوں پر یا جزئی اختلاف کی بنا پر) جرح و تذلیل اور طعن و تشنیع کا معاملہ نہ کیا جائے کہ اس سے ملّت کی خدمت کرنے والوں کے حوصلے پست ہوتے ہیں، ان کی بات کا وزن جاتا رہتا ہے، اور عوام میں نہ صرف علماء و قائدین کے بارے میں بلکہ دین اور شریعت کے بارے میں بھی ایک انتشار، بے اعتمادی، اور اس سے بڑھ کر "فوضویت" (خود رائی اور "انارکی") پیدا ہوتی ہے، اور اس کا ——— بعض ممالک اور تاریخ کے بعض ادوار و عہود میں تجربہ کیا جاچکا ہے، اور تاریخ میں اس کی شہادتیں موجود ہیں، اور یہ بالکل اسباب و مسبّبات کی منطق اور نفسیاتی حقیقت کے مطابق ہے۔

لیکن افسوس ہے اور ایک بڑے خطرہ کی نشانی کہ ہندوستان کی تاریخ کے اس دور میں (جو خاص طور پر تقسیم ہند کے بعد شروع ہوتا ہے) یہ افسوسناک صورتِ حال

مشاہدہ اور تجربہ میں آرہی ہے کہ مستند علمائے دین مخلص قائدین اور سرگرم عمل اور نہ صرف مفید بلکہ ضروری تنظیمات مجالس اور تحریکیں، اعتراضات و شبہات ہی نہیں، بلکہ الزامات، اور مخالفانہ پروپگنڈے، اور جرح و تنقید کا نشانہ بنی ہوئی ہیں، اس میں سیاسی رقابت اور صحیح تر الفاظ میں "قائدانہ مسابقت" اور غیر ذمہ دار ناخدا ترس صحافت (پریس) کا بڑا دخل ہے، اور اس سے تقریباً پوری ملت میں ایک بدگمانی و بے اعتمادی اور مایوسی اور حوصلہ شکنی کی ذہنیت، اور کمزوری پیدا ہوتی جا رہی ہے، اور عوام کی زبانِ حال بعض مرتبہ کہنے لگتی ہے۔ ع،

اب کسے رہنما کرے کوئی؟

اس کی ایک مثال اور شہادت یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ نے ایسے حالات میں کہ جب ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت، اس کے رہنما اور قائدین اور اس کا ہندی اور انگریزی پریس، مسلمانوں کی اپنے عائلی قانون کے تحفظ کے لئے جدّ و جہد، یونی فارم سول کوڈ کی مخالفت اور سپریم کورٹ کے فیصلہ کو تبدیل کرانے کی کوشش کو اس نظر اور احساس کے ساتھ دیکھ رہے تھے، کہ جیسے ہندوستان پر کسی بیرونی طاقت نے حملہ کیا ہے، یا ملک پر بجلی گرنے والی ہے، یا زلزلہ آنے والا ہے[1]، اپنے مطالبہ اور اپنی جدوجہد میں ایسی کامیابی حاصل کی جس کی مثال عرصۂ دراز سے کسی ملّی یا دینی تحریک و جدّ و جہد، یا عمومی مطالبہ کی تاریخ میں نہیں پائی جاتی، اور بالآخر ۵ مئی ۱۹۸۶ء کو پارلیمنٹ نے کھلی ہوئی اکثریت کے ساتھ یہ بل منظور کیا، اور سپریم کورٹ کے فیصلہ کو بدل دیا، اور ایک بظاہر ان ہونی بات ہو کر رہی، اور یہ نتیجہ تھا اس مسئلہ میں مسلمانوں کے اتحاد اور اس کی عمومی و مکمل تائید کا،

[1] اس کی تفصیل "کاروانِ زندگی" کے حصہ سوم میں گذر چکی ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۱۲۳ - ۱۳۸)

ہتدگیر دوروں اور جلسوں کا، اور ہزاروں تاروں کا جو اس مقصد کے لئے دیئے گئے، اور اس سے بڑھ کر اُس حکمت عملی، تعمیری ذہن اور اثباتی (POSITIVE) طرزِ عمل کا جو اس مقصد کے حصول کے لئے اختیار کیا گیا تھا، اس کامیابی کے ساتھ جو اس بل کے کثرتِ رائے سے منظور ہونے کی شکل میں ظاہر ہوئی، یہ پہلو بھی خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ مسلمانوں کے اس طرزِ عمل، تحریک کے طریقۂ کار اور اپنے مطالبہ کو علمی و مثبت انداز میں پیش کرنے کا یہ نتیجہ بھی نکلا کہ اسلامی قانون کے منصفانہ، عاقلانہ و عالمانہ اور دوسرے قوانین کے مقابلہ میں جامع و کامل ہونے کا اعتراف اور تأثر بہت سے غیر اسلامی حلقوں اور قانونی و آئینی ماہروں کے دائرہ میں پیدا ہوا، یہاں پر صرف اس وقت کے وزیر اعظم آنجہانی راجیو گاندھی کے ایک بیان کے نقل کر دینے پر اکتفا کی جاتی ہے، جو انھوں نے ۔ ر اس کے پندرہ[۱۵] روزہ نامل اخبار "تغلق" کے ایڈیٹر چو رانہ سوامی کو جنوری ۱۹۸۶ء میں دیا، انھوں نے کہا: —

"اسلامی قانون ہمارے قانون سے بڑھ کر عورتوں کے حقوق و مفادات کا ضامن ہے، انھوں نے کہا کہ مسلم ماہرینِ قانون، دانشوروں، علماء اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں سے تبادلۂ خیال کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ مسلم پرسنل لا کے حدود میں رہتے ہوئے عورتوں کے حقوق کی کافی ضمانت دی جا سکتی ہے، انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کا احساس ہے کہ عدالتیں مسلم پرسنل لا کی غلط تعبیر و تشریح کر رہی ہیں، اگر عدالتیں اسلامی قانون کی صحیح تشریح کریں تو انھیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

اب اس کا مقابلہ دل پر ہاتھ رکھ کر اور ندامت سے کچھ گردن جھکا کر اس سے کیجئے کہ

جب پرسنل لا بورڈ اپنا اصلاحی اور تعمیری کام کر رہا تھا، اصلاح معاشرہ کی تحریک ملک میں چلائی جا رہی تھی جس کی جہیز کے مطالبہ، اسراف، و فضول خرچی اور نمود و نمائش کی موجودگی میں جو اپنی آخری حد سے بڑھ گئی ہے سخت ضرورت تھی، اور عائلی قانون، نکاح و طلاق کے بارے میں صرف غیر مسلموں ہی میں بے وقعتی نہیں، بلکہ مسلمانوں میں بھی بے اعتمادی پیدا کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی، ایک طلاق اور تین طلاقوں کی بحث چھیڑ دی گئی جس کا اخبارات اور چوراہے پر آنے کا کوئی موقع نہ تھا، اگر غور و فکر اور علمی تحقیق کی کوئی دعوت دینی تھی تو اس کا محل و مقام، علمی و فقہی مجالس، سیمینار اور علمی مذاکرہ کے مواقع اور مرکزی اور بلند پایہ دار العلوم اور مدارس عربیہ کے دار الافتاء اور اس کے ماہرین تھے۔

لیکن بڑے افسوس و معذرت کے ساتھ لکھا جاتا ہے کہ بعض مکاتبِ خیال اور جماعتوں کی طرف سے ایک مجلس کی ایک طلاق اور تین طلاقوں کا مسئلہ اخبارات کے صفحات پر آ گیا، اور چوراہوں پر اٹھایا گیا، اردو اخبارات میں سطحی معلومات رکھنے والے اور قلم سے کام لینے والے اصحاب یہاں تک کہ خواتین کے مراسلے اور قلم برداشتہ تحریریں چھپنے لگیں اور مشکل سے کوئی دن اس سے خالی جاتا، ان تحریروں اور مضامین میں طنز و تعریض اور ایسے جارحانہ اندازِ تحریر کو اختیار کیا گیا جس سے کم سے کم عوام کے دل میں شریعتِ اسلامی اور اس کے مثالی و معیاری دور اور اس کے ماہرین اور نمائندوں کی طرف سے شکوک و شبہات پیدا ہوں، اور وہ ایک بیت بازی اور اظہار ذہانت و خطابت کا موضوع بن جائے۔[1]

---

[1] یہ مہم کہاں سے شروع کی گئی، اور کن لوگوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس سوال کے جواب میں فارسی کے اس شعر پر اکتفا کیا جاتا ہے ؎

تو کریا رنہ پرسد مرا ز خلق کریم   کہ از سوال ملولیم واز جواب خجل

اس کا ایک افسوسناک بلکہ شرمناک نتیجہ یہ نکلا کہ ہندی اور انگریزی اخباروں کو طنز و تعریض بلکہ تمسخر کا ایک موضوع، اور مسلمانوں کے دینی نظام اور اسلامی شریعت و قانون کی توہین و تذلیل کے لئے ایک حربہ مل گیا، جن لوگوں نے ان دنوں میں ہندی و انگریزی اخبارات کے تبصرے، اس سلسلہ کے لطیفے، چوٹیں اور چٹکیاں اور ان واقعات کا، جو نفس طلاق کے ایک ظالمانہ فعل ہونے، اور مطلّقات کی بے کسی و بے بسی اور مسلمانوں کا بطور تفریح کے اس سے کام لینے کے ثبوت میں لکھے گئے ہیں، کا مطالعہ کیا ہے، ان کا سر ندامت سے جھک جاتا ہے، اور اسلامی شریعت کی اس توہین و تذلیل کو پڑھ کر ان کا خون کھولنے لگتا ہے، اور ان کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے، اور ان کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اس کا موقعہ اس عجلت اور جذباتیت اور کوتاہ اندیشی نے دیا، جو ہمارے بعض علمی حلقوں اور مکاتبِ خیال کی طرف سے ظاہر ہوئی۔

زندگی کا طویل ترین سفر

یوں تو راقم نے یورپ و امریکہ کے طویل سفر کئے ہیں، جن کا تذکرہ "کاروانِ زندگی" کی گزشتہ جلدوں میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے، پہلے اسلامک سنٹر واقع جنیوا (سوئزرلینڈ) کے جلسوں میں شرکت کے لئے کئی بار جانا ہوا جن کے دوران انگلستان، فرانس، جرمنی اور اسپین کے بھی سفر ہوئے جن کا تذکرہ "کاروانِ زندگی" کی جلد دوم[1] میں تفصیل سے آچکا ہے، پھر امریکہ کا طویل المیعاد اور طویل المسافت سفر ۱۹۷۷ء میں پیش آیا جس میں امریکہ کے تقریباً تمام اہم شہروں اور مرکزوں میں جانا ہوا جس میں کناڈا کا سفر بھی

---

[1] ص ۴۸۶-۴۹۶-۵۰۸۔

شامل ہے اور جو ۲۸ مئی ۱۹۷۷ء سے شروع ہو کر ۶ اگست ۱۹۷۷ء کو اختتام پذیر ہوا،[1]
پھر جولائی ۱۹۸۳ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے ملحق اسلامک سنٹر کا قیام عمل میں آیا،
اور ناچیز کو اس کا چیرمین (صدر) منتخب کیا گیا، اور اس کے سلسلہ میں پہلی مرتبہ
۲۰ / ۲۱ جولائی ۱۹۸۳ء کو عزیزی مولوی محمد رابع ندوی سلمہ کی معیت میں لندن
جانا ہوا،[2] اس کے بعد ہر سال اسلامک سنٹر کے جلسوں میں شرکت کے لئے انگلستان
جانا پڑتا رہا، اور اکتوبر ۱۹۸۵ء میں لکسم برگ (بلجیم) کا بھی سفر ہوا جس میں ایک
اسلامی تحقیقی کمیٹی میں شرکت کرنی تھی،[3] اس کے بعد سے سنٹر کے جلسوں میں شرکت
کے لئے تقریباً ہر سال سفر کا سلسلہ جاری رہا۔

لیکن ۱۹۹۳ء کے اگست و ستمبر کے مہینوں میں جب عمر و صحت زیادہ طویل سفروں،
عظیم ذمہ داریوں کے تحمل، اور شدید مصروفیتوں کے (طبعی و ظاہری طور پر) قابل و
متحمل نہیں رہی تھی، بظاہر (والغیب عند اللہ) عمر کے سب سے طویل المسافت،
متنوع المقامات اور اہم اجتماعات میں شرکت اور بعض کی صدارت کے لئے سفر اختیار
کرنا پڑا جو اس وقت تک زندگی کا طویل ترین سفر ہے، اور جس میں تین برّ اعظم یورپ
امریکہ اور ایشیا شامل ہیں، یہ سفر استنبول (قدیم قسطنطنیہ) لندن، آکسفورڈ، شکاگو
نیویارک، جنیوا (سوئٹزرلینڈ) ہوتا ہوا، حجاز مقدس پر ختم ہوا جس میں مدینہ طیبہ
کی زیارت اور مکہ معظمہ کی حاضری کی سعادت بھی نصیب ہوئی، جہاں عمرہ کا

---

[1] ملاحظہ ہو عزیزی مولوی محمد رابع ندوی کی کتاب "دو مہینے امریکہ میں"۔

[2] ملاحظہ ہو "کاروانِ زندگی" ص ۳۷۷-۳۸۱ جلد دوم۔

[3] "کاروانِ زندگی" جلد سوم ص ۱۰۶

شرف حاصل ہوا، یہ سفر عافیت با لخیر بن گیا۔

اس سفر میں ایک آزمائش کی بات اور فکر و تردّد کی وجہ یہ بھی تھی کہ اپنے چھوٹے سے خاندان میں شدید چوٹ اور فریکچر کے چار واقعات قریبی زمانہ میں آچکے تھے جس میں دو سنگین حادثے خاص اپنے گھر میں تھے، ان مریضوں کو صاحبِ فراش چھوڑ کر اتنا طویل سفر ایک آزمائش تھی، لیکن ضرورت اور تقاضوں سے مجبور ہو کر توکّلاً علی اللہ سفر کرنا پڑا، اور پورے سفر میں صحت و شفا کی دعا کا معمول رہا۔

اس طویل اور متنوّع المقامات کی تقریب یہ ہوئی کہ رابطۃ الادب اسلامی کی مجلس امناء (سکریٹریٹ) اور مؤتمر عام کا جلسہ اس مرتبہ پھر بعض انتظامی سہولتوں اور مقصد کے معاون اسباب کی بنا پر ۳ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ (۲۰ راگست ۹۳ء) یا ۸ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ (۲۵ راگست ۹۳ء) کو استنبول میں ہونا طے پایا، جس میں ناچیز کی بحیثیت صدر عام اور عزیزی مولوی محمد رابع ندوی کی بحیثیت نائب صدر اور غیر عرب ممالک کے شعبہ و سکریٹریٹ کے ذمّہ دار کی حیثیت سے شرکت ضروری تھی، دوسری طرف آکسفورڈ کے سنٹر آف اسلامک اسٹیڈیز کا سالانہ جلسہ یکم اور ۲ ستمبر کو طے تھا، جس کے لئے ۲۸، ۲۹ راگست کو لندن پہونچنا ضروری تھا۔

اس پر اضافہ یہ ہوا کہ شکاگو (امریکہ) میں مذاہب کی ایک عام بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد طے ہو گیا تھا جو ۲۸ راگست ۱۹۹۳ء سے ۵ ستمبر ۱۹۹۳ء تک جاری رہنے والی تھی، اور جس میں دنیا کے مختلف مذاہب و ادیان کے ماہرین، مذہبی پیشواؤں اور فضلاء و نمائندوں کو دعوت دی گئی تھی، یہ بین الاقوامی کانفرنس سو برس پہلے اسی جگہ ۱۸۹۳ء میں ہوئی تھی، جس میں کہا جاتا ہے کہ مشہور ہندوستانی مذہبی پیشوا سوامی وویکانند نے

شرکت کی تھی، اور خطاب کیا تھا، اس کانفرنس کے لئے ایک عالمی اور بین الاقوامی معیار اور سطح سے انتظام کیا گیا تھا، اس میں مذاہب کا تعارف، ان کی وضاحت اور افادیت کا بیان اور ان کی مادّہ پرستی بلکہ نفس پرستی، مذہب بیزاری، الحاد و دہریت کے چیلنجوں کے مقابلہ کی صلاحیت کا اظہار مطلوب تھا، اور اس لادینیت، مذہب دشمنی، اور روحانیت بیزاری کے مقابلہ میں ایک متحدہ محاذ بنانے کے امکانات پر غور کرنا تھا۔[1]

راقم کو بھی اس بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ اس کے (EXECUTIVE DIRECTOR) کی طرف سے (جس پر ۵ راگست ۱۹۹۳ء کی تاریخ اور ان کے دستخط ہیں) براہِ راست ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر موصول ہو گیا تھا، اور جس میں اظہار کیا گیا تھا کہ اس میں مختلف مذاہب اور ممالک کے چار ہزار (۴۰۰۰) نمائندوں کی شرکت کی امید ہے، اور ۷۵۰ مباحث، ورکس شاپ، پینل، سمینار اور کلچرل پروگراموں کا انتظام کیا گیا ہے، اور اس کی کارروائیوں، نتائج بحث و تحقیق کی عالمی پیمانہ پر اشاعت کا بندوبست ہے۔

راقم عام طور پر ایسی کانفرنسوں کے نتائج اور انجام سے جن کے پیچھے کسی مخلص و دردمند اور مؤیّد من اللہ جماعت یا فرد کا ہاتھ نہ ہو، اور اس کو اس کی سرپرستی حاصل نہ ہو، واقف تھا، اور یہ بھی شبہ تھا کہ اس کے پیچھے حکومت امریکہ کا ہاتھ نہ ہو جو اس بدنامی، اور مذاہب کے حلقوں میں اس کے اصول پرستی (FUNDAMENTALISM)

---

[1] یہ تفصیل اس کانفرنس کے جاری کردہ اشتہار بعنوان THE PARLIAMENT OF THE WORLD'S RELIGIONS CHICAGO ILLINOIS, U.S.A. کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔

کے خلاف پروپگنڈہ اور محاذ آرائی اور عالمی دعوت سے جو تنفّر پیدا ہو گیا ہے، اس کو مٹانے کے لئے اس کی سرپرستی کر رہی ہو، یا اس میں اس کا ایماء و اشارہ شامل ہو، پھر اپنی صحت کی کمزوری، سفر کی طوالت، اور اس شک و تردّد کی بنا پر کہ اس کو کہاں تک آزادی سے اظہار خیال کا موقعہ مل سکے گا، اور مذاہب اور خیالات کے اس دنگل اور نمائش گاہ میں کہاں تک اس کے اس طویل اور پُر مشقّت سفر کی قیمت وصول ہو سکے گی، اس سفر کے لئے تیار نہیں تھا، اور اس نے سنجیدگی اور فکر کے ساتھ اس پر غور بھی نہیں کیا تھا، مگر اس کے کرم فرما اور محب مؤقّر پٹنہ کے ڈاکٹر احمد عبدالحی صاحب کے پیغامات اور ٹیلیفون پے در پے آئے، اور انھوں نے بڑے اصرار اور تقاضائے قلبی سے اس مذاہب کے کونسل اور پارلیمنٹ میں شرکت کے لئے اصرار کیا جس کا ایک خاص محرّک یہ بھی ہوا کہ ان کے حقیقی اور مؤقّر بھائی حامد عبدالحی صاحب (جو عرصہ سے شکاگو میں ہارٹ اسپشلسٹ ڈاکٹر کی صورت میں مقیم ہیں) اور اس کانفرنس کے انعقاد میں بحیثیت مسلمان اور ایک معزّز شہری کے ان کا تعاون بھی شامل ہے، اور وہ (کسی حد تک) اس کی افادیت کے قائل بھی ہیں، اور قدرۃً چاہتے ہیں کہ اسلام کی اچھی نمائندگی ہو، اس کے خاص طور پر محرّک و متقاضی تھے کہ راقم اس میں شریک ہو اور اسلام کی نمائندگی کرے، یہ اصرار و تقاضہ اتنا طویل اور طاقتور ہوا کہ محترمی ڈاکٹر احمد عبدالحی صاحب سے جن کی محبت و خلوص اور کرم فرمائی کا پٹنہ کے قیام میں خوب اندازہ ہو چکا تھا، اور جن کی دلچسپی اور تعاون اور وقار و اعتماد نے مارچ ۱۹۹۲ء کی اصلاح معاشرہ کانفرنس اور پھر ۹۳ء کی "پیام انسانیت" کے جلسہ کے کامیاب بنانے میں خاص حصہ لیا تھا، انکار نہ کیا جا سکا، اور شرکت کے لئے امکانی کوشش کا وعدہ کر لیا گیا، انھوں نے اس خاص سفر کے لئے

لندن سے راقم اور اس کے رفیق عزیزی مولوی محمد رابع سلمہ کے لئے سفر کی سہولت اپنے برادر عزیز کے ذریعہ مہیّا کروادی، اور وہ پروگرام میں شامل ہوگیا۔

شکاگو کے ساتھ نیویارک کا جُڑ جانا اس لئے ضروری تھا کہ محبّ مخلص وعزیز عثمان صاحب جو امریکن نیشنلٹی رکھتے ہیں، اور نیویارک میں ان کا ذاتی مکان بھی ہے، اور ان کے اہل وعیال وہیں رہتے ہیں، خود سعودی ایرویز میں انجینیر ہیں، وہ عرصہ سے امریکہ آنے اور اپنے مکان پر تھوڑا وقت گذارنے کی خواہش کا کئی بار اظہار کرچکے تھے، اور وہ اس پورے سفر میں ساتھ رہنے کے لئے اور خالص راقم کو آرام پہونچانے کے لئے سعودی عرب سے دہلی آنے والے تھے، تاکہ ذہاباً وایاباً اس سفر میں ساتھ رہیں، اور رفاقت ومدد کریں، اس کے علاوہ نیویارک میں متعدد احباب بھی موجود تھے، اور وہاں کچھ دعوتی خطابات بھی ہوسکتے تھے، اس لئے اس کو بھی شامل کرلیا گیا، یوں بھی لندن سے شکاگو جانے کے لئے اس میں سہولت تھی کہ پہلے نیویارک جایا جائے، اس لئے کہ شکاگو اس سے بھی قریب ہے، اور وہاں سے شکاگو کا سفر کیا جائے۔

نیویارک سے حجاز مقدّس جانا اور اس سفر کی عاقبت بالخیر کرنا ایک طبعی، جذباتی اور دینی تقاضہ تھا، اس لئے اس میں حجاز کو بھی شامل کرلیا گیا، مگر نیویارک سے جدّہ کے لئے کوئی ڈائرکٹ سروس نہ تھی، نیویارک سے جنیوا جانا اور جنیوا سے جدّہ کے لئے ہوائی جہاز اختیار کرنا ضروری تھا، اس لئے وہ بھی شامل ہوگیا، اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اپنے قدیم وعزیز دوست ڈاکٹر سعید رمضان مصری (جو شیخ حسن البنّا شہید بانی تحریک الاخوان المسلمون کے داماد اور اسلامک سنٹر جنیوا کے بانی ہیں) عرصہ سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، جہاز کے انتظار میں چار گھنٹے ٹھہرنا تھا،

اس لئے بھی یہ سفر اختیار کیا گیا اور ان کو ٹیلیفون سے اس پروگرام کی اطلاع دے دی گئی، تاکہ ان سے ملاقات ہو جائے، کہ ہم دونوں میں بڑا عزیزانہ اور مخلصانہ تعلق رہ چکا ہے، اور ان سے سالہا سال سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

ان ممالک کی سردی اور اپنی صحت کی کمزوری کی وجہ سے طے یہ کیا گیا کہ امریکہ سے جدّہ ہو کر مدینہ طیّبہ کی حاضری کی نیت کی جائے، اور وہاں سے احرام باندھ کر مکّہ معظّمہ روانگی ہو کہ اس میں صحت کی بھی رعایت ہو جائیگی اور احرام بھی مدینہ طیّبہ سے باندھا جائیگا، جو عمل نبویؐ اور حجۃ الوداع کی سنت کے مطابق ہوگا۔

یہ سفر کی اجمالی روئیداد ہوئی، اب اس کی قدرے تفصیل ملاحظہ ہو۔

دہلی سے استنبول

۱۹ راگست ۱۹۹۳ء کو جمعرات کے دن صبح ۱۰½ بجے دہلی سے دبئی کو روانگی ہوئی، اس لئے کہ دہلی سے استنبول کے لئے کوئی براہ راست سروس نہ تھی، اس سفر میں عزیزی مولوی محمد رابع سلمہ کے علاوہ عزیزانِ عزیز القدر مولوی سید واضح رشید ندوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء و مدیر خصوصی صحیفہ الرائد (عربی) اور فاضل وادیب عزیز مولوی سعید الرحمٰن ندوی استاد و نائب مہتمم دارالعلوم و مدیر رسالہ البعث الاسلامی (عربی) رفیق سفر تھے کہ دونوں رابطۂ الادب الاسلامی کی مجلس اُمناء کے رکن ہیں، اور اس کی انتظامیہ میں شامل ہیں۔

ظہر کے وقت جہاز دبئی پہونچا، وہاں باوجود عام اطلاع نہ ہونے کے دبئی و شارقہ کے معزّزین، فکر اسلامی کے حاملین اور دینی کاموں کے معاونین خاصی تعداد

ہیں موجود تھے ـــــــ جن میں شیخ عبد اللہ العزیزیؒ، شیخ سالم بن علی المحمود، شیخ سعید احمد لوتاہ (صاحب البنک الاسلامی) اور بھٹکل اور ہندوستان کے متعدد احباب شامل تھے، جن میں سعید نوائط صاحب بھٹکلی، بھائی محمد اسماعیل صاحب، مولوی عبد العزیز صاحب اور عزیزی قاری عبد الحمید ندوی کے ناموں پر اکتفا کی جاتی ہے، حاکم شارقہ شیخ سلطان قاسمی جن سے پرانی ملاقات اور نیاز حاصل تھا، یورپ گئے ہوئے تھے، اسی طرح شیخ سیف الغریر جو بڑے دینی جذبات کے حامل ہیں، وہ بھی باہر تھے، وزارت اوقاف ابوظبی کے ایک بڑے عہدیدار عمر المدفع کے یہاں شارقہ میں دوپہر کا کھانا ہوا جس میں بڑا اہتمام کیا گیا تھا، دبئی کو دیکھ کر جہاں کئی بار جانا ہوا ہے، تعجب ہوا کہ اس نے چند برسوں میں ایسی تمدنی و تعمیری ترقی کی کہ اس پر یورپ کے ایک شہر ہونے کا شبہ ہوتا ہے، پورا شہر عظیم الشان عمارتوں سے معمور نظر آیا، جو کسی داعی اور جزیرۃ العرب کے نظام وپیغام سے واقفیت اور عقیدت رکھنے والے کے لئے کوئی زیادہ خوشی کی بات نہیں ہے۔

استنبول میں

دبئی میں ایک بجے سے چار بجے تک ٹھہر کر تقریباً پانچ بجے عصر کے وقت استنبول کے لئے شارقہ کے ایرپورٹ سے روانگی ہوئی، اور مشرق ومغرب کا فرق ہونے کی وجہ سے رات کو تقریباً ۹ بجے استنبول پہونچ گئے، استنبول کے ایرپورٹ پر استقبال وانتظام کرنے والوں کی ایک اچھی جماعت موجود تھی، جس میں بلاد عربیہ کی شاخ کے ذمہ دار اور استنبول کے داعیوں اور منتظمین کی اچھی تمائندگی تھی۔

ہم لوگوں کا قیام استنبول کے محلہ لالی لے میں سلطان ہوٹل میں ہوا، وہاں جاکر یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ ہمارے رفیق قدیم اور محب مخلص مولانا محمد ناظم صاحب ندوی بھی تشریف لائے ہوئے ہیں اور اسی ہوٹل میں مقیم ہیں، ہم دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے، مولانا بہت ضعیف ہو گئے ہیں، پھر بھی انھوں نے اس طویل سفر کی ہمت کی، آئندہ سطور میں پرانے دنوں کی یادوں اور ان کی مجلسوں کا ذکر ہوگا۔

اگلے دن خوش قسمتی سے جمعہ تھا، جمعہ کی نماز جامع سلطان محمد فاتح (فاتح قسطنطنیہ) میں پڑھی گئی جو مصلّیوں سے معمور تھی، اور ترکوں کی خصوصیات کے مطابق تمام حاضرین تلاوت ونوافل میں مشغول تھے، یا خاموش ومؤدّب بیٹھے تھے، نماز کے بعد سلطان مرحوم کی قبر پر جو مسجد سے متصل ہی ہے فاتحہ پڑھی اور دعائے خیر کی۔

اگلے دن ۲۰/ اگست سے رابطہ کی مجلس امناء کا جلسہ شروع ہو گیا، جو دو دن رہا، ۲۲/ سے ۲۵/ تک رابطہ کی مؤتمر ہیئۃ عامّہ کا جلسہ اور ۲۶/ ۲۷/ کو مجلس امناء کا دوسرا جلسہ ہوا۔

مؤتمر کا اصل موضوع تقریب المفاهيم لقضايا الأدب الاسلامی تھا، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مقامات کے اختلاف وبُعد اور سفر کی صعوبتوں کے باوجود مؤتمر میں بہت اچھی نمائندگی تھی، جس میں ممالک عربیہ میں سے سوریہ (شام) مصر سعودی عرب، بحرین، اردن، اور کویت کے نمائندے تھے، ان کی مجموعی تعداد ۳۱ تھی، ان میں صرف مصر کے ۱۰ نمائندے، شام کے ۴ اور سعودیہ کے ۱۰ ادباء وفضلاء شامل

تھے، اردن کے ۵ بحرین اور کویت کے بھی دو دو نمائندہ تھے، ان کے علاوہ وہ ترکی فضلاء و اہلِ ذوق بھی شریک تھے، جو یا تو عربی سمجھتے تھے یا ترجمانی سے مستفید ہو سکتے تھے، مہمانوں کے قیام کا انتظام سلطان ہوٹل میں تھا، اور تقریباً ہر ایک کو الگ کمرہ دیا گیا تھا، شرکاء میں عزیزی مولوی ضیاء الحسن ندوی بھی شامل تھے، جو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبۂ ادب عربی کے استاد و صدر ہیں، اور رابطہ کے ممبر ہیں، اور اس اجلاس کے لئے عربی کا مقالہ بھی لکھ کر لائے تھے جو پسند کیا گیا۔

مؤتمر ہیئۃ عامہ کا پہلا جلسہ

۳ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ (۲۰ اگست ۱۹۹۳ء) مجلس امناء سکریٹریٹ کا جلسہ ہوٹل کے ہال میں منعقد ہوا، ہال حاضرین سے بھر گیا تھا، آیات قرآنی سے جلسہ کا افتتاح ہوا، پھر بحیثیت صدر راقم کا خطاب ہوا۔

راقم نے خطبۂ مسنونہ اور حمد و صلاۃ اور آنے والوں کے خیر مقدم اور شکریہ کے بعد حاضرین سے اجازت چاہی کہ وہ اپنے خطاب کی ابتدا علامہ اقبال کے چند اشعار سے کرے، جن میں رابطۂ ادب اسلامی کے موضوع اور اس تنظیم کے مقصد و ضرورت کی بہترین ترجمانی ہے، میں نے اردو میں اور کسی حد تک جوش و خوش الحانی کے ساتھ اقبال کے حسب ذیل اشعار پڑھے ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مُغنّی کا نفس ہو | جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں | جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

حُسنِ اتفاق سے وہاں راقم کی کتاب "نظرات فی الأدب"[1] مل گئی جس میں ان اشعار کا ترجمہ ہے، جس کو راقم نے سنایا۔

پھر ان اشعار کی روشنی میں راقم نے کہا کہ ادب کی بڑی خاصیت اور قوت یہ ہے کہ وہ رجحانات ومیلانات اور عمل، طرزِ فکر، اخلاق اور انقلاب کے محرّکات پیدا کرتا ہے، اس لئے وہ بہت مفید بھی ہوسکتا ہے اور بہت مضر بھی، وہ بڑی تعمیری طاقت بھی ہے اور تخریبی بھی، اس لئے اس کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اس کو تعمیر کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، اور تخریب کے لئے بھی اور ان دونوں کے مظاہر ہر دور میں دیکھنے میں آسکتے ہیں، وہ معاشروں کی تخلیق بھی کرسکتا ہے، اور حکومتوں کی تعمیر اور تاسیس بھی، اس لئے اس کی سخت ضرورت ہے کہ اس کو (کتابۃً وخطابۃً، وشعرًا ونثرًا) صحیح رُخ پر لگایا جائے، اور اس سے تخریب، انتشارِ خیال، اور لذّت اندوزی اور نفس پروری کا ذریعہ بننے کے بجائے اس کو خیر پسندی، صلاح وتقویٰ، ضبطِ نفس، اور صحیح رہنمائی کا آلہ اور ہتھیار بنایا جائے[2]۔

سلطان ہوٹل کے ہال میں ۲۰ / ۲۱ اگست کو رابطہ کی مجلس امناء (سکریٹریٹ)

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب "نظرات فی الادب" (مطبوعہ دار البشیر عمان) عنوان "دور محمد اقبال فی توجیہ الادب والشعر" ص ۱۰۹ [2] عربی تقریر کی یہاں اردو میں تشریح کرتے ہوئے وہاں جو کچھ کہا گیا اس کی لفظی پابندی نہیں کی گئی، تقریر کے مقصد اور روح کو سامنے رکھ کر تھوڑے اضافہ کے ساتھ اس کو پیش کردیا گیا۔

کا جلسہ ہوا، ۲۲ سے ۲۵ تک رابطہ کی مؤتمر اور ہیئۃ عامہ کا جلسہ ہوا، پھر ۲۶ اور ۲۷ کو مجلس امناء کا دوسرا جلسہ ہوا، مجلس امناء کے جلسہ میں پوری پابندی کے ساتھ عزیزی مولوی محمد رابع ندوی شریک ہوتے تھے، راقم کو آرام کرنے اور اپنے رفیق قدیم مولانا محمد ناظم صاحب ندوی سے لطف صحبت اٹھانے کا موقعہ ملتا تھا، وہ راقم کے کمرہ میں آجاتے تھے، اور دو دو تین تین گھنٹے لطف مجلس رہتا، ۱۹۳۴ء سے ناچیز کا اور ان کا دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت مدرس کے تقرر عمل میں آیا تھا، اور ۱۹۴۸ء تک وہ دارالعلوم میں استاد اور کچھ عرصہ مہتمم کی حیثیت سے رہے، درمیان میں کچھ عرصہ کے لئے وہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں ادب عربی کے استاد ہو کر چلے گئے تھے، ہم دونوں جب بیٹھتے تو دارالعلوم کے چودہ سالہ قیام کی کتاب کھل جاتی جس میں اپنے، ان کے اور مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم کے لطف مجلس مذاکرات، ادبائے عرب اور ان کی کتابوں پر تبصرہ، علامہ اقبال کی شاعری سے لطف اور قومی تحریکوں پر اظہار خیال اور تاثرات کا سلسلہ جاری رہتا، اور عہد ماضی زندہ اور مرتسم ہو کر آنکھوں کے سامنے آجاتا۔

رابطہ کی مؤتمر اور ہیئۃ عامہ کا جلسہ ۲۲ سے ۲۵ تک رہا، ۲۶، ۲۷ مجلس امناء کا دوسرا جلسہ ہوا، جلسہ کی گذشتہ روایات کے مطابق ایک دن غابۃ بلغراد (بلگریڈ جنگل) میں جو بہت پُر فضا اور خوش منظر مقام ہے اور ساتھ ہی ایک بڑا ہوٹل بھی ہے، ایک مجلس شعر خوانی منعقد ہوئی جس میں متعدد شعراء نے اپنا کلام سنایا، جن میں خالد قحیہ (مصری ادیب و شاعر ظہران یونیورسٹی) بھی تھے، اس مجلس مشاعرہ میں ایک نوجوان شاعر (جو وطناً اور قومیۃً سعودی ہیں) عبدالرحمن عشماوی کا کلام خاص طور پر بہت پسند کیا گیا، ان کا قصیدہ بچہ کی زبان پر فلسطین کا گھر یا مرثیہ اور اس کا سودا کرنے والوں اور

اس میں تساہل برتنے والوں پر عتاب تھا۔

آخری اجلاس میں راقم کے لئے اختتامی تقریر کی جس میں اس نے کہا کہ اسلام اور قرآن کا یہ اعجاز اور عربی زبان کی (قرآن اور نبی عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان ہونے کی وجہ سے) آفاقیت اور عالمگیری کا یہ ثبوت ہے کہ رابطۂ ادب اسلامی کا اجلاس جس کا مرکزی موضوع بحث و فکر ادب عربی ہے، استنبول ترکی میں ہو رہا ہے جس کی زبان عربی نہیں ترکی ہے، اور صدارت کے فرائض اس کو انجام دینے پڑ رہے ہیں، جو ہندی المولود ہے، اور اس کی مادری زبان اردو ہے۔

پھر اس آخری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ عرض کیا گیا کہ اس مجلس اور رابطہ کے ارکان اور شرکاء کو صرف ادبی، لسانی اور تحریری طور ہی پر نہیں، عملاً و سیرۃً بھی ادب اسلامی کا نمونہ اور اس کا عملی ثبوت ہونا چاہئے۔

ترکی کے اس ہشت روزہ قیام میں دوبار استنبول کے ایشیائی حصہ میں جانا ہوا، ایک مرتبہ اپنے عزیز دوست اور اپنی عربی، اردو کتابوں کے سب سے بڑے مترجم یوسف قراجہ کے (جنھوں نے ندوۃ العلماء اور لکھنؤ میں قیام کر کے اچھی اردو سیکھ لی تھی اور وہ راقم کی ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مترجم ہیں) مکان پر جانا ہوا، اور رات کا کھانا کھایا، پھر کھانا ایشیا میں کھا کر یورپ میں آکر سوئے، دوسری مرتبہ والیٔ کوئی منطقہ میں حسن کامل ایلماز کے دولت خانہ پر جو والیٔ کوئی منطقہ میں جو باس فورس کے کنارہ پر واقع ہے، اپنے قدیم دوست امین سراج کی (جن سے قیام مصر ۱۹۵۱ء سے تعلق و تعارف ہے) معیت میں جا کر رات کا کھانا بعد مغرب کھایا، سامنے سمندر اور اس کے کنارہ کا ایسا حسین منظر تھا، جو کم جگہ دیکھنے میں آیا، شرکاء میں ۱۴ ترک احباب

اور مولانا محمد ناظم صاحب ندوی بھی تھے، وہاں سے پھر استنبول کے یورپین حصہ میں آئے اور سلطان ہوٹل میں اپنی جگہ پر پہونچ گئے۔

استنبول کے ہشت روزہ قیام میں سب سے اہم اور مفید تقریب و جس کو حاصلِ سفر کہا جاسکتا ہے، وہ عمومی جلسہ تھا، جو ایک مدرسہ یا انجمن کے ہال میں شہر استنبول میں ہوا، یہاں ایک خالص دعوتی تقریر ہوئی، مضامین کا کچھ ایسا ورود ہوا کہ اس کو القائی کہا جاسکتا ہے، راقم نے قرآن شریف کی آیت:۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ	اور خدا ایسا نہیں کہ تمھارے ایمان کو
إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ	یونہی کھودے، خدا تو لوگوں پر بڑا
رَّحِيمٌ ○ (سورۃ البقرۃ ۔۱۴۳)	مہربان (اور) صاحبِ رحمت ہے۔

پڑھ کر کہا[۱] کہ ناچیز جب یہ آیت پڑھتا ہے تو اس کا ذہن ترکی قوم کی طرف جاتا ہے، اور ذہن میں یہ آتا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ ترکوں کو مخاطب کرکے کہہ رہا ہے کہ تمھارے پاس ایمان کی جو دولت تھی، اور تمھارے اسلاف نے حمایت و حمیّتِ اسلامی کا جو شاندار ثبوت دیا، جہاد کا جھنڈا بلند کیا، بازنطینی شہنشاہی کا دارالسلطنت قسطنطنیہ فتح کیا، خلافتِ اسلامی کی ذمّہ داریاں قبول کیں، مقاماتِ مقدّسہ (فلسطین، قدس اور حرمین شریفین) کی حفاظت کی، اور یہیں ہی نہیں یورپ پر بھی اسلام کی دھاک بٹھادی، اللہ تعالیٰ ان کارناموں کو ضائع نہیں فرمائیگا اور

---

[۱] تقریر عربی میں ہو رہی تھی، اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اس کا ترکی ترجمہ ایک تُرک جو جامع ازہر کے فاضل تھے، ترکی میں کر رہے تھے اور حاضرین بڑے متأثر نظر آرہے تھے، کبھی کبھی ان پر رقّت طاری ہوجاتی تھی۔

بالکلیہ اس نسل کو اس سے محروم نہیں ہونے دے گا، اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝

اور اگر کوئی کہے کہ اس کو تو عرصہ گذر گیا، صدیاں بیچ میں حائل ہیں (اور کم سے کم ایک صدی کے قریب تو ضرور) جب خلافت کا الغاء ہوا اور ترکی قوم کا رشتہ ثقافتی اور تہذیبی حیثیت سے ماضی سے کاٹ دیا گیا) اب اس ایمانی دور اور اسلامی کارناموں کا کہاں تک پاس کیا جائیگا جس سے موجودہ ترکی نسل کا صرف نسلی اور تاریخی تعلق رہ گیا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے (جس کی صفت حکیم، رحیم اور شکور ہے) اس تاثر اور خیال کو زائل کرنے کے لئے سورۂ کہف میں حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کا واقعہ سنایا ہے کہ دونوں ایک بستی میں داخل ہوئے اور وہاں انھوں نے (زبان قال یا زبان حال سے) ضیافت کے اس فریضہ کی طرف متوجہ کیا جس کی ایک شریف بستی سے توقع کی جاتی ہے، لیکن بستی والوں نے یہ توقع پوری نہیں کی، وہاں ایک دیوار گری جارہی تھی اور قریب تھا کہ زمین پر آرہے، حضرت خضرؑ نے اس کو سنبھالا اور جما دیا، حضرت موسیٰ کلیم اللہؑ نے اس پر استعجاب ظاہر کیا، اور اس بستی کے باشندوں کو جنھوں نے ان کی بات بھی نہیں پوچھی اور کھانے سے بھی ضیافت نہیں کی، اس کا مستحق نہیں سمجھا کہ ان کے ساتھ یہ احسان کیا جائے، کم سے کم اتنا ہی کیا ہوتا، کہ اس محنت کی مزدوری لے لیتے جس سے کھانے کا کام چل جاتا۔

حضرت خضرؑ نے اس کا جواب یہ دیا، اور اس کا جواز یہ بتایا کہ یہ دیوار اس شہر کے رہنے والے دو یتیم لڑکوں کی تھی، جن کا باپ ایک نیک صالح آدمی تھا، دیوار کے نیچے خزانہ چھپا ہوا تھا، جو دیوار کے گر جانے سے لوگوں کے ہاتھ لگ جاتا، اور اس نیک بخت آدمی کے لڑکے جو یتیم تھے، محروم رہ جاتے :-

فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِىْ ؕ (سورۃ الکہف۔ ۸۲)	تمہارے پروردگار نے چاہا کہ وہ اپنی جوانی کو پہونچ جائیں پھر اپنا خزانہ نکالیں، یہ تمہارے پروردگار کی مہربانی ہے، اور یہ کام میں نے اپنی طرف سے نہیں کئے۔

تو کیا اُس قوم کی دیوارِ ایمانی کو گرنے اور خاک میں ملنے دیا جائیگا، جس نے کئی صدیوں تک اسلام کا علم بلند رکھا، اور مسلمانوں کے ناموس وعزت کی حفاظت کی؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ بیت اللہ شریف کعبہ کی موجودہ عمارت سلطان مُراد کی بنائی ہوئی ہے، اور مسجد نبوی شریف کی اصل عمارت (جو موجودہ توسیعات اور اضافوں سے پہلے تھی) سلطان عبدالمجید ثانی کی تعمیر کردہ ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کے اس مکالمہ کا ذکر کر کے یہ وضاحت فرما دی کہ اللہ تعالیٰ کسی مرد صالح اور مرد مومن کی نسبت سے اس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی اس کے عمل کو ضائع نہیں فرماتا، اور اس کی اولاد و ورثاء کو بھی اس کا فائدہ پہونچتا ہے، اس لئے اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے، اور اللہ کی اس رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ موجودہ ترکی نسل کو پھر دولتِ ایمان (عمومی ودائمی طور پر) نصیب فرمائے، اور ان کے اسلاف کی ایمانی قوت اور خدمتِ اسلام کے صلہ میں ان کے دفینہ اور ترکہ کی حفاظت فرمائے۔

پھر عرض کیا گیا کہ اگر کوئی کہے کہ اتنی مدت گذر جانے کے بعد اسلام کا (حاکم بدہنا) خزاں رسیدہ پودہ کیسے سرسبز اور بار آور ہوگا، اور دین کا تعلق جو پے درپے حملوں

اور سازشوں کا نشانہ بنا رہا، پھر کیسے زندہ اور بیدار ہوگا، تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرا واقعہ (غالباً حضرت عُزیرٌ پیغمبر کا) بیان فرمایا ہے، قرآن شریف میں آتا ہے کہ وہ ایک ایسی بستی کے پاس سے گزرے جو بالکل زمین بوس ہو رہی تھی، ان کو اس پر استعجاب ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس کو کیسے حیاتِ نو بخشے گا، اللہ تعالیٰ نے ان کو سَو برس کے لئے موت کی نیند سُلا دیا، پھر ان کو زندہ کیا اور ان کو دکھایا کہ وہ خود ہی زندہ نہیں ہوئے، ان کے کھانے پینے کی چیزیں بھی سڑی گلی نہیں ہیں، اور اللہ نے ان کے مردہ گدھے کو بھی حیاتِ نو بخشی، اس پر وہ بول اٹھے کہ میں یقین کرتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔[1]

اس واقعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے جس کو قرآن مجید میں نمایاں طریقہ پر بیان کیا گیا ہے کہ مرورِ زمانہ، انقلابات و حوادث اور سازشوں سے کسی امت یا دین کی حیاتِ نو سے مایوس اور نا امید نہیں ہونا چاہئے کہ:۔

اَنَّ اللّٰہَ یُحۡیِی الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ۔ خدا ہی زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔

ترکی کی اس شاندار ماضی رکھنے والی قوم، اور حمیّت و حمایتِ اسلامی کے جذبہ سے معمور اسلاف کے جانشین اور شاندار تاریخ کی حامل قوم، دولتِ اسلام اور ایمان کی نئی بہار اور خدمتِ اسلام کے لئے مواقع سے محروم نہیں کی جائیگی، قرآن مجید کے ان آیات اور بیان کئے ہوئے واقعات سے یہی سبق ملتا ہے اور تسکین ہوتی ہے۔[2]

---

[1] ملاحظہ ہو آیات سورہ بقرہ پارہ تلک الرسل، آیت ۲۵۹۔

[2] ایک گذشتہ موقع پر جب یہ آیتیں پڑھی گئی تھیں، تو ایک باخبر ترک دوست نے یہ کہا تھا کہ ترکی میں اسلام کے خلاف جد و جہد اور منصوبہ بندی کو جو کامیابی ہوئی اب سَو برس ہو رہے ہیں۔

پھر عرض کیا گیا کہ اس کے لئے شریعتِ اسلامی کی تعلیمات اور قانونِ قدرت کے مطابق خود بھی جدّوجہد کرنی پڑے گی، آپ گھروں میں وہ فضا اور ماحول پیدا کیجئے، سیرتِ نبوی، اسوۂ صحابہؓ کے ساتھ ترک فاتحین ومجاہدین اور اصحابِ عزیمت ایمانی کے واقعات بچوں کو سنایئے، اور دین کی تعلیم دیجئے، پھر آزاد دینی مکاتب ومدارس کا جال پھیلا دیجئے، اس سلسلہ میں ہم نے ہندوستان میں نئی نسل کے دینی وتعلیمی تربیت کے لئے جو کوششیں کی جارہی ہیں، اور مسلمانوں کو ثقافتی، تہذیبی اور لسانی نسل کشی سے بچانے کے لئے جو جدّوجہد اور اقدامات عمل میں آرہے ہیں، اس کا تذکرہ کیا۔

اس کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کا خلافت عثمانیہ کی حمایت، اس کے لئے قربانیاں دینے، اور زبردست تحریک چلانے کا جو دور گذرا ہے، اس کا بھی ذکر کیا، اور اس سے ہندوستان کی تحریک آزادی اور مسلمانوں میں بیداری، اور مغربی اقتدار و تہذیب سے بیزاری کی جو طاقتور لہر پیدا ہوئی، اس کا بھی تذکرہ کیا، اور اس سلسلہ میں اُس زمانہ کا مشہور اور زبان زد شعر بھی پڑھا ؎

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

نیز علامہ شبلی نعمانی کا شعر ؎

زوالِ دولتِ عثمان زوال ملک وملت ہے
عزیزو! فکر فرزند وعیال وخانماں کب تک؟

اس تذکرہ کا بھی ترک سامعین پر بڑا اثر پڑا، اور جلسہ بڑے تاثر اور دینی جذبات کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ وللّٰہ الحمد۔

۲۶؍اگست کو جمعہ تھا، وہ جمعہ جامع سلطان سلیمان قانونی میں پڑھا، جو اسی طرح معمور اور پُر سکینت اور با ادب تھی، جیسے جامع فاتح، یہ مسجد غالباً استنبول کی سب سے بڑی مسجد ہے۔

یہ لکھنا رہ گیا کہ استنبول کے قیام میں دو مرتبہ حضرت سیدنا ابوایوب انصاریؓ کی قبر کی زیارت کی سعادت بھی حاصل ہوئی، جو موجودہ قسطنطنیہ کے ایک سرحدی کنارہ پر واقع ہے، اور مولانا شبلی کے بلیغ کلام میں "میزبان عالم کے میزبان کی ضریح مبارک پر فاتحہ پڑھی"۔

پانچ دن لندن میں

۲۸؍اگست کو بوقت ظہر لندن روانگی ہوئی، عزیزانِ گرامی مولوی سعید الرحمٰن صاحب ندوی، عزیز القدر مولوی محمد واضح ندوی اور عزیزی مولوی ضیاء الحسن ندوی حجاز کے لئے روانہ ہو گئے، جہاں سے عمرہ و زیارت سے فراغت کر کے ان کو براہ راست ہندوستان جانا تھا، استنبول سے اگرچہ ظہر کے وقت لندن روانگی ہوئی تھی، لیکن مشرق سے مغرب کی طرف سفر ہونے کی وجہ سے جب لندن کے ایرپورٹ پر پہونچے تو حنفی حساب سے عصر کا وقت بھی نہیں ہوا تھا۔ محترمی پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی، محب گرامی ڈاکٹر فرحان احمد نظامی اور عزیزان مکرمان سرور احمد لکھنوی اور مولوی محمد اکرم ندوی ہوائی اڈہ پر استقبال کے لئے موجود تھے، اول الذکر حضرات کے ساتھ سیدھے آکسفورڈ کے لئے روانہ ہو گئے جو لندن سے پچاس میل کے قریب ہے[1]۔

---

[1] لندن میں کلومیٹر کے بجائے اب بھی میل ہی چلتے ہیں۔

آکسفورڈ میں حسب معمول ڈاکٹر فرحان احمد نظامی کے مکان پر قیام رہا جہاں پہلے سے ان کے والد محترم فاضل گرامی پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی مقیم تھے، سنٹر آف اسلامک اسٹیڈیز کا جلسہ یکم اور ۲ ستمبر کو ہونا تھا، اس لئے تین دن فرحان نظامی صاحب کے مکان پر گذرے جس کی سب سے بڑی لذّت اور مفید مصروفیت مؤرخ کبیر پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کی مجالس تھیں، جن میں دن کا بڑا وقت گذرتا تھا، اور بڑی مفید و معلومات افزا گفتگو رہتی تھی، پروفیسر صاحب "تاریخ دعوت و عزیمت" کے پانچویں حصہ جو حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے مخصوص ہے، بہت متاثر ہیں، مشکل سے کوئی بڑی مجلس اس کے تذکرہ سے خالی ہوتی، وہ اس کو اس موضوع پر بڑا مستند مآخذ اور معلومات افزا دفتر سمجھتے ہیں۔[1]

ان دو دنوں میں راقم اور عزیزی محمد رابع کو سنٹر کے کاموں کے دیکھنے کا موقع ملا اور اس سے بڑی خوشی ہوئی، سنٹر میں عالمِ اسلامی کے تاریخی و ثقافتی اٹلس کی تیاری کا کام ہو رہا ہے، جس کے ساتھ ساتھ تاریخ اسلام پر ایک وسیع اور معیاری کتاب ۱۲ جلدوں میں تیار و شائع کرنے کا انتظام بھی شامل ہے، اس کام کو تاریخ اسلام کے ماہروں کے درمیان تقسیم کیا جا رہا ہے، اس کے علاوہ آکسفورڈ یونیورسٹی کی لائبریری کے اسلامی مخطوطات کی فہرست تیار کرانے کا کام بھی شروع ہو گیا ہے، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کی معرکۃ الآراء کتاب "نزہۃ الخواطر" کی آٹھ جلدوں

---

[1] افسوس اور محلِ تعجب ہے کہ ہمارے ہندوستان کے دینی، علمی و مدرسی حلقوں میں اس کتاب کو وہ اہمیت نہیں دی گئی، اور اس سے استفادہ نہیں کیا گیا جس کی وہ مستحق تھی، حالانکہ ان مدارس اور دینی و اصلاحی کوششوں کا سلسلۂ نسب شاہ صاحب کی ذات اور ان کے خاندان ہی پر منتہی ہوتا ہے۔

کو کمپیوٹرائز کر لیا گیا ہے، جس شخصیت یا جس کتاب یا مقام کا حال معلوم کرنا ہو، کمپیوٹر سے فوراً معلوم ہو سکتا ہے، اس کتاب کو انگریزی میں منتقل کرنے کا بھی منصوبہ ہے۔

یکم اور ۲ ستمبر کو سنٹر کے اجتماعات تھے، جن میں مقامی ارکان اور یونیورسٹی کے نمائندوں کے علاوہ ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف (سابق سکریٹری جنرل رابطۂ عالم اسلامی وحال نائب رئیس مجلس شوریٰ) اور فاضل گرامی شیخ یوسف القرضاوی، سلطنت برونائی کے نمائندہ اور سنٹر کے رکن کی حیثیت سے وہاں کے وزیر تعلیم شیخ عبدالعزیز شریک تھے۔

راقم نے پہلے عربی میں حمد و ثنا کے بعد حاضرین کا خیر مقدم کیا، اور اس پر شکر ادا کیا کہ خدا نے زندگی میں اتنی وسعت عطا فرمائی کہ پھر اس مفید مجلس میں شرکت کا موقعہ ملا، پھر مختصر طور پر انگریزی میں اپنی صدارتی ذمہ داری کو ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف کی طرف منتقل کیا جو اس مجلس کو (CONDUCT) کریں گے، اس لئے کہ مجلس کی کارروائی انگریزی ہی میں ہوتی تھی، اور وہ اس پر پوری قدرت رکھتے ہیں، اور مجالس کی صدارت کا وسیع تجربہ بھی۔

ازبکستان میں امام بخاریؒ کے مدفن کے قریب ایک یادگار اور علمی ادارہ قائم کرنے کی تجویز اور اس کا منصوبہ عرصہ سے زیر غور ہے، جس میں صدر جمہوریہ ازبکستان اسلام کریموف بھی دلچسپی لے رہے ہیں، اور اس کے لئے علم حدیث سے اشتغال رکھنے والے اور امام بخاری کی قدر و منزلت اور ان کے علمی کارنامہ پر روشنی ڈال سکنے والے نامور علماء کو بھی مدعو کرنے کا خیال ہے، اور اس کے لئے اکتوبر کا آخری عشرہ مقرر ہوا ہے، صدر جمہوریہ ازبکستان کے ساتھ اسلامک سنٹر کا اس سلسلہ میں

ایک معاہدہ بھی ہوگیا ہے، جس کو وہاں کی حکومت عمل میں لا رہی ہے۔

۲ر ستمبر کا یہ اجلاس بخیر و خوبی ختم ہوا جو (RANDOLF HOTEL) میں ہو رہا تھا اجلاس کے بعد دوپہر کا کھانا ہوا، اور تقریباً سب مہمان وہیں سے رخصت ہوئے۔

۲ر ستمبر کی شام کو حسبِ قرارداد عزیزی عطاء اللہ پاکستانی اپنی کار لے کر آئے اور ہم لوگ آکسفورڈ سے لندن مسرور صاحب کے مکان پر منتقل ہو گئے، اگلے دن جمعہ کو ان کی نو تعمیر شاندار مسجد (NORTH LONDON MOSQUE) میں جمعہ کی نماز ادا کی، نماز سے پہلے راقم نے خطاب کیا، جمعہ پڑھا اور اپنے مستقر پر واپس آئے اور کچھ ٹھہر کر ایر پورٹ روانہ ہو گئے، جہاں عصر کی نماز پڑھی اور غروب آفتاب سے پہلے نیویارک کے لئے روانہ ہو گئے، بھائی محمد عثمان صاحب نے وھیل چیر (WHEEL CHAIR) اور فرسٹ کلاس کی آگے کی سیٹوں کا انتظام کر دیا تھا، سات گھنٹے کے سفر کے باوجود بعد عشا نیویارک پہنچے، جہاں ہمارے استاد ماسٹر سمیع صدیقی صاحب مرحوم کے تینوں صاحبزادے ڈاکٹر احمد مطیع صدیقی، فصیح احمد صدیقی، ڈاکٹر رضی احمد صدیقی، اور جناب ہدایت حسین صاحب معتمد مالیات ندوۃ العلماء کے صاحبزادہ ساجد حسین صاحب مرحوم امین سلونوی صاحب کے صاحبزادہ ڈاکٹر عرفان امین اور بعض دیگر احباب موجود تھے، رات برادرم عثمان صاحب کے بنگلہ پر جو نیویارک سے متصل (LONG ISLAND) میں ہے آرام کر کے ۴ر ستمبر کو شکاگو کے لئے روانہ ہو گئے۔

شکاگو میں

شکاگو امریکہ کا (آبادی، وسعت اور عمارتوں کی رفعت کے لحاظ سے غالباً

سب سے بڑا آباد دوسرے نمبر کا شہر ہے) اس میں مسلمانوں کی آبادی ڈھائی لاکھ ہے ۱۹۷۶ء میں جب (M. S. A.) کی شرکت اور آنکھ کے آپریشن کے سلسلہ میں امریکہ کا سفر ہوا، جو دو مہینے کے قیام پر محیط تھا تو شکاگو تین مرتبہ جانا ہوا، تیسری بار سید عظمت اللہ صاحب قادری حیدرآبادی (سول انجینیر شکاگو) کے مکان پر دس روز قیام رہا، اس مرتبہ بھی جب ان کو امریکہ آنے کے قصد کا علم ہوا تو کئی بار لکھنؤ ٹیلیفون کیا کہ قیام ہمارے ہی یہاں رہے گا، پھر بار بار عزیزی مولوی محمد رابع سلمہ سے پوچھتے رہے کہ مولانا کے کیا معمولات ہیں، کیا چیزیں مرغوب ہیں، کن چیزوں کا پرہیز ہے، وغیرہ وغیرہ، اس لئے یہ طے کر لیا گیا کہ شکاگو میں قیام انھیں کے دولت خانہ پر رہے گا۔

صبح ۷۔۸ بجے نیویارک سے شکاگو کے لئے کنیڈی ایرپورٹ سے پرواز تھی لیکن اچانک معلوم ہوا کہ وہ فلائٹ منسوخ ہوگئی، اس لئے نیویارک کے دوسرے ایرپورٹ سے پرواز کا فیصلہ کیا گیا، شکاگو کے میزبانوں اور ان احباب کو اطلاع دینی تھی، جن کی شکاگو ایرپورٹ پر آنے کی امید تھی کہ فلائٹ بدل گئی ہے لیکن عجلت میں اس کا موقعہ نہ مل سکا، محبی عثمان صاحب نے ہوائی جہاز پر بیٹھ کر اس کی پرواز کے بعد وہیں سے ٹیلیفون کیا، پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ امریکہ میں ہوائی جہاز پر بھی ٹیلیفون کرنے کی سہولت ہے، ہم لوگ ۹۔۱۰ بجے کے قریب شکاگو پہونچے تو ڈاکٹر احمد عبدالحی صاحب، ان کے بھائی حامد عبدالحی صاحب سید عظمت اللہ صاحب ایرپورٹ پر موجود تھے، ۴ ستمبر کا دن تھا، اور مذاہب کانفرنس کی آخری نشست تھی، اس میں ہماری شرکت ممکن نہ تھی معلوم ہوا کہ ہمارا مضمون جو انگریزی میں ٹائپ کر کے بھیجا گیا تھا، اور جس کا عنوان "انسانیت پر پیغمبر اسلام اور ان کے لائے ہوئے دینِ اسلام کے احسانات اور اس کے عہد آفریں عطیات و انقلابات"

عنوان تھا، چھپوا کر تقسیم کر دیا گیا تھا، اور شکاگو سے نکلنے والے مسلم جرنل (MUSLIM JOURNAL) کی تازہ اشاعت میں اس کی پہلی قسط بھی شائع ہو گئی تھی، کانفرنس میں خطابات اور تقریروں کی نشست میں شرکت کا موقعہ نہ ہونے کی بنیاد پر محبّ محترم ڈاکٹر احمد عبدالحی صاحب اور ان رفقاء کی جو مسلمانوں کی نمائندگی کر رہے تھے، یہ مشورہ ہوا کہ مغرب کے بعد کی آخری نشست میں جو اختتامی کلمات اور دعا کے لئے مخصوص ہے، ہم شریک ہوں، دعا کرتے ہوئے کچھ دعوتی اور اسلام کے بارے میں تعارفی کلمات کہدیں، انھوں نے منتظمین جلسہ سے بات کر کے اس کو پروگرام میں بھی شامل کرا دیا، اور اس کی اجازت لے لی، ناچیز کو اس دعائیہ اور اختتامی نشست میں شرکت کرتے ہیں بڑا تردّد تھا کہ معلوم نہیں کیا سننا اور کیا دیکھنا پڑے، اور یہ بھی خیال تھا، دلائی لاما اور دوسرے مذہبی پیشوا اس کی سربراہی کریں گے، لیکن ایک عزیز رفیق کے اس کہنے کی بنا پر کہ آپ کا سفر اس کانفرنس میں شرکت کے نام سے ہوا ہے، لوگ اسی کے متوقع ہیں، اور انھوں نے اس کی ذمہ داریاں قبول کیں، آپ بالکل شریک نہ ہوں گے تو محسوس کیا جائیگا، میں نے بادل ناخواستہ اس کو منظور کر لیا، اور عصر کے بعد کانفرنس کے جائے انعقاد تک جو بڑے فاصلہ پر تھی، اپنے میزبان اور رفقا کے ساتھ پہونچ گیا، وہاں جب پہونچا تو دیکھا کہ ایسی زبان میں جو سمجھ میں نہیں آتی "ذکر جہری" ہو رہا ہے، جس میں معلوم نہیں کسی معبود غیر اللہ ــــ کا نام لیا جا رہا ہے، یا کسی دیوتا کا، منظر میں یہ نظر آیا کہ میدان میں مردوں سے زیادہ عورتیں ہیں، طبیعت پر بڑی وحشت طاری ہوئی خیال ہوا کہ معلوم نہیں آگے کیا کیا دیکھنا اور سننا ہو گا، ڈاکٹر احمد عبدالحی صاحب نے اسٹیج پر پہونچ کر میری آمد کی اطلاع بھی کر دی تھی، اور میری دعا اور تقریر کی منظوری بھی

لے لی تھی، جلسہ کے ایک بڑے ذمہ دار عیسائی پادری نے باہر آکر ہمارا استقبال بھی کیا تھا، لیکن طبیعت نے کسی طرح شرکت گوارا نہیں کی، محترمی حامد عبدالحی صاحب نے میرا تأثر اور فکر دیکھ کر واپس جانے کی تجویز کو منظور کرلیا، اور کانفرنس کے اسٹیج پر جاکر ڈاکٹر احمد عبدالحی صاحب کو اس کی اطلاع دینی چاہی، مگر وہ مل نہ سکے، وہاں ٹیکسی کا ملنا بھی مشکل تھا، لیکن اللہ نے ایسی ٹیکسی کا انتظام کردیا، جس کا ڈرائیور اردن کا ایک مسلمان تھا، ہم کار پر بیٹھ کر اپنی قیام گاہ پر آگئے، لیکن رات بھر تردد رہا کہ ڈاکٹر احمد عبدالحی صاحب کو اس طرز عمل سے تکلیف نہ پہونچی ہو اور اپنی خفت محسوس نہ ہوئی ہو، صبح میں نے محمد رابع سلمہ، سے کہا کہ تم احمد عبدالحی صاحب کو ٹیلیفون کرکے اندازہ کرو کہ ان کو کچھ شدید ناگواری تو نہیں ہوئی، ابھی بات ہو رہی تھی کہ میں نے رسیور اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور ان سے معذرت کے انداز میں گفتگو کی، انھوں نے کہا کہ مولانا بہت اچھا ہوا کہ آپ دعا اور آخری نشست میں شریک نہیں ہوئے، آپ تشریف رکھتے تو مجھے بڑی شرمندگی ہوتی، وہاں تو ڈانس بھی ہوا، یہ سُن کر نا چیز نے اللہ کا شکر ادا کیا، اور "ولکن اللّٰہ سلّمَ" کہا (لیکن اللہ نے صاف بچا لیا) کی آیت کا استحضار ہوا۔

شکاگو کے سہ روزہ قیام میں آنے والے احباب سے اور بعض دوسرے قرائن اور اندازوں سے معلوم ہوا کہ یہ بین الاقوامی مذہبی کانفرنس حقیقتاً ایک مذہبی مشاعرہ تھا، جس میں گویا اپنے اپنے مذہب کی شان میں غزلیں پڑھی گئیں، نہ مذہب حق کی تحقیق و تجسس کا جذبہ تھا، نہ دنیا میں پھیلی ہوئی مادیت، نفس پرستی اور تخریبی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کا عزم و حوصلہ، یہ بھی معلوم نہیں ہوسکا کہ مسلمان نمائندوں میں سے

کس نے کس نے تقریر کی اور کیا کہا، اور اس کا کیا اثر ہوا، ان معلومات و اندازوں کی روشنی میں اپنی عدم شرکت کا کچھ زیادہ افسوس نہیں ہوا۔

۵ ستمبر کو مسلمانوں کی ایک کانفرنس اسٹیٹ آف اُمّہ کانفرنس کا مالکم ایکس کالج ہال میں جلسہ تھا، اس میں صبح ۱۰ بجے شرکت کی اور اپنا وہ مضمون پڑھا جو مغربی تہذیب کی تنقید اور اس سے مایوسی اور شکایت پر مبنی تھا[۱]، اور جس کا اختتام علّامہ اقبال کے ان دو شعروں اور ان کی شرح پر کیا گیا تھا ؎

بادہ ایام کہ بودم درخمستان فرنگ — جام او روشن تراز آئینہ اسکندر ست
جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل — عقل ناپروا متاع عشق را غارتگر ست

در ہوائیش گرمیٔ یک آہ بے تابانہ نیست
رند این میخانہ را یک لغزش مستانہ نیست[۲]

نکا گو بلکہ امریکہ کے سفر کا ماحصل اسی مضمون اور اظہار خیال کو سمجھتا ہوں۔

اسی دن شام کو قبل مغرب پھر اسی ہال میں جلسہ ہوا، ہال تقریباً بھرا ہوا تھا،

---

[۱] یہ ایک واضح اور طاقتور مضمون تھا جو ۱۹۸۳ء میں اسلامک سنٹر آکسفورڈ کے جلسہ کے موقع پر اہل علم اور پروفیسر صاحبان کی ایک مجلس میں پڑھنے کے لئے "اسلام اور مغرب" کے عنوان پر تیار کیا گیا تھا، مضمون اصلاً اردو میں تیار کیا گیا تھا، محبی سید محی الدین صاحب نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا، وہ ۲۲ جولائی کو اکزامینشن ہال آکسفورڈ یونیورسٹی کے جلسہ میں پڑھا گیا، مقالہ اردو، عربی، انگریزی تینوں زبانوں میں اسی عنوان سے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔

[۲] اس مضمون کا ایک طویل اور اہم اقتباس جس میں اقبال کے ان دو شعروں کی تشریح اور تطبیق کی ہے، "کاروانِ زندگی" حصہ دوم کے صفحات ۳۷۸۔۳۸۰ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

ناچیز کو صدارت کرنی تھی، مولانا عبداللہ سلیم صاحب نے تعارف وتقدیم کا فرض انجام دیا، اور ڈاکٹر احمد عبدالحی صاحب نے جلسہ کو کنڈکٹ کیا، وہاں میں نے اپنا طویل اور مفصل مضمون جو اردو میں تھا پڑھا (اور سامعین بھی زیادہ تر ہندوستانی اور پاکستانی تھے) اور جس کا عنوان تھا "دیارِ مغرب میں مقیم مسلمان نوجوانوں کے نام ایک ضروری اور اہم پیغام" جس میں بتایا گیا تھا کہ وہ یورپ اور امریکہ کے قیام سے کیا فائدہ اٹھا سکتے اور پہونچا سکتے ہیں، اور کس طرح وہاں اسلام کی ترجمانی اور نمائندگی کر سکتے ہیں، اور وہاں کے رہنے والوں کو (اپنے قول وعمل اور طرز زندگی سے) ان نقائص، نسگافوں، ناہمواریوں اور خطرات کا احساس پیدا کر سکتے ہیں، جو مغربی تہذیب ومعاشرہ میں پائی جاتی ہے، اور جن کی باہر رہ کر نشان دہی مشکل ہے، جلسہ پر پورا سکون اور خاموشی طاری رہی، اور سب نے توجہ واحترام کے ساتھ یہ مقالہ سنا۔

۶ ستمبر کو صبح ساڑھے آٹھ بجے تبلیغی مرکز گئے، جہاں دارالحفظ بھی ہے، اور وہاں کے حسبِ حال اور حسبِ ضرورت تقریر کی۔

شکاگو کے اس قیام میں بعض متعدد قدیم احباب اور فضلاء سے ملاقات ہوئی، جو کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے، جن میں عزیزان گرامی ڈاکٹر سید سلمان ندوی (فرزند علامہ سید سلیمان ندویؒ) ڈاکٹر سید حبیب الحق ندوی[1]، ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی ندوی (جو امریکہ میں کیلی فورنیا میں دعوت وتدریس کے کام میں مشغول ہیں) اور پاکستان کے داعی اور ایک اسلامی تحریک کے نامور قائد ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے ملاقاتیں اور طویل یکجائی کا شرف حاصل ہوا، ان کے علاوہ ڈاکٹر اسماعیل ہرچیٹ تھا

---

[1] یہ دونوں عزیز فاضل ڈربن (DURBAN) یونیورسٹی جنوبی افریقہ میں پروفیسر ہیں۔

جو حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے مقربین اور معتمد اصحاب میں تھے، اور عرصہ تک مدینہ طیبہ میں مطب کرتے رہے اب لیفالو میں ایک دینی مدرسہ قائم کئے ہوئے ہیں، اور ناچیز سے قلبی اور شخصی رابطہ رکھتے ہیں، شکاگو آگئے تھے اور وہاں کے قیام کے پورے عرصہ میں قادری صاحب کے مکان پر ہی مقیم اور شریک محفل رہے۔

نیویارک میں

شکاگو سے پھر نیویارک جانا تھا، اور وہیں سے حجاز مقدس کے لئے جہاز پکڑنا تھا، یوں بھی نیویارک میں صرف ایک رات گذاری تھی، اس کی مرکزیت، متعدد احباب کی خواہش اور مطالبے اور رفیق عزیز و محترم محمد عثمان صاحب کی مخلصانہ و معاونانہ رفاقت و معیت کا تقاضا تھا کہ کچھ وقت ان کے مکان پر گذارا جائے، چنانچہ ۶ ستمبر کو عصر کے وقت نیویارک روانہ ہوئے، جہاں ۹-۱۰ بجے رات کو پہونچنا ہوا، رات کو ان کے مکان پر جو نیویارک کے مرکزی حصہ سے فاصلہ پر ہے اور لانگ آئی لینڈ میں واقع ہے، رات کا کھانا کھایا اور آرام کیا، ۷ ستمبر کی دوپہر کو اپنے مکرم و مشفق استاد ماسٹر محمد سمیع صدیقی صاحب مرحوم (سابق استاد انگریزی دارالعلوم ندوۃ العلماء) کے صاحبزادہ احمد مطیع کے یہاں دوپہر کا کھانا ان کے بھائیوں اور دوستوں کی ایک جماعت کے ساتھ کھایا اور قیلولہ کیا، ۷ کی شام کو بعد مغرب نیویارک کی ایک مسجد میں جو مکّی مسجد کے نام سے مشہور ہے، اور جس کا انتخاب اور جلسہ کا انتظام عزیزی مکرم سید ساجد حسین صاحب نے کیا تھا[1]،

---

[1] عزیزی موصوف محترمی سید ہدایت حسین صاحب کے صاحبزادہ ہیں، جو عرصہ تک ندوۃ العلماء کے معتمد مال کی حیثیت سے کام کرتے رہے، اور اب ضعف پیری اور بیماری کی وجہ سے خانہ نشین ہیں۔

بعد مغرب ہمارا خطاب ہوا جس میں ہم نے امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں کو پہلے اعتقاداً، عملاً، اور اخلاقاً اور تہذیب و معاشرت کے لحاظ سے بھی صاحبِ استقامت مسلمان رہنے کی تلقین کی، پھر ایسی امتیازی اسلامی زندگی گذارنے کا مشورہ دیا جو یہاں کے باشندوں کو اسلام کے مطالعہ اور اس کی قدردانی اور اس کے امتیازی صفات کا اعتراف کرنے پر آمادہ کرے، اور ان کی عفّتِ قلب اور عفّتِ نظر اور طہارتِ ظاہری و باطنی کا معترف بنائے، اور وہ یہاں اسلام کی اشاعت کا کسی درجہ میں محرّک و باعث بنے۔

تقریر کے بعد ساجد حسین صاحب ہی کے یہاں رات کا کھانا کھایا، یہاں اپنی کتابوں کا ایک مجموعہ بھی دیکھا جو ان کی اور اُن کے احباب کے زیرِ مطالعہ رہتی ہیں۔

۸ ستمبر کا دن بھی نیویارک میں گذار کر شام کو جدّہ روانگی ہوئی، معلوم ہوا کہ یہاں سے کوئی جہاز (غالباً ان اوقات اور دنوں میں جن میں ہمیں سفر کرنا تھا) براہِ راست جدّہ نہیں جاتا، جنیوا میں جہاز تبدیل کرنا پڑے گا، جہاں ۴ گھنٹے ایر پورٹ پر انتظار کرنا پڑے گا، عزیزی محمد رابع سلمہ کو یہ خیال خوب آیا کہ جنیوا میں ڈاکٹر سعید رمضان کا قیام ہے، جو ہمارے عزیز ترین عرب دوستوں، اور لائق ترین عرب داعیوں اور مقرروں میں شمار ہوتے تھے، وہ شیخ حسن البناء شہیدؒ بانی تحریک و دعوت الإخوان المسلمون مصر کے داماد ہیں، اور ان کے اور ان کی دعوت کے بڑے مؤثر اور مقبول داعی اور ترجمان رہ چکے ہیں، ان کے قائم کردہ اسلامک سنٹر واقع جنیوا کے (جو یورپ کے مقیم نوجوانوں کی توجیہ اور تربیت کے لئے قائم کیا گیا تھا، اور جس کے ارکان میں مولانا ظفر احمد صاحب انصاری مرحوم مقیم پاکستان اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب

سابق پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، اور متعدد گراں قدر تصنیفات کے مصنّف اور بعض دوسرے اسلامی الفکر داعی اور فاضل تھے، اور اس کی طرف سے ایک مؤقر رسالہ "المسلمون" نکلتا تھا، جس کے اہم مضمون نگاروں میں یہ عاجز بھی تھا، عرصہ سے ان سے ملنا نہیں ہو سکا، اس لئے ان کو اطلاع دینا مناسب ہوگا، وہ بھی خوش ہوں گے اور ہمیں بھی مسرّت ہوگی، چنانچہ ٹیلیفون پر ان سے رابطہ قائم کیا گیا، جنیوا کے ایرپورٹ پہونچنے پر اور وہ جہاز کے پہونچنے پر وہاں آگئے، وہ اپنے دو صاحبزادوں کو بھی لائے تھے، وہ بڑی گرم جوشی اور دوستانہ، داعیانہ جذبات کے ساتھ ملے، ان پر بڑھاپے اور تجربات و واقعات کی بنا پر حزن و ملال کا اثر تھا، جب تک بیٹھے رہے بڑی محبت اور تعلق کا اظہار کرتے رہے، افسوس ہے کہ ان کا مصر میں جانا بھی عرصہ سے قانوناً ممنوع ہے، اور سعودی عرب سے بھی اب تعلقات نہیں رہے ہیں، حالانکہ وہ رابطۂ عالمِ اسلامی کے قیام کے محرّکین اور اہم ارکان میں تھے، اس مختصر اور محزون صحبت میں ان کی سرگرمیوں اور مشاغل کی تفصیل نہیں معلوم ہو سکی، اور نہ المرکز الاسلامی کے بارہ میں کچھ گفتگو ہو سکی۔

حجازِ مقدّس میں

یورپ و امریکہ کے سفر میں وہاں کی سردی اور اپنی صحت کی کمزوری کی بنا پر یہ طے کیا گیا کہ یہاں سے احرام نہ باندھا جائے، پہلے مدینہ طیبہ حاضری ہو، اور وہاں سے احرام باندھا جائے اور عمرہ کی نیت کی جائے، جہاز دوپہر کو روانہ ہوا، اور شام کو بوقت مغرب جدّہ پہونچے، یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ پورا جہاز یورپین مسافروں،

حجاز میں کام کرنے والے غیر مسلم افراد، یا ان افراد سے بھرا ہوا تھا، جن کے متعلق اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ کس دین و مذہب کے ہیں، خواتین بھی بہت تھیں اور بے پردہ، شاید احرام میں اور عمرہ کے لئے سفر کرنے والے دو تین ۲۳ آدمی نظر آئے جو غالباً مصری تھے،

جدّہ کے ایرپورٹ پہونچے، تو پاسپورٹ ویزا کو دیکھنے اور ضابطہ کی کارروائی میں بڑی دیر لگی، لیکن بعض کام کرنے والوں نے بھائی عثمان صاحب کو پہچان لیا، اور ایک افسر متعلقہ سے شاید راقم کا بھی تعارف کرا دیا گیا، اور کسی قدر رعایت کے ساتھ ہم لوگوں کو باہر جانے کی اجازت ملی، باہر آئے تو ہمارے میزبان قدیم و مستقل الحاج محمد نور عبد الغنی نور ولی صاحب، ان کے بھائی محمد ولی عبد اللہ نور ولی، اور صاحبزادگان نے استقبال کیا، اور فوراً اپنی موٹر پر بٹھا کر اپنے دولت خانہ پر پہونچا دیا، جہاں ہم نے مغرب، عشاء کی نماز پڑھی، کھانا کھایا اور آرام کیا۔

الحاج محمد نور صاحب نے ہمارے پہونچنے سے پہلے ہمارے علم کے بغیر ہم تین ۳ آدمیوں (راقم، عزیزی محمد رابع اور محب عزیز سید حسن عسکری طارق) کے لئے صبح کی پرواز میں مدینہ طیبہ کے ٹکٹ لے رکھے تھے، اگلے دن جمعہ تھا، ہم لوگ صبح غسل کر کے صبح کے جہاز سے روانہ ہوئے، جو ۹ بجے کے قریب مدینہ طیبہ پہونچ گیا، اور ہم نے اطمینان سے مسجد شریف کے ایک توسیعی حصہ میں نماز جمعہ ادا کی، ہمارے قیام کا انتظام محمد نور صاحب نے اپنی ایک عمارت کی ایک منزل میں جو مسجد شریف سے قریبی فاصلہ پر بازار میں واقع ہے، اپنے صاحبزادہ عبد الحمید نور ولی کے ذریعہ کر دیا تھا، جس میں تین ۳ ایرکنڈیشنڈ کمرے اور دو ۲ باتھ روم تھے، عمارت میں لفٹ کا انتظام تھا، کھانے کا انتظام حسب معمول سید حسن عسکری طارق صاحب

کے یہاں تھا، جو مدینہ طیّبہ میں ٹیلیفون کے محکمہ میں ملازم ہیں، اور حضرت شیخ الحدیث کی وفات کے بعد مدینہ طیّبہ میں وہی ہمارے میزبان رہا کرتے ہیں۔

مدینہ طیّبہ کے قیام کا ایک بڑا مسئلہ راقم کے زیادہ پیدل چلنے سے معذوری اور نقرس کے مرض کی وجہ سے فاصلہ طے کرنے کا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا حل یہ نکالا کہ محب مخلص عبد الرشید صاحب حیدر آبادی نے جو مسجد کی توسیع و تعمیر کے کام میں ایک ذمّہ دارانہ عہدہ پر ہیں، گاڑی کے باب السلام کے دروازہ تک جانے کی اجازت حاصل کی، وہ یا کوئی دوسرا ڈرائیور گاڑی کو وہاں تک پہونچا دیتا جہاں جوتے اتارے جاتے ہیں۔

عام طور پر اپنی کمزوری و معذوری کی وجہ سے روزانہ مغرب و عشاء مسجد مبارک ہی میں پڑھتے اور صلاۃ و سلام پیش کرتے، کسی دن ظہر کو بھی جانا ہو جاتا۔

حاضری کے موقعہ پر کبھی زبانِ حال اقبالؔ کے یہ شعر پڑھتے ؎

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم — من و تو کشتۂ شانِ جمالیم
دو حرفے برمرادِ دل بگوییم — بپائے خواجہ چشماں را بمالیم[1]

مدینہ طیّبہ کی حاضری کے موقعہ پر یہ طے کر لیا گیا تھا کہ اپنی قیام گاہ سے نکل کر سوائے مسجد نبویؐ اور مواجہ شریف کے کہیں اور نہیں جائیں گے، غیرت مقام مدینہ کے علاوہ اس میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ جامعہ اسلامیہ کی المجلس الاعلیٰ کے رکنِ شوریٰ ہونے، اور وہاں محاضرات کے سلسلہ اور متعدد بار طویل قیام کی وجہ سے وہاں کے متعدد مؤقر علماء، اساتذہ، ادباء اور خواص سے تعارف و تعلقات

---

[1] مدینہ طیّبہ کی حاضری اور اس کے تأثرات و برکات کے لئے ملاحظہ ہو مصنّف کی کتاب "کاروانِ مدینہ"

پیدا ہو گئے تھے، اس لئے اگر کسی ایک دوست یا صاحبِ فضل کے یہاں گئے، اور دوسرے کے یہاں نہیں گئے تو شکایت پیدا ہو گی اس لئے کہیں جانے کا قصد نہیں کیا، اخبارات میں خبر نہ آنے اور کسی ایسے جلسے کے نہ ہونے کی وجہ سے جس کے ہم رکن ہوں، لوگوں کو ہماری حاضری کی اطلاع بھی نہیں ہوئی، اس لئے بعض ایسے احباب بھی نہیں آسکے، جن سے قدیم تعلق و اخلاص تھا، ان میں کچھ استثناءات بھی ہیں، ایک مدینہ طیبّہ کے با وجاہت اور وضعدار مقیم شیخ صالح الحُصیّن جو رابطہ کے ممبر بھی ہیں، اور مملکت کے ایک معزّز اور ذی علم فرد اور ہم سے اُن کا پرانا ربط ہے، اور وہ ہماری کتابوں کے خاص قدرداں اور اشاعت کرنے والے ہیں، ان کو عزیزی مولوی علی احمد ندوی سے جو ایک ہی جہاز سے ریاض سے مدینہ طیبّہ ملنے کے لئے آرہے تھے، ہماری آمد کا علم ہو گیا، اور وہ آخری دن چلنے کے قریب قیام گاہ پر ملنے کے لئے آگئے، اور بڑی محبت اور خلوص سے ملے، دوسرے ڈاکٹر عبداللہ زائد جو جامعہ اسلامیہ مدینہ طیبہ کے سب سے بیدار مغز وسیع النظر شیخ و مدیر (وائس چانسلر) رہ چکے ہیں، اور ہم سے ان کا بڑا ربط رہا ہے، انھوں نے کئی بار ہمارے محاضرات کا انتظام کیا، انھوں نے ہم کو مسجد شریف میں دیکھ لیا، ملنے آئے اور دیر تک بیٹھے، تیسرے ایک فاضل اور حدیث کے صاحبِ اختصاص .... جو ملنے آئے اور انھوں نے حدیث کی سند لی، ان کے علاوہ ف عبدالرحیم صاحب مدراسی استاد جامعہ اسلامیہ اور عزیز فاضل مولوی اجمل اصلاحی ندوی جو روزانہ بعد عصر آتے اور دیر تک بیٹھتے، اور لطفِ مجلس رہتا۔

۱۳ ستمبر دوشنبہ کو وداعی سلام عرض کرتے ہوئے احرام باندھ کر مکّہ معظّمہ کا رُخ کیا، رفیق عزیز محمد عثمان صاحب نے بڑی اچھی گاڑی کا انتظام کر دیا تھا، محب عزیز حسن عسکری طارق صاحب جو عام طور پر ہمارے مُطوّف و معلّم ہوتے ہیں، ساتھ تھے، سالہا سال سے مکّہ مکرّمہ میں قیام محب مخلص و عزیز ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب ندوی کے مکان واقع شارع منصور میں ہوا کرتا ہے، وہیں جا کر اُترے۔

اسی دن ظہر سے پہلے ۱۴ ستمبر سہ شنبہ کی صبح کو عمرہ کیا، ضعف اور کسی قدر معذوری کے باوجود طواف پیادہ پا کرنے کی ہمت کی لیکن (WHEEL CHAIR) گاڑی پر سعی کی، جس کا کئی سال سے معمول ہے، عمرہ سے فارغ ہو کر سب سے پہلے مدرسہ صولتیہ حاضر ہوئے، جہاں محب مرحوم و مغفور مولانا شمیم رحمۃ اللہ صاحب کی ان کے فرزندوں سے تعزیت کا فرض انجام دیا، اور تھوڑی دیر بیٹھ کر قیام گاہ پر آگئے۔

تعزیت کا ایک فرض اپنے محب قدیم اور افغانستان، ایران و شام وغیرہ کے سفر (۱۹۷۳ء)[لہ] کے رفیق و معاون شیخ احمد محمد جمال کے سلسلہ میں بھی انجام دینا تھا، جو سعودی عرب کی مجلس شوریٰ کے ایک رکن اور جامعۃ الملک عبدالعزیز جدہ میں اسلامی ثقافت کے ایک استاد تھے، اور مملکت سعودیہ کے اسلامیات پر نامور لکھنے والوں اور بیرونی ممالک کے علمی سیمناروں میں شرکت اور مملکت کی نمائندگی کرنے والے ممتاز افراد میں تھے، لیکن مصروفیت اور ضعف و مرض کی وجہ سے

لہ یہ سفر رابطۂ عالم اسلامی کے نمائندہ وفد کے ارکان کی حیثیت سے کیا گیا تھا، اس کا سفرنامہ عربی میں "من نهر كابل الى نهر اليرموك" اور اردو میں "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اور حال میں اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔

یہ کام رہ گیا، جس کا افسوس ہے۔

مکّہ معظّمہ کے قیام میں دُو جگہ اور جانا ہوا، ایک ادیبِ عصر و کاتب کبیر شیخ علی طنطاوی کی ملاقات جو شہر کے ایک دور افتادہ محلہ العزیزیہ میں مقیم ہیں، اور اب بالکل خانہ نشین اور نقل و حرکت سے معذور ہو گئے ہیں ______ جن کو ہم عہدِ حاضر کا ممتاز ترین ادیب اور صاحبِ قلم سمجھتے ہیں' اور جنھوں نے ہماری کئی کتابوں پر مقدمہ لکھا ہے[1]، ان کو ہماری آمد کی اطلاع مل گئی تھی، اور وہ مشتاق اور چشم براہ تھے، ان سے مل کر یہ شعر حسب حال معلوم ہوا ؎

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
برگ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

دونوں بڑی محبت اور گرم جوشی سے ملے، اور دیر تک مجلس رہی۔

دوسرا اہم کا پروگرام محب عزیز و مخلص ڈاکٹر عیاد الرحمٰن نشاط صاحب[2] کے یہاں رات کے کھانے کا تھا، جہاں رات کو آرام کرنا بھی' پروگرام میں شامل تھا، لیکن بعض سہولتوں اور ضرورتوں کی بناء پر اپنے قیام گاہ ہی پر رات گذارنا طے کیا گیا'

---

[1] مثلاً "المسلمون فی الهند" "فی مسيرة الحياة" (ترجمہ کاروانِ زندگی)، "الطريق الی المدينة" اور "مختارات من ادب العرب"۔

[2] نشاط صاحب جامعۃ ام القریٰ میں انگریزی کے پروفیسر ہیں، ان کا تعلق لکھنیاں بہار کے اس خاندان سے ہے جس کے مورث اعلیٰ شیخ سلطان بلیاوی ہیں جو وہیں مدفون ہیں، ہمارے جدامجد مورث اعلیٰ حضرت شاہ علم اللہ نقشبندی مجددیؒ کے پیر بھائی، اور حضرت سید آدم بنوریؒ کے جلیل القدر خلیفہ تھے، اور اسی رشتہ سے اس خاندان سے ایک روحانی تعلق ہے۔

انھوں نے بڑے اہتمام سے اور بڑی خلوص ومحبت کے ساتھ دعوت کی، اور یوں بھی وہ برابر آتے جاتے رہے، ان کے دینی فکر اور دعوتی جذبہ سے یونیورسٹی کے حلقہ میں فائدہ پہونچ رہا ہے، اور صحیح رہنمائی ہوتی ہے۔

مکّہ معظمہ میں بھی ہمارے حاضر ہونے کی اطلاع عام طور پر نہیں تھی، اس لئے جن حضرات سے قدیمی روابط تھے، اور وہ خود ملاقات کے لئے سبقت فرماتے اور اس کا شرف بخشتے تھے، ان کو خبر بھی نہیں ہوئی، ان میں سے صرف دو شخصیتوں کا استثناء ہے، جن کو کسی ذریعہ سے علم ہوگیا، ایک رابطۂ عالم اسلامی کے موجودہ قائم مقام امین عام شیخ محمد ناصر العبودی دوسرے عزیز گرامی شیخ محمد الحافظ ندوی (انچارج شعبۂ صحافت رابطۂ عالم اسلامی) یہ دونوں ہماری قیام گاہ مولوی عبداللہ عباس ندوی صاحب کے مکان پر آکر ملے، اور تھوڑی دیر اچھی مجلس رہی، مولوی عبداللہ عباس صاحب ندوی کا معمول تھا کہ وہ ہمارے قیام مکّہ مکرّمہ کے زمانہ میں ہمارے قدیم احباب اور کرم فرماؤں اور ادباء اور اہلِ علم کی ایک جماعت کو مدعو کرتے جن سے تھوڑی دیر اچھی صحبت رہتی اور رات کا کھانا ساتھ کھایا جاتا، اس مرتبہ ان کے ہندوستان میں ہونے کی وجہ سے یہ تقریب نہ ہوسکی اور بہت سے احباب سے ملنا رہ گیا۔

مکّہ معظمہ کے قیام میں عزیزی عبداللطیف جونپوری کی محنت وخدمت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا جو حرم شریف لاتے لے جانے اور مکّہ معظمہ میں نقل وحرکت کے لئے اپنی گاڑی اور وقت کو وقف کردینے کی شکل میں ہر مرتبہ دیکھنے میں آتی ہے۔

باقی مولوی عبداللہ صاحب کے فرزندوں اور افراد خاندان نے جو مکّہ معظمہ، جدّہ، اور طائف میں مقیم ہیں، جس راحت رسانی، سعادت مندی اور محبت وتعلق کا

ثبوت دیا، (جن میں عزیزی طٰہٰ عبداللہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں) تشکر بہ سے بالاتر ہیں کہ "الشئ من معدنہ لا تستغرب" ، جزاھم اللہ تعالیٰ وبارک فیھم۔

۱۷ ارستمبر کو طوافِ وداع کیا گیا جو مجبوری کی بنا پر وھیل چیر پر تھا، جدّہ عزیزی ضیاء عبداللہ کی معیت میں جو جدّہ سے گاڑی لے کر آئے تھے واپسی ہوئی، جہاں ایک شب قیام رہا، جس میں اپنے عزیز (برادر وخواہر زادہ) سید مصباح النبی حسنی سلمہٗ کے گھر جا کر ملاقات کی، اور ان کے بچوں کو دیکھا، واپسی پر محب محترم الحاج محمد نور صاحب کے دولت خانہ پر ملنے والوں اور رخصت کرنے والوں کا بڑا مجمع ہو گیا، محترمی محمد نور صاحب کی فرمائش پر کچھ خطاب کیا گیا، جس میں حجاز مقدّس کے قیام کی ذمّہ داریوں کی طرف متوجہ کیا گیا، اور اس کے آداب، نقاضوں اور اصل فوائد کی طرف توجہ دلائی گئی۔

صبح ۱۸ ارستمبر کو دہلی کے لئے روانگی ہو گئی، جہاں مغرب کے وقت پہونچنا ہوا، عزیزی ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس ندوی، نیاز احمد اور دوسرے محبین، مخلصین موجود تھے، ان کی معیت میں مولوی عبداللہ صاحب کے مکان واقع او کھلے میں پہونچنا ہوا، اور اگلے دن ۱۹ ارستمبر دہلی میں گذار کر اور وہاں عزیزوں سے ملاقات کر کے اسی دن رات کی گاڑی لکھنؤ میل سے لکھنؤ واپسی ہو گی۔

وللہِ الأمر من قبل ومن بعد۔

مصنّف کے فکر وتجربہ کی ایک صحیح ترجمانی

اب جبکہ زندگی کے طویل ترین سفر کی (جو تین بر اعظموں پر مشتمل تھا) مختصر روئیداد

مکمل ہو چکی ہے، اور اس کی عاقبت بالخیر (زیارت حرمین شریفین) کا ذکر بھی آچکا ہے، ایک دوست کے خط کا مضمون شائع کیا جا رہا ہے، جس میں مصنفِ کتاب کے فکر و مطالعہ اور تجربہ کی صحیح ترجمانی اور اچھا خلاصہ آگیا ہے، یہ محبّی سہیل احمد صاحب مقیم حال امریکہ کا ایک مکتوب ہے جس میں انھوں نے شکاگو کی ایک مجلسِ احباب میں راقم کی ایک گفتگو اور اظہارِ خیال نقل کیا ہے، اور وہ اس قابل ہے کہ قارئین کے سامنے آئے کہ اس میں اس کے فکر و مطالعہ کا بڑا اچھا خلاصہ اور ترجمانی آگئی ہے، وہ لکھتے ہیں :-

"۲۵ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ کو شام کی چائے کے بعد مولانا علی میاں کی محفل میں حاضری رہی، دیگر حاضرین مجلس میں ڈاکٹر محمد اسمٰعیل میمن خلیفۂ مجاز شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ، ڈاکٹر سلمان ندوی بن مولانا سید سلیمان ندویؒ ساؤتھ افریقہ سے، اور ڈاکٹر مزمّل صدیقی کیلیفورنیا سے، موجود تھے، مسلمانوں کی اجتماعی صورتِ حال پر روشنی ڈالتے ہوئے، مولانا نے فرمایا کہ آج یہود و نصاریٰ اپنی تمام تر مذہبی دوری و اختلافات کے باوجود مسلمانوں کے خلاف ایک جگہ جمع ہیں، اور عیسائیوں کے وسائل اور یہود کا دماغ اسی کام پر مامور ہے کہ کس طرح مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی سے اسلامی اقدار کو نکالا جائے، چنانچہ ہر مسلمان کو اس خطرے سے آگاہ رہتے ہوئے اپنے احتساب کی ضرورت ہے کہ کہیں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی یہود و نصاریٰ کی اس سازش کا شکار تو نہیں ہو رہا ہے۔

اس سوال کے جواب میں کہ دنیائے اسلام میں اسلامی نظام کیسے قائم و نافذ ہو سکتا ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ دو۲ طریقے ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ دین و ایمان والوں کو کرسی تک پہنچا یا جائے یا پھر دین و ایمان کو کرسی والوں تک پہنچا یا جائے، پہلے طریقۂ کار میں خدشہ اس بات کا ہے کہ کرسی والے کرسی چھوڑنے پر کرسی توڑنے کو ترجیح دیں، اور معاملات

احسن کے بجائے اور ابتر ہو جائیں، دوسرا طریقہ مدّت طلب ضرور ہے لیکن پائیدار ہے اور شاید اس کے بغیر چارۂ کار بھی نہ ہو حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ کی تحریک تجدید سے بھی اسی طریقۂ کار کا عندیہ ملتا ہے کہ کرسی، کرسی والوں کو ہی مبارک ہو، دین دار تو اس کی اصلاح چاہتے ہیں نہ کہ کرسی۔

مولانا نے فرمایا کہ ہر دور کا ایک بڑا چیلنج رہا ہے اور بزرگانِ دین نے ایسے چیلنجوں کا مقابلہ ہمّت و حکمت سے کیا ہے' آج کے دور کے دنیائے اسلام میں سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ اُمّتِ مسلمہ کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقے و نسل کا دین اسلام پر بحیثیت ایک زندہ و کامل دین کے اعتماد بحال کیا جائے' یہ اسی اعتماد کا متزلزل ہونا ہی ہے کہ آج دنیائے اسلام میں ہی اسلام کی عملی حیثیت سے متعلق نظریاتی تصادم موجود ہے' یہ اسی اعتماد کے متزلزل ہونے کا نتیجہ ہی ہے کہ جدید تعلیمی نظام سے فارغ شدہ طبقہ دینِ اسلام کو چودہ سو سال (۱۴۰۰ سنہ) پُرانا ایک مذہب تصور کرتے ہوئے اسے انفرادی یا اجتماعی زندگی میں کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں اور کہیں تو یہ طبقہ زندگی کے نظام کو چلانے والے کی حیثیت سے بہ نفسِ نفیس اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کام میں مصروف ہے' چنانچہ کرنے کا بہت اہم کام یہ ہے کہ اس طبقہ تک رسائی حاصل کی جائے' اور اس کے علمی معیار کے مطابق اس کا اعتماد اسلام پر بحیثیت ایک زندہ و مکمّل ضابطۂ حیات کے بحال کیا جائے، مولانا نے فرمایا کہ اس مقصد کے حصول کے لئے مسلمان بچوں کے تعلیمی نصاب و نظام کی تطہیر کی جائے' اور اس میں اسلامی تعلیمات و اقدار و دینی تربیت اس طرح شامل کی جائے کہ آج کا مسلمان نوجوان علومِ جدیدہ کے حصول کے ساتھ ساتھ اسلام کا ایک مخلص و دیانتدار سفیر و سپاہی بھی بن جائے، اس اہم کام کی طرف سے اسلامی تحریکوں

اور مخلص کارکنوں نے اب تک صرفِ نظر کیا ہے، اس کام کے نتیجے میں ایسی تعلیم یافتہ مسلمان نسل وجود میں آئے گی جو دینی تعلیم و تربیت و حمیّت سے آراستہ ہو اور پھر یہ نسل اسلام کو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگیوں میں مکمل طور پر نافذ کرنے کی کوشاں ہو۔

اسی شام کو بعد نمازِ مغرب ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نے یورپ و امریکہ میں مقیم مسلمان نوجوانوں کے لئے بالخصوص اپنے پیغام میں فرمایا کہ "آج مغرب اپنی بے پناہ مادّی ترقی لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے لیکن اس مغربی تہذیب نے انسانیت کی جو اخلاقی و روحانی و معاشرتی پامالیٔ اقدار کی ہے وہ اس کی مکمّل ناکامی کا ثبوت ہے، آج کے مسلمان نوجوانوں کی بالخصوص یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی مکمّل زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالیں، اپنی روحانی و اخلاقی تربیت اس نہج پر کریں کہ ان سے ملنے والے اُن کی طرزِ زندگی و اعمال و اخلاق سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں، یہ فقط اُن کے لئے اسلام کی ایک پُرزور دعوت ہوگا، مولانا نے فرمایا کہ مسلمان نہ صرف اپنی زندگی کو اللہ والی زندگی بنانے کے مکلّف ہیں بلکہ اسی زندگی سے وہ دوسروں تک دین پہنچانے کا فریضہ بھی ادا کر سکتے ہیں، بزرگانِ دینِ اسلام کی زندگیاں و دعوتِ دین اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔

اللہ پاک ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔"

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا سالانہ اجلاس منعقدہ جے پور (راجستھان)

جیسا کہ قارئین کی نظر سے گزرا۔ ۲۰ر ستمبر ۱۹۹۳ء کو حجازِ مقدّس سے اپنے مستقر لکھنؤ واپسی ہوئی، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ (جس کی صدارت کی ذمّہ داری اس راقم ضعیف کے

احسن کے بجائے اور ابتر ہو جائیں، دوسرا طریقہ تدرت طلب ضرور ہے لیکن پائیدار ہے اور شاید اس کے بغیر چارۂ کار بھی نہ ہو حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کی تحریکِ تجدید سے بھی اسی طریقۂ کار کا عندیہ ملتا ہے کہ کرسی، کرسی والوں کو ہی مبارک ہو، دین دار تو اس کی اصلاح چاہتے ہیں نہ کہ کرسی۔

مولانا نے فرمایا کہ ہر دور کا ایک بڑا چیلنج رہا ہے، اور بزرگانِ دین نے ایسے چیلنجوں کا مقابلہ ہمت و حکمت سے کیا ہے، آج کے دور کے دنیائے اسلام میں سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقے و نسل کا دین اسلام پر بحیثیت ایک زندہ و کامل دین کے اعتماد بحال کیا جائے، یہ اسی اعتماد کا متزلزل ہونا ہی ہے کہ آج دنیائے اسلام میں ہی اسلام کی عملی حیثیت سے متعلق نظریاتی تصادم موجود ہے، یہ اسی اعتماد کے متزلزل ہونے کا نتیجہ ہی ہے کہ جدید تعلیمی نظام سے فارغ شدہ طبقہ دینِ اسلام کو چودہ سو (۱۴۰۰) سال پرانا ایک مذہب تصور کرتے ہوئے اسے انفرادی یا اجتماعی زندگی میں کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں اور کہیں تو یہ طبقہ زندگی کے نظام کو چلانے والے کی حیثیت سے بنفسِ نفیس اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کام میں مصروف ہے، چنانچہ کرنے کا بہت اہم کام یہ ہے کہ اس طبقہ تک رسائی حاصل کی جائے، اور اس کے علمی معیار کے مطابق اس کا اعتماد اسلام پر بحیثیت ایک زندہ و مکمل ضابطۂ حیات کے بحال کیا جائے، مولانا نے فرمایا کہ اس مقصد کے حصول کے لئے مسلمان بچوں کے تعلیمی نصاب و نظام کی تطہیر کی جائے، اور اس میں اسلامی تعلیمات و اقدار و دینی تربیت اس طرح شامل کی جائے کہ آج کا مسلمان نوجوان علومِ جدیدہ کے حصول کے ساتھ ساتھ اسلام کا ایک مخلص و دیانت دار سفیر و سپاہی بھی بن جائے، اس اہم کام کی طرف سے اسلامی تحریکوں

کاندھوں پر ہے) کے سالانہ اجلاس کے جے پور میں منعقد کرنے کا فیصلہ بورڈ کی مجلس عاملہ نے اس طویل بیرونی سفر سے پہلے ہی کر لیا تھا اور اس کے لئے ۹ر۱۰ر اکتوبر ۱۹۹۳ء کی تاریخیں مقرر ہوئیں، یہ اجلاس جو پہلی بار راجستھان میں ہو رہا تھا، مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب کی سرپرستی میں ان کے مبارک ادارہ "جامعہ ہدایت" جے پور میں ہونا طے پایا اور اس میں شاہ صاحب کی محترم ذات، اُن کی عالی ہمتی اور بلند نظری، اور اُن کے صاحبزادگان (مولوی فضل الرحیم ندوی اور مولوی ضیاء الرحیم ندوی ازہری) کی ہمّت اور محنت کا بڑا دخل تھا، جے پور کا انتخاب اس کے جائے وقوع کی اہمیت ایک قدیم مسلم ریاست (ٹونک) کے قُرب وجوار کی وجہ سے بھی تھا، جہاں ریاست کے پورے عہد اور تاریخ میں عظیم اور واضح پیمانہ پر دینی و شرعی زندگی کا نمونہ غالب رہا اور عدالتیں شریعتِ اسلامی کے مطابق فیصلہ کرتی رہیں، اور وہ اس کے ساتھ عظیم المرتبت علماء، فقہاء و محدّثین اور کبار اساتذہ و مدرّسین کا مرکز رہا، خود جے پور بھی اہلِ علم و اہلِ فضل و کمال سے خالی نہیں رہا۔

راقم کی واپسی اور اس اجلاس کے درمیان کوئی طویل فاصلہ نہ تھا، طویل بیرونی سفر کے بعد مصروفیتوں اور ذمّہ داریوں اور ڈاک کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے، خطبۂ صدارت کا جلد قلم بند ہو جانا اور چھپ جانا ضروری تھا، اللہ تعالیٰ کی مدد ہی تھی کہ جسمانی تکان اور کاموں کے انبار کے ساتھ وہ لکھ لیا گیا اور چھپنے کے لئے دے دیا گیا، اس وقت تک "کاروانِ زندگی" کی کسی جلد میں ہندوستان کی اہم ترین دینی تحریک، تحفّظِ قانونِ عائلی شرعی (مسلم پرسنل لا) کے کسی اجلاس کا خطبۂ صدارت پیش نہیں کیا گیا، حالانکہ وہ تاریخ کی ایک امانت، ایک بڑے خطرہ اور چیلنج کی تصویر کشی اور

اس کا مقابلہ کرتے اور شریعتِ اسلامی کی حفاظت کی سعی و جدّ و جہد کی قابلِ حفاظت تاریخ ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس اجلاس کا خطبۂ صدارت مِن وعَن پیش کر دیا جائے، پھر اس اجلاس کی مختصر روئیداد اور اس کی کامیابی کے بارہ میں لکھا جائے۔

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

الحمد للہ رب العالمین والصّلاۃ والسلام علی سیّد المرسلین وخاتم النّبیّین محمد وّآلہٖ وصحبہٖ أجمعین ومن تبعھم باحسان ودعا بدعوتھم إلی یوم الدین۔

حضرات!

میں آپ سب حضرات کا خیر مقدم کرتے ہوئے جو ہندوستان میں اُمّتِ مسلمہ اور شریعتِ اسلامی کے مختلف میدانوں میں اور مختلف سطح اور متفاوت درجات کے ساتھ نمائندگی کرتے ہیں، اور توفیقِ الٰہی کے مطابق دین اور علم کی اشاعت اور شریعت کی حمایت اور دفاع میں مشغول ہیں، اپنے اس احساس واعتراف اور تأثّر کو چھپا نہیں سکتا کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا یہ اجلاسِ عام صحیح وقت کے ساتھ ایک مناسب موزوں اور تاریخی و دینی اور شرعی اہمیت کے حامل مقام (جے پور) میں ہو رہا ہے، اس لئے کہ اس تاریخی شہر سے کچھ فاصلہ پر وہ شہر (ٹونک) واقع ہے جس کو یہ شرف حاصل ہے کہ تیرہویں صدی ہجری کے وسط میں وہاں شہادت گاہِ بالاکوٹ سے حامیانِ شریعت اور فدایانِ ملّت کا وہ قافلہ منتقل ہوا، جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے شہادت فی سبیل اللہ کے بجائے شہادت بالحق اور حمایت واشاعتِ شریعت کی

سعادت مقدّر فرمائی تھی۔

میری مراد تیرھویں صدی ہجری کے مجدّد اور مجاہد اعظم حضرت سید احمد شہیدؒ رائے بریلوی کے متعلقین اور افراد خاندان کا وہ مجموعہ ہے جو اُن کے ہم رکاب اور ان کا ہم سفر تھا، نیز رفقائے سفر ہجرت وجہاد کے وہ عالی حوصلہ، قوّی الایمان اور باحمیّت افراد جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے شہادتِ جسمانی کے بجائے شہادت ایمانی ولسانی اور شرعی ودینی زندگی کا عملی نمونہ دکھانے اور اس کو برت کر بتانے کی سعادت اور امکان کو ترجیح دی تھی، اور جو اس آیت کی تفسیر ہے:۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا	مومنوں میں کتنے ہی ایسے شخص ہیں کہ
مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ج	جو اقرار انھوں نے خدا سے کیا تھا
فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ	اس کو سچ کر دکھایا، تو ان میں سے
وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ز صلے	بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے
وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝	فارغ ہو گئے اور بعض ایسے ہیں جو
(سورۃ الاحزاب۔۲۳)	انتظار کر رہے ہیں اور انھوں نے
	(اپنے قول) کو ذرا بھی نہیں بدلا۔

یہ قافلہ ٹونک کے قوّی الایمان، صاحبِ حمیّت وحمایتِ اسلامی، متشرّع والیِ ریاست نواب وزیر الدولہ مرحوم (متوفی ۱۲۸۱ھ ۔ ۱۸۶۴ء) جو سیّد صاحب کے مرید با اخلاص اور مُحِبّ با اختصاص تھے، کی دعوت ہی نہیں بلکہ اصرار اور خوشامد پر ٹونک منتقل ہوا، جس کا بحیثیت ریاست کے کچھ ہی عرصہ پہلے قیام ہوا تھا، اور انھوں نے شہر کے جس حصّہ میں قیام اختیار کیا اس کا نام ہی اُن کی رعایت سے "قافلہ" پڑ گیا،

اور آج بھی وہ اسی نام سے مشہور ہے۔

ان بقیۃ السّیف اور بقیّۃ السلف مہاجرین و مجاہدین کی جنھوں نے ٹونک میں قیام اختیار کیا یہ خصوصیت تھی کہ وہ عقائد و فرائض و عبادات ہی نہیں، عادات و اخلاق و معاملات، شادی و غمی کی تقریبات اور روزمرّہ کی زندگی میں بھی متبّعِ شریعت اور عامل بالسُنّت تھے، اور ان رسوم و عادات سے جو غیر مسلموں کے اختلاط اور دین و شریعت سے ناواقفیت یا قدیم رسوم کی پابندی کی وجہ سے ہندوستان کے عام مسلمانوں میں رواج پکڑ چکی تھیں، اور انھوں کے اکثر مقامات پر شریعت کی جگہ لے لی تھی، نہ صرف محفوظ بلکہ بیزار و باغی تھے، اور ان کی زندگی اپنے پورے لوازم و تنوّعات کے ساتھ عہدِ سلف کی یاد تازہ کرتی تھی، اور یہ نتیجہ تھا حضرات شہیدین (حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ) کی صحبت و تربیت کا۔

پھر اس ریاست کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ وہاں روزِ اوّل سے ریاستوں کے اِلغا و منسوخی کے آخری دن تک عدالتیں شریعت کے مطابق فیصلہ کرتی تھیں، اور وہاں شرعی قانون ہی نافذ تھا، جس کے ترجمان و شارح اور اس کی تنفیذ و اجراء کا کام کرنے والے جیّد علماء، فقہاء و محدّثین تھے۔

اس قُرب مکانی اور قابلِ فخر جوار کا لحاظ کرتے اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علّامہ اقبالؔ کا یہ شعر پڑھنا ہر طرح موزوں اور برمحل معلوم ہوتا ہے ؎

آگ بُجھی ہوئی اِدھر ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

اس قُرب مکانی اور اس پس منظر کے علاوہ یہ بھی اس اجلاس کے برمحل اور برموقع ہونے کی

ایک دلیل اور فالِ نیک ہے کہ یہ اجلاس پہلی مرتبہ اس سرزمین پر ہو رہا ہے، جس کو اسلام کے اس مقبول، مؤثّر اور عہد آفریں و تاریخ ساز داعی اور مُربّی روحانی کے مرقد بننے کا شرف حاصل ہے جس کو ہندوستان کے ایمانی و روحانی فاتح کا لقب دیا جا سکتا ہے، اور جس نے ہندوستان کی زمین، علاقے اور ملک کو اسلام کی تحویل میں لینے کے بجائے اس کا دل جیت لیا اور اس کے عقیدے، معاشرہ اور اخلاق پر سب سے زیادہ گہرا اثر ڈالا، اور اسلامی فتوحات کو حقیقی طور پر مؤثر، عمیق اور دائمی بنایا، میری مراد حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی ذات والا صفات سے ہے جن کا مرقد مبارک اس راجپوتانہ کی سرزمین کے ایک شہر اجمیر میں واقع ہے ؎

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

سامعین کرام و حاضرین ذوی الاحترام! اب میں اصل موضوع پر آتے ہوئے پہلے یہ عرض کروں گا کہ اسلام، اور دوسرے مذاہب، معاشروں اور نظامہائے زندگی کا ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام میں ازدواجی زندگی مرد و عورت کا تعلق اور عائلی (PERSONAL) رفاقت اور اس کی ذمّہ داریاں، ان کے باہمی حقوق و فرائض، مذہب آسمانی اور شریعتِ خداوندی کا ایک شعبہ اور دین کا ایک جزء ہے جس کے لئے آسمانی ہدایات، شرعی قوانین اور سنّتِ رسول ﷺ رہنما اور نمونہ ہے، جب کہ دوسرے مذاہب اور دنیا کے معاشروں اور تمدّنوں میں وہ زندگی کی ایک ضرورت، ایک انسانی، نسلی اور تمدّنی، کبھی اختیاری اور کبھی اضطراری اور کبھی (مجھے معاف کیا جائے) تفریحی و التذاذی ضرورت ہے، اس بارہ میں اسلام کے امتیاز کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کے صحیفۂ آسمانی میں

طبقۂ اناث اور صنفِ ازواج کو ایک احسان اور مردوں کے لئے ذریعۂ سکون اور مستحقِ مودّت و رحمت قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ	اور اس کے نشانات (اور تصرفات)
مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا	میں سے ہے اس نے تمہارے لئے
لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ	تمہارے ہی جنس کی عورتیں پیدا کیں
بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ	تاکہ ان کی طرف (مائل ہوکر) آرام
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ	حاصل کرو اور تم میں محبت و مہربانی
يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝	پیدا کر دی، جو لوگ غور کرتے ہیں،
(سورۃ الروم ـ ۲۱)	ان کے لئے ان باتوں میں (بہت سی)
	نشانیاں ہیں۔

پھر اس حقیقتِ خلقت اور مظہرِ رحمت کے آسمانی اعلان کے ساتھ جس کا تعلق طبقۂ اناث اور ازدواجی زندگی سے ہے، نسلِ انسانی کے رہبرِ اعظم اور اسوۂ اعلیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایات اور آپ کی سیرت و نمونہ ہے جس سے ازدواجی اور عائلی زندگی کے گزارنے کے لئے ہدایات ملتی ہیں، اور رفیقۂ حیات کا درجہ اور اس کا حق معلوم ہوتا ہے، اس سلسلہ میں چند احادیث پر اکتفا کی جاتی ہے :۔

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت : قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم : خیرکم خیرکم لأھلہ وأنا خیرکم لأھلی۔[1]

(حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] ابن ماجہ باب حسنِ معاشرۃ النساء۔

تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لئے تم میں سب سے بہتر ہوں)

سیرت اور اُسوۂ نبوی سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ "میں نے کسی کو اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر شفیق و رحیم نہیں دیکھا"[۱]

عمرو بن الاحوص جشمیؓ روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حجۃ الوداع کے موقع پر سنا کہ آپؐ نے خطبہ میں حمد و ثنا اور تذکیر و نصیحت کے بعد فرمایا کہ "عورتوں کے ساتھ اچھا معاملہ رکھو اس لئے کہ وہ تمھاری زندگی میں تمھاری معاون اور رفیقۂ حیات ہیں، ان کا حق ہے تم ان کو اچھا کھلاؤ اچھا پہناؤ"[۲]

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "اہلِ ایمان میں سب سے زیادہ کامل الایمان وہ ہے جو سب سے زیادہ خوش خُلق ہو اور تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں، جو اپنی بیویوں کے لئے سب سے بہتر ہوں"

ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "دنیا ایک گزارہ کی چیز ہے اور اس کی سب سے بڑی دولت نیک بی بی ہے"[۳]

اس ازدواجی تعلق کی اہمیّت کا اندازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس خطبۂ نکاح سے ہوتا ہے جس میں سورۂ نساء کی پہلی آیت پڑھی گئی، اس میں نسلِ انسانی کے

---

[۱] مسند امام احمد و صحیح مسلم۔ [۲] ترمذی شریف (حدیث حسن صحیح)

[۳] صحیح مسلم، حقوق زوجین کے بارہ میں مذاہب اور اخلاقیات کے تقابلی مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو، سیرۃ النبیؐ جلد ششم تالیف علامہ سید سلیمان ندوی کا عنوان "حقوق زوجین" ص ۲۴۸ تا ۲۶۴

آغاز کا تذکرہ ہے، جو اس مبارک موقع پر نہایت مناسب اور فالِ نیک ہے کہ حضرت آدمؑ کی ایک اکیلی ہستی تھی، اور ایک رفیقۂ حیات جن سے اللہ تعالیٰ نے نسلِ انسانی کی تخلیق کی اور اس نے روئے زمین کو بھر دیا، اللہ تعالیٰ نے ان دو ہستیوں میں ایسی محبّت والفت اور ان کی رفاقت میں ایسی برکت عطا فرمائی کہ آج دنیا اس کی گواہی دے رہی ہے، تو خدا کے لئے کیا مشکل ہے کہ ان دو ہستیوں سے جو آج مل رہی ہیں، ایک کنبہ کو آباد اور ایک خاندان کو شاد و بامراد کر دے؟ پھر فرماتا ہے کہ اپنے اس پروردگار سے شرم کرو جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ساری زندگی سوالات کا مظہر اور نمونہ ہے، یہی متمدن زندگی کا خاصّہ ہے، یہ عقد اور نکاح کیا ہے؟ یہ بھی ایک مہذّب اور مبارک سوال ہے، ایک شریف خاندان نے ایک دوسرے شریف خاندان سے سوال کیا کہ ہمارے نورِ عین اور لختِ جگر کو رفیقۂ حیات کی ضرورت ہے، اس کی زندگی نامکمّل ہے، اس کی تکمیل کیجئے، دوسرے شریف خاندان نے اس سوال کو خوشی سے قبول کیا، پھر وہ دونوں اللہ کا نام بیچ میں لاکر ایک دوسرے سے مل گئے اور دو ہستیاں جو کل تک ایک دوسرے سے سب سے زیادہ بیگانہ، سب سے زیادہ اجنبی اور سب سے زیادہ دور تھیں، وہ ایسی قریب اور یگانہ بن گئیں کہ ان سے بڑھ کر یگانگت اور قرب کا تصوّر بھی نہیں ہو سکتا، ایک کی قسمت دوسرے سے وابستہ اور ایک کا لطف وانبساط دوسرے پر منحصر ہو گیا، یہ سب اللہ کے نام کا کرشمہ ہے، جس نے حرام کو حلال، ناجائز کو جائز، غفلت ومعصیت کو طاعت وعبادت بنا دیا اور زندگیوں میں انقلابِ عظیم برپا کر دیا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب اس نام کی لاج رکھنا، بڑی خود غرضی کی بات ہوگی کہ تم یہ نام درمیان میں لاکر اپنی غرض پوری کر لو اور کام نکال لو، پھر اس پُر عظمت نام کو صاف بھول جاؤ،

اور زندگی میں اس کے مطالبات پورے نہ کرو، پھر فرمایا کہ ہاں رشتوں کا بھی خیال رکھنا، اس رشتہ سے قدیم رشتوں کا دور اور ان کے حقوق ختم نہیں ہو جاتے اور اگر کسی کے دل میں یہ خیال آئے کہ ایسی باتوں کی کون نگرانی کرے گا، اور کون ہمیشہ ساتھ رہے گا، تو فرمایا:ـ

اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا[1] اللہ تعالیٰ دائمی نگراں اور محاسب ہے۔

اس کے برخلاف مختلف قدیم مذاہب اور قدیم و جدید تہذیبوں میں عورت کو کیا درجہ اور کیا حقوق دیے گئے ہیں، اس سے واقفیت کے لئے وسیع النظری اور ہمت و محنت کے ساتھ مذاہب اور تہذیبوں کے بارہ میں تقابلی مطالعہ کی ضرورت ہے۔[2]

اب یہاں پہنچ کر ہم اسلام کے عائلی قانون اور حقوق زوجین کے بارہ میں چند غیر مسلم فضلاء اور ماہرین قانون کے اعترافات اور تصریحات پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ بعض مسلم مکاتب خیال اور ناعاقبت اندیش مسلمان اہل قلم کی تحریروں اور اعلانات سے ہندی و انگریزی پریس میں اسلام کا عائلی قانون اور اس کا

---

[1] ملاحظہ ہو سورۂ نساء کی پہلی آیت، پورے خطبہ کی تشریح اور اس کے نکات و حقائق کے لئے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب "ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں" صفحہ ۴۲ تا ۴۴ شائع کردہ "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ۔"

[2] نمونہ کے طور پر ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی کی کتاب "المرأۃ بین الفقہ والقانون" طبع پنجم، المکتب الاسلامی بیروت و دمشق، ص ۱۳-۲۲ اور اس کا عنوان "المرأۃ فی الحضارۃ الغربیۃ" ص ۲۶۸-۲۷۸ ملاحظہ ہو۔

ازدواجی نظام، اور اسلام میں رفیقۂ حیات ہی نہیں عورت کا درجہ طنز واعتراض اور تحقیر و تضحیک کا موضوع بن گیا۔

ہم یہاں تین چار شہادتوں پر اکتفا کرتے ہیں، ان میں سے ایک شہادت ایک عزیز فاضلہ کی ہے، جو ہندوستان میں ایک تربیتی واصلاحی تحریک کی قائد رہی ہیں، اور انھوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا تھا، ہماری مراد مسز اینی بسنت (MRS. ANNIE BESANT) سے ہے۔ وہ کہتی ہیں:-

"ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ عورتوں کے متعلق اسلام کے قوانین ابھی حالیہ زمانہ تک انگلینڈ میں اپنائے جا رہے تھے، یہ سب سے منصفانہ قانون تھا، جو دنیا میں پایا جاتا تھا، جائداد، وراثت کے حقوق اور طلاق کے معاملات میں یہ مغرب سے کہیں آگے تھا، اور عورتوں کے حقوق کا محافظ تھا، یک زوجگی اور تعدد ازواج کے الفاظ نے لوگوں کو مسحور کر دیا ہے، اور وہ مغرب میں عورت کی اس ذلّت پر نظر نہیں ڈالنا چاہتے جسے اس کے اوّلین محافظ سڑکوں پر صرف اس لئے پھینک دیتے ہیں کہ ان سے ان کا دل بھر جاتا ہے، اور پھر ان کی کوئی مدد نہیں کرتا۔"[1]

مسٹر (N. J. COULSON) لکھتے ہیں:-

"بلاشبہ عورتوں کی حیثیت کے بارہ میں خاص طور پر شادی شدہ عورتوں کے معاملہ میں قرآنی قوانین افضلیت کا مقام رکھتے ہیں، نکاح اور طلاق کے قوانین کثیر تعداد میں ہیں جن کا عمومی مقصد عورتوں کی حیثیت میں

---

[1] (ANNIE BESANT, THE LIFE AND TEACHING OF MOHAMMAD, MADRAS, 1932. P. 3)

بہتری لاتا ہے، اور وہ عربوں کے قوانین میں انقلاب انگیز تبدیلی کے مظہر ہیں، اسے قانونی شخصیت عطا کی گئی جو اس سے پہلے حاصل نہیں تھی، طلاق کے قوانین میں قرآن نے سب سے بڑی تبدیلی جو کی ہے وہ عدّت کو اس میں شامل کرنا ہے۔[۱]

مذاہب و اخلاق کے انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار لکھتا ہے :۔

"پیغمبر اسلام نے یقیناً عورت کا درجہ اس سے زیادہ بلند کیا جو اسے قدیم عرب میں حاصل تھا، خصوصی طور پر عورت متوفی شوہر کے ترکہ کا جانور نہیں رہی بلکہ خود ترکہ پانے کی حقدار ہو گئی اور ایک آزاد فرد کی طرح اسے دوبارہ شادی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا، طلاق کی حالت میں شوہر پر یہ واجب ہو گیا کہ اسے وہ سب چیزیں دے دے جو اسے شادی کے وقت ملی تھیں۔

اس کے علاوہ اعلیٰ طبقہ کی خواتین علوم و شاعری سے دلچسپی لینے لگیں اور کچھ نے استاد کی حیثیت سے بھی کام کیا، طبقۂ عوام کی عورتیں اپنے گھر کی مالکہ کی حیثیت سے اپنے خاوندوں کی خوشی اور غم میں شریک ہونے لگیں، ماں کی عزّت کی جانے لگی۔"[۲]

تقابلی قوانین کی بین الاقوامی کانفرنس (INTERNATIONAL CONFERANCE ON COMPARATIVE LAW) منعقدہ پیرس کی ایشیائی قوانین کے مطالعہ کی شاخ

---

[۱] (N. J. COULSON ISLAMIC SURVEYS : A HISTORY OF ISLAMIC LAW) (EDINBURG 1971, P. 14)

[۲] (ENCYCLOPEDIA OF RELIGION AND ETHICS, NEW YORK, 1912, VOL. V, P. 271)

(BRANCH OF ORIENTAL STUDIES) نے جس میں مغرب و مشرق کے فضلاء قانون شریک تھے، رزولیوشن مورخہ ۷ رجولائی ۱۹۵۱ء میں کہا ہے: "اسلامی قوانین پر ہفتہ بھر چلنے والے مباحثوں سے مندوبین کے سامنے یہ بات ابھر کر آئی کہ اسلامی قوانین کے اصولوں کی افادیت میں کوئی شبہ نہیں ہے، قانون کی اس عظیم شاخ میں وہ تمام اصول وطریقۂ کار موجود ہیں، جو اسے جدید زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کا اہل بناتے ہیں"۔[ا]

حضرات!

یہ واقعہ ہے کہ ملک کے عام باشندوں اور خاص طور پر اخبار بینوں اور ملک میں پیش آنے والی تحریکوں اور سرگرمیوں پر نظر رکھنے والوں کو معلوم ہے کہ جب سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف (جس میں مطلّقہ کو حین حیات نفقہ دلانے کا فیصلہ کیا گیا تھا) مسلم پرسنل لا بورڈ کی ہدایت و تحریک پر وہ ملک گیر تحریک چلی جس کی اپنی عمومیت، باہوش جوش اور سنجیدگی اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں، تنظیموں اور مکاتب خیال کے اتحاد و تعاون میں تحریکِ خلافت کے علاوہ اور اس کے بعد کوئی نظیر نہیں ملتی تو ہندوستان کے غیر مسلم صحافیوں، دانشوروں اور عوام کی طرف سے ایک ایسے ردّ عمل، جوش و نفرت اور خوف و ہراس کا مظاہرہ ہوا کہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید اس ملک پر کوئی غیر ملکی طاقت حملہ کرنے والی ہے یا بجلی گرنے والی ہے یا زلزلہ آنے والا ہے، حالانکہ یہ اس حقیقت پسندی اور اس احساس تناسب (SENSE OF PROPORTION) کے خلاف ہے جس پر زندگی کا نظام چل رہا ہے، مسئلہ جس نسبت سے توجہ، فکر و پریشانی کا مستحق ہے، اسی نسبت سے اس کی طرف توجہ اور اس میں توانائی صرف کرنے کی ضرورت ہے، رائی کا پربت بنانا نہ عقل سلیم کا

ا۔ (ISLAMIC STUDIES QUARTERLY, VOL. XXIII NO. 4)

تقاضا ہے نہ عقلِ عملی (PRACTICAL WISDOM) کا، سب کو معلوم ہے کہ اس ملک میں مطلوبہ جہیز نہ لاتے پر دلہنیں اور معصوم لڑکیاں جلا دی جاتی ہیں، ملک میں سیکڑوں واقعات پیش آتے ہیں، ینشنل پریس کے ایک صحیفہ "قومی آواز" دہلی ۱۰ر جون ۱۹۸۴ء کے بیان کے مطابق "صرف دہلی میں ہر ساڑھے بارہ گھنٹہ پر ایک نئی بیاہی دلہن کو جلاکر مار ڈالا جاتا ہے" پھر اس سرزمین پر جہاں ہم آپ اس وقت جمع ہیں، مختلف اطراف میں ستی کی رسم اب بھی جاری ہے، اور اس کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، ایسی صورت میں کیا احساس تناسب، عقلِ سلیم اور انسانی ہمدردی بلکہ اپنے فرقہ سے محبّت کا تقاضہ یہ نہیں تھا کہ ان مظالم کی طرف توجہ اس سے کہیں زیادہ کی جائے جو مسلمانوں کے اپنے اسلامی عائلی قانون کے تحفّظ کے مطالبہ اور یونی فارم سیول کوڈ کی مخالفت میں کی جارہی ہے جس سے ملک میں حقیقی اتحاد پیدا ہونے کی امید رکھنا محض خوش فہمی اور دنیا کے واقعات سے اور دو گذشتہ جنگ عظیم سے سبق لینے کے مخالف ہے، جو ایک ہی عائلی قانون اور سول کوڈ کی ماننے والی دو پروٹسٹنٹ عیسائی قوموں اور ملکوں کے درمیان ہوئیں۔

پھر یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے تھا کہ اسلام اور مسلمانوں میں عورت کی شادی ہو جانے کے بعد وہ اپنے خاندان، والدین اور بھائیوں سے کٹ نہیں جاتی، اور مسلمان مُطلّقہ خاتون طلاق کے بعد یکسر لاوارث اور بھیک مانگنے یا زندگی کا خاتمہ کرنے پر مجبور نہیں ہوتی، نکاح اور طلاق دونوں حالتوں میں وہ خاندان کے ایک فرد، ماں باپ (اگر وہ زندہ ہیں) کی بیٹی اور بھائی بہنوں کی بہن ہوتی ہے، وہ ترکہ (HERITAGE) اور جائداد میں اس پورے حصّہ کی مستحق ہوتی ہے جو شریعتِ اسلامی نے مقرر کر دیا ہے، اور جس کا قرآن مجید میں ذکر اور اس کے دینے کی تاکید ہے۔

اس کے برخلاف ہندو معاشرہ اور سماج میں عورت شادی کے بعد اپنے خاندان، ماں باپ، بھائی بہنوں سے کٹ جاتی ہے، اس کی کفالت کی ذمہ داری سر تا سر شوہر پر عائد ہوتی ہے، اور شوہر کے انتقال پر عورت بالکل لاوارث اور تنہا ہو جاتی ہے اسی صورتِ حال اور رواج نے قدیم زمانہ میں (جس کی تاریخی تحدید مشکل ہے) خواتین کے طبقہ کو جو بیوگی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا، ستی کی رسم کی طرف مائل کیا جو اس کس مپرسی اور لاوارثیت سے نجات پانے کا واحد راستہ نظر آتا تھا۔

حضرات!

سپریم کورٹ کے فیصلہ کی منسوخی (جس میں مُطلّقہ کو حینِ حیات نفقہ دینے کو لازم قرار دیا گیا تھا) اور پارلیمنٹ میں اس کے خلاف ممتاز تاریخی غیر معمولی اکثریت کے ساتھ پرسنل لا بورڈ کے مطالبہ اور مسلمانوں کی رائے عامہ کے مطابق بل پاس ہو جانے کا جو تاریخ ساز اور یادگار واقعہ پیش آیا اور جس میں مسلم پرسنل لا بورڈ کو کھلی کامیابی ہوئی، اس کے بعد بھی مسلم پرسنل لا بورڈ کا (اور حقیقتاً شریعتِ اسلامی کی حفاظت و حمایت کرنے والوں اور مسلمانوں کے عائلی قانون (پرسنل لا) کے باقی رہنے کی جدّوجہد کرنے والوں کا کام ختم نہیں ہوا بقول شاعر ؎

مکتبِ عشق کا دیکھا یہ نرالا دستور
اس کو چھٹی نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا

اس کے بعد ایک اہم مرحلہ تو یہ ہے جو بورڈ کی توجہ کا موضوع اور حقائق و واقعات کا فطری تقاضا ہے کہ بل کے پارلیمنٹ سے پاس ہو جانے کے بعد بھی ہندوستان کی بعض ریاستوں اور بعض مقامات کی عدالتیں سپریم کورٹ کے سابقہ فیصلہ کے مطابق مُطلّقہ کو حینِ حیات

تفقہ دینے کے حق میں فیصلہ کر رہی ہیں، جو صریح قانونی تضاد بلکہ حقیقتاً ایک منظور شدہ قانون سے بغاوت کے مرادف ہے، جو مرکزی حکومت کا پاس کیا ہوا ہے، اور واجب العمل ہے، اس کے لئے بورڈ کی مجلس منتظمہ اور اس کے قانون داں ارکان اور وکلاء کوشش کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں مقدمات بھی دائر ہوئے ہیں یہ مرکزی حکومت کا فرض تھا اور ہے کہ وہ اپنے وزیر قانون کے ذریعہ یا اپنے اختیارات سے اس سلسلہ کو بند کرائے، اس سلسلہ میں بورڈ کے ایک وفد نے سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ جی سے ملاقات بھی کی تھی اور ان کی توجہ مبذول کرائی تھی، اور انھوں نے اس کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن نہ اُن کے عہدِ حکومت میں اس پر کوئی توجہ دی جاسکی اور نہ بعد کی حکومتوں کو اپنی اس ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے، اور اس میں مرکزی حکومت کی اہانت محسوس ہوتی ہے، ضرورت ہے کہ پوری توجہ اور تنظیم و امن کے ساتھ احتجاج اور قانونی چارہ جوئی کا سلسلہ جاری رہے ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں ان محنتوں پر پانی نہ پھر جائے جو اس سلسلہ میں کی گئیں۔

۲۔ بورڈ کے اہم ترین اور بنیادی مقاصد میں اصلاحِ معاشرہ کا کام داخل ہے، اس سلسلہ میں کوششیں ہوتی رہی ہیں، جلسے بھی اور دورے بھی ہوئے ہیں، جن میں سب سے بڑا عوامی جلسہ اور اجتماع یکم مارچ ۱۹۹۲ء کو پٹنہ کے گاندھی میدان میں ہوا، جس کی اپنی وسعت اور مقبولیت میں دور دور تک اور دیر دیر تک نظیر نہیں ملتی لیکن ضرورت ہے کہ اس کے لئے تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ہندگیر دورے اور عظیم و وسیع جلسے ہوں، دینی جلسوں اور مساجد کے مواعظ و خطبات کا بھی یہ موضوع بن جائے اور عام زندگی پر اس کا اثر پڑے۔

۳۔ عرصہ سے اس کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ اسلامی عائلی قانون کے

موضوع پر ایک مستند اور مفصل کتاب تیار کی جائے جو آزاد اور شرعی دار القضا سے لے کر سرکاری عدالتوں تک میں ایک قابلِ اعتماد حوالہ کی کتاب اور فقہی مرجع ہو، انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں محمڈن لا (MOHAMMADAN LAW) پر مسلمان ماہرینِ قانون سے کتابیں لکھوائیں، جن میں جسٹس سید امیر علی اور جسٹس عبد الرحیم کی کتابیں خاص طور پر مشہور و مقبول ہوئیں اور وکلاء اور ججوں نے ان پر اعتبار کیا۔

لیکن ضرورت تھی کہ از سرِ نو اور زیادہ محنت، وسیع النظری اور دقیق النظری کے ساتھ ہندوستان کے مستند علماء و ماہرینِ فقہ و حدیث اس کام کو انجام دیں اور ایک ایسی نئی کتاب کی ترتیب عمل میں آئے جو مرجع اور سند کا کام دے۔

اس ضرورت کا احساس سب سے پہلے مسلم پرسنل لا بورڈ کے بانی امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی کو ہوا جن کو اللہ تعالیٰ نے دور بینی، بیدار مغزی اور حقیقت شناسی اور خطرات کی آگاہی کی دولت سے خاص طور پر بہرہ مند فرمایا تھا، اور اسی بصیرت اور ذہانت و توفیقِ الٰہی نے ان سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل کا کام لیا تھا، انھوں نے اپنی نگرانی و سرپرستی میں مونگیر میں یہ کام شروع کرا دیا، لیکن اس کام کی تکمیل کی نوبت نہیں آئی تھی کہ انھیں سفرِ آخرت پیش آگیا۔

لیکن مولانا مرحوم کی وفات کے بعد بھی بورڈ اور امارتِ شرعیہ نے اس کام کو جاری رکھا اور ہندوستان کے مستند و ممتاز علماء، ماہرینِ فقہ اور مفتیانِ عظام نے اپنے مقامات سے سفر کر کے مونگیر اور پٹنہ میں ربیع الاول ۱۴۱۴ھ میں توفیق و اعانتِ الٰہی سے یہ کام مکمل کر لیا جس کو "قی الحال" اسلام کے عائلی قوانین کی دفعہ وار تدوین" کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔[1]

[1] اس تدوینی اور اہم علمی کام میں جن لوگوں نے زیادہ سے زیادہ وقت دیا اور اس کے مستقل شرکاء تھے۔

(باقی ص ۲۷۱ پر)

ضرورت ہے کہ اس کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ شائع ہو تاکہ وکلاء اور جج صاحبان بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں اور وہ قدیم محمڈن لا کی کتابوں کے قائم مقام ہو اور اس کی ایک سند اور مرجع کی حیثیت ہو۔

حضرات سامعین کرام! اب میں دین کے ایک نمائندہ اور داعی کی حیثیت سے اور "مسلم پرسنل لا بورڈ" کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے آپ سے ایمانی و قرآنی زبان میں کچھ خطاب کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے بغیر یہ شرف جو آپ نے اس عاجز کو بخشا ہے، اور یہ قیمتی وقت جو آپ نے اس موقر مجلس میں شرکت کے لئے دیا ہے، اس کا حق نہیں ادا ہوگا اور اندیشہ ہے کہ اللہ کے یہاں محاسبہ ہو، یہاں پر میں اس عرض داشت کا اعادہ کروں گا جو دہلی کے اجلاس منعقدہ ۲۳، ۲۴ر نومبر ۱۹۹۱ء میں کی گئی تھی۔

آپ دیکھئے کہ آپ اسلامی و قرآنی قانون معاشرت کا خود کتنا احترام کرتے ہیں؟ اس پر خاندانی روایات کو اور رسم و رواج کو کتنی ترجیح دیتے ہیں؟ اس پر اس کا اضافہ کیجئے جو آپ نے اپنے ہم وطنوں سے سیکھا ہے، جہیز کا بڑھا چڑھا مطالبہ ہم میں کہاں سے آیا؟ اس کو کسی نام سے یاد کیا جاتا ہو، یہ چیز کہاں سے آئی؟ مکہ و مدینہ حرمین شریفین سے آئی ہے؟ قرآن مجید کے راستے سے آئی ہے؟ یہ لعنت کہاں سے آئی؟ جب آپ اس کو قبول کرتے ہیں تو بطور سزا کے آپ کی غیرت ملی کو، آپکے وجودِ ملی کو بار بار نشانہ بنایا جاتا ہے۔

(باقی ص۲۷۰ کا) ان میں مولانا مفتی نعمۃ اللہ (مفتی امارت شرعیہ) مولانا محمد برہان الدین صاحب سنبھلی (دارالعلوم ندوۃ العلماء) مولانا مفتی احمد علی سعید (دارالعلوم وقف) مولانا ظفیر الدین (دارالعلوم دیوبند) اور مولانا نصر اللہ مفتی امارت شرعیہ کا خاص حصہ ہے، جزوی شرکا میں مولانا قاضی مجاہد الاسلام (قاضی امارت شرعیہ) مولانا ولی رحمانی (سجادہ نشین خانقاہ رحمانیہ و نگران مجلس و میزبان) ہیں۔

لیکن جب ہم اہلِ حکومت اور برادرانِ وطن سے شکایت کرتے ہیں تو ہمیں آپ سے شکایت کرنے کا حق کیوں نہ ہو؟ ان سے تو شکایت کریں گے اور ان کا دامن پکڑیں گے لیکن آپ کا گریبان پکڑلیں گے اور وہ ہاتھ ہمارا ہاتھ نہیں ہوگا، وہ دینی احتساب کا ہاتھ ہوگا وہ شریعت کا ہاتھ ہوگا جو آپ کا گریبان پکڑے گا اور کہے گا کہ پہلے تم اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھو کہ تم اس قانون پر کتنا چلتے ہو، تمھاری نگاہوں میں اس قانون کی کتنی حرمت ہے؟ تم جہاں اس قانون کو چلا سکتے ہو وہاں چلاتے ہو کہ نہیں؟ تم تو اپنے گھروں میں اس قانون کو نہ چلاؤ اور حکومت سے مطالبہ کرو کہ وہ تمھارے قانون کو چلائے اس کا احترام کرے۔

یہاں سے یہ عہد کر کے جائیے کہ اب قانونِ شریعت پر آپ چلیں گے، یہ جہیز کی کیا مصیبت ہے؟ لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش ہوتی ہے، شرائط پیش کئے جاتے ہیں، ان کے پورا نہ ہونے پر یہ معصوم لڑکیاں جلا دی جاتی ہیں ملک میں سیکڑوں واقعات پیش آتے ہیں کیا اس کائنات کے خالق اور نوعِ انسانی کے مربّی کو (جس کی مخلوق مرد و عورت دونوں ہیں) یہ چیز گوارا ہو سکتی ہے؟ کیا اس ظلم کے ساتھ کوئی ملک، کوئی معاشرہ پنپ سکتا ہے؟ خدا کی رحمت و نصرت کا مستحق ہو سکتا ہے؟ آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کی ہمت نہیں ہونی چاہئے تھی، میں نے دہلی ہی کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ	اور خدا ایسا نہ تھا جب تک
وَاَنْتَ فِيْهِمْ وَمَا كَانَ	تم ان میں تھے انھیں عذاب دیتا
اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ	اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں

يَسْتَغْفِرُوْنَ ٥ (سورۃ الانفال ۳۳)   اور انھیں عذاب دے۔

آپ رحمۃٌ للعالمین کی اُمّت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے ہندوستانی سماج میں، ہندوستان کے معاشرہ اور سوسائٹی میں یہ ظلم ہو، اس کو عقل قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، آپ کے ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں ہونا چاہئے تھا، چہ جائیکہ آپ کے ہاتھوں ہو، عہد کیجئے کہ آپ اسلامی طریقہ پر، شریفانہ انسانی طریقہ پر شادی کا پیام دیں گے، آپ لڑکی مانگیں گے، اپنے لئے رفیقۂ حیات کی تلاش کریں گے، بیٹے کے لئے پیام دیں گے، جہیز کے لئے آپ کے بڑھے چڑھے مطالبات نہیں ہوں گے کہ ہمیں یہ ملنا چاہئے، وہ ملنا چاہئے لڑکوں کو اور ان کے وارثوں اور بزرگوں کو اس کا عہد کرنا چاہئے کہ ہم اپنے یہاں تو کیا ہم اس ملک سے اس رسم کو ختم کردیں گے۔

ایسے ہی ترکہ شرعی طریقہ پہ تقسیم ہونا چاہئے، نکاح شرعی طریقہ پر ہو ـــــ اور طلاق کا مسنون طریقہ معلوم کرنا چاہئے، مسنون اور افضل طریقہ کیا ہے، پھر اس کے بعد فقہی طلاق جس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے اس کو سمجھنا چاہئے، یہ بھی جاننا چاہئے کہ طلاق رجعی کیا ہوتا ہے؟ طلاق بائن مغلّظہ کیا ہوتا ہے؟ پھر آپ یہ بھی سمجھیں کہ طلاق اَبْغَضُ المباحات ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جائز ہے لیکن آخری درجہ کی چیز ہے، بڑی مجبوری کی چیز ہے، جو اپنے کو حرام چیزوں سے اور زندگی کو تلخ بننے سے بچانے کے لئے بہت مجبوری سے دل پر پتھر رکھ کر اختیار کی جاتی ہے، یہ نہیں کہ طلاق ایک فیشن ہو گیا ہے، جو لوگ مسلمانوں کو یہ طعنہ دیتے ہیں اس میں تھوڑی سی ہماری کوتاہی کو بھی دخل ہے، جتنا طعنہ دیتے ہیں اتنے کے مستحق تو ہم ہرگز نہیں ہیں[1]۔

---

[1] مسلمانوں میں طلاق کی شرح وہ نہیں ہے، جو بیان کی جاتی ہے، اس میں مبالغہ اور رنگ آمیزی سے کام لیا جاتا ہے پھر بھی تھوڑی سی بے اعتدالی ضرور ہے۔

حضرات! اب آپ اس اجلاس سے جو جے پور میں "جامعۂ ہدایت" کے سایہ میں ہو رہا ہے، اپنے اپنے مقامات پر واپس جائیں گے، ضرورت ہے کہ آپ جامع پیغام ہدایت لے کر جائیں اور یہ اجلاس نہ صرف آپ کے عائلی اور خاندانی دائرہ میں کتاب وسنّت اور ہدایت ربّانی کے مطابق زندگی گذارنے، اہلِ حقوق کو ان کے حقوق ادا کرنے اور ایک صالح وعادل اور متبع سنّت معاشرہ کا نمونہ پیش کرنے کا باعث ہو بلکہ آپ کے ذریعہ آپ کے ہم وطن اور ہم شہر مسلمانوں ہی نہیں بلکہ غیر مسلموں کے سامنے بھی اسلامی عائلی زندگی اور صالح معاشرہ کا ایک ایسا نمونہ سامنے آئے جس سے ان کو نہ صرف اسلام کی تعلیمات کی قدر اور اعتراف ہو بلکہ اس کی طرف کشش اور انجذاب پیدا ہو۔

وما ذلک علی اللہ بعزیز۔"

اس اجلاس کے سلسلہ میں ایک بڑی آزمائش یہ پیش آئی کہ مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب جو اس اجلاس کے داعی اور میزبان حقیقی تھے، سخت علیل ہو کر بمبئی تشریف لے گئے اور یہ اجلاس ان کی براہ راست سرپرستی اور رہنمائی سے محروم رہا لیکن ان کے لائق اور عالی ہمّت صاحبزادوں مولوی فضل الرحیم ندوی اور مولوی ضیاء الرحیم ندوی نے اپنے والد نامدار کی پوری قائم مقامی کی اور اجلاس کو کامیاب بنانے میں ایسی سعی وجہد اور بیدار مغزی سے کام لیا کہ (حضرت شاہ صاحب کے وجود کی برکت اور ان کی زیارت کے علاوہ) کوئی خلا اور نقص محسوس نہیں ہوا، خود اہلِ جے پور نے اس دینی وملّی اجتماع کو کامیاب بنانے اور جے پور کا نام روشن کرنے کے لئے ایسا تعاون، دینی حمیت اور علمی عزیمت کا ثبوت دیا جس کی بہت کم مثال دیکھنے میں آئی،

جامعہ ہدایت کی وسیع اور شاندار عمارت جو شہر سے کچھ فاصلہ پر ہے مندوبین، ارکانِ بورڈ

اور مہمانوں سے جو ملک کے مختلف حصّوں اور دور دراز گوشوں سے سفر کر کے آئے تھے، بھری ہوئی تھی، اور نشستوں کے انتظامات، حاضرین کی مہمانداری اور راحت اور ان کی راحت وسہولت کے سلسلہ میں کوئی کمی یا غفلت محسوس نہیں ہوئی، مجلس عاملہ کے جلسے بھی اور بورڈ کے عمومی جلسے بھی بڑے اطمینان وسکون اور خوش نظمی کے ساتھ ہوتے رہے، پھر ۱۰؍ اکتوبر کی شب میں جے پور کے میدان رام لیلا گراؤنڈ میں جو عمومی جلسہ ہوا اس کی اپنی کثرت تعداد اور توجہ والتفات کے لحاظ سے بہت کم نظیریں ملیں گی، لوگوں کا اندازہ ہے کہ حاضرین کی تعداد ایک لاکھ سے کم نہ ہوگی، راقم نے بھی تقریر کی جس کا عنوان تھا "وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ"[1] (کسی صاحبِ ایمان مرد اور کسی صاحبِ ایمان عورت کو یہ اختیار نہیں اور اُن کے شایانِ شان نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول ؐ کوئی فیصلہ کردیں تو ان کو اختیار۔ پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا حق۔ باقی رہے) اس سلسلہ میں پوری شریعت پر عمل کرنے اور اس کے ہر مقابل اور مخالف قانون اور رسم ورواج سے مجتنب اور محفوظ رہنے کی پابندی اور التزام کی دعوت دی گئی، اور کہا گیا کہ اس جلسہ سے آپ اگر یہی پیغام لے کر جائیں تو کافی ہے، اگر ہو سکتا تو ایک کاغذ پر لکھ کر یا پیشانی پہ کندہ کر کے آپ کو واپس کیا جاتا۔

راقم کے علاوہ دوسرے ممتاز مقررین نے بھی پُر اثر عالمانہ اور داعیانہ تقریریں کیں اور ان کا بڑا اثر ہوا اور شہر میں چرچا رہا۔

---

[1] سورۃ الاحزاب آیت ۳۶

ٹونک کا سفر

پرسنل لا بورڈ کے جلسہ سے فارغ ہو کر ۱۱ر اکتوبر کو ٹونک کا قصد کیا جو تیرہویں صدی کے وسط اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے بعد سے ہمارے خاندان کا ایک ایسا مستقر بن گیا جہاں تقریباً تو ے۹۰ برس تک ہمارے خاندان قُطبی عَلَم اللّٰہی ساکن رائے بریلی کا دو تہائی حصہ مقیم رہا اور جس میں خاندان کے متعدد نامور افراد اور عالم و صالح پیدا ہوئے، راقم نے یہاں کا سب سے پہلا سفر اپنے استاد اور شیخ الحدیث حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحب (استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء) کی معیت اور ہم رکابی میں مئی ۱۹۳۶ء میں کیا تھا اور وہیں ایک دن علی الصباح رود بناس کے کنارہ پر (جہاں مجاہدین اور عاملین یا لدّین نے بارہا وضو کیا ہوگا) ندی میں پاؤں ڈال کر طلوع آفتاب سے پہلے زیر تجویز کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" کا مقدمہ لکھا تھا، (جو کتاب کے ساتویں ایڈیشن کے صفحہ ۵۵ سے صفحہ ۶۰ تک آیا ہے) اور جو کتاب کا ایک طاقتور اور مؤثر حصّہ ہے، اور جس پر "مئی ۱۹۳۶ء رود بناس ریاست ٹونک" کے الفاظ حاشیہ میں لکھے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد سے اپنے قریبی اعزّہ اور ہم جدّی افراد کی ملاقات اور محبّت میں کئی بار جانا ہوا اور خاصا وقت گزارتا ہوا، پھر جب اس خاندان کو تحریک خلافت میں دلچسپی لینے اور بعض غلط اطلاعات اور افواہوں کی بنا پر ۱۹۲۰-۱۹۲۱ء میں ریاست کے حکم سے ترکِ وطن کرنا پڑا تو تقریباً یہ پوری شاخ اپنے قدیم وطن رائے بریلی منتقل ہو گئی، جہاں اس کے قریب ترین اعزّہ تھے[1]

---

[1] اس کا تذکرہ "کاروانِ زندگی" کی پہلی جلد میں تفصیل سے آچکا ہے۔

۱۹۳۲ء میں ان کا بڑا حصہ ٹونک واپس آگیا، ۱۹۴۷ء کے بعد جب پاکستان کی تشکیل عمل میں آئی تو خاندان کی بہ بچی کھچی تناخ پاکستان منتقل ہوگئی، لیکن اب اس موقع پر اکتوبر ۱۹۹۳ء میں جب راقم ٹونک گیا تو وہ اعزہ کے مسکن کے بجائے اعزہ کا مدفن تھا، محلہ قافلہ جو پورا کا پورا ہمارے خاندان کا وطن و مسکن تھا، خاندان کے افراد سے بالکل خالی تھا، بڑی بڑی حویلیاں اور وسیع عمارتیں دوسرے افراد سے آباد تھیں، جن میں بعض جگہ غیر مسلم بھی تھے[۱]، راقم نے باہر سے ان پر نظر ڈالی اور گزشتہ زمانہ یاد کر کے دل پر چوٹ لگی، اب ان عزیزوں کی زیارت اور ان کو سلام و دعا کرنے کی جگہ بجائے قافلہ کے شہر کا مشہور و وسیع مدفن و مقبرہ موتی باغ تھا، جہاں والیِ ریاست کے خاندان کے افراد بھی دفن تھے، اور ہمارے اعزہ و اقارب بھی جن میں ہماری حقیقی پھوپھی (اہلیہ استادی جناب مولانا سید طلحہ صاحب حسنی ایم اے) قریبی و شفیق چچا سید اسماعیل صاحب (نبیرہ حضرت سید صاحبؒ) اور بہت سے قریبی اعزہ مدفون ہیں، لیکن یہ مقبرہ عام طور پر سنّت کے مطابق خام قبروں کا قطعہ ہے، یہاں تک کہ والیِ ریاست ثانی نواب وزیر الدولہ بہادر کی قبر بھی کچی ہے جس پر کوئی کتبہ بھی نہیں ہے، کتبات اور شناخت نہ ہونے کی وجہ سے کسی عزیز و بزرگ کی قبر کا تعیّن نہ ہو سکا، صرف استادی و شیخی حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ (تلمیذ امام حدیث شیخ حسین بن محسن انصاری یمانی

---

[۱] مختلف روایات سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کو قافلہ کا رہنا راس نہ آیا اور جن لوگوں نے ان مکانات میں جو موحّدین ہی نہیں داعیان توحید سے معمور تھے، بُت پرستی کی کوشش کی یا مشرکانہ مراسم ادا کرنا چاہے ان کو ایسے واقعات اور مشاہدات پیش آئے کہ ان میں سے اکثر نے ان مکانات کا تخلیہ کر دیا اور مسلمانوں کے حوالہ کر دیا۔

ومجاز شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ) کی قبر پر ایک نشان ملا جس سے
ان کی قبر کا تعین ہوا اور فاتحہ پڑھی، یہ سید صاحب کی جماعت و دعوت اور اتباعِ
سنّت کی برکت تھی کہ یہاں نہ قبروں پر گنبد و عمارت ہے نہ عرس و چادر پوشی اور
چڑھاوے کی رسم ہے ؎

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ٹونک کے دو روزہ قیام میں جو مدرسہ فرقانیہ (قائم کردہ استادی حضرت
مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ) میں رہا، دو اور مدرسوں اور مرکزوں میں تقریر رہی،
جن میں مولانا حکیم برکات احمد صاحب (امام معقولات) کا مدرسہ خلیلیہ بھی تھا، اصل
اور طاقتور تقریر قافلہ کی مسجد میں ہوئی جہاں پہنچتے ہی دل و دماغ اور تاریخ کے نقوش کہن
بلکہ زخمہائے کہن تازہ ہو گئے کہ یہی مجاہدین اور شہدائے بالاکوٹ کی اولاد کی مرکزی
مسجد ہے، جہاں بتایا جاتا ہے کہ تہجد میں ایسی تعداد ہوتی تھی جتنی بعد میں مغرب میں،
وہاں ناچیز کی تقریر قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر اور تطبیق تھی "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ
يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا" [1] (ان ایمان والوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ انھوں نے
جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اسے سچ کر دکھایا، پھر ان میں کچھ وہ ہیں جو اپنی نذر
پوری کر چکے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو (شہادت کے) مشتاق ہیں، اور انھوں نے ذرا سا بھی
ردّ و بدل نہیں کیا۔)

---

[1] سورۃ الاحزاب ۔ ۲۳

حسبِ مقام ہونے اور اس خاندانی وجذباتی تعلق کی بناپر (جو جماعت مجاہدین اور اہلِ قافلہ سے اس عاجز کو ہے) اس تقریر میں وہ آمد، جذبہ اور قوت تھی جو عرصۂ دراز سے کسی تقریر میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔

اہلِ ٹونک نے راقم کا اس کی خاندانی نسبت کی وجہ سے پُرجوش اور مُخلصانہ استقبال کیا تھا، وہ ٹونک کے مدخل بناس ندی کے کنارہ بڑی تعداد میں جمع تھے، اور انھوں نے اپنے خلوص و مسرّت کا اظہار کیا، خوش قسمتی سے اس سفر میں مولانا مفتی احمد حسن صاحب کی معیت اور رفاقت بھی حاصل تھی، جو ٹونک ہی کے رہنے والے اور مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے ہیں، ان کے علاوہ اسی خاندان کے چند ندوی فضلاء (مولوی محمد عمر ندوی اور ان کے بھائی مولوی محمد عامر ندوی کا بھی جو جے پور سے ساتھ آئے تھے سفر کی افادیت اور قیام کی سہولت میں بڑا دخل ہے، صاحبزادہ شوکت علی خاں صاحب (سابق ڈائرکٹر مولانا آزاد عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ) سے بھی قدیم نیاز حاصل تھا وہ بھی موجود تھے حُسنِ اتفاق سے دو قریبی عزیز سید احمد علی حسنی ندوی اور ان کے چھوٹے بھائی سید محمد علی (جو ٹونک ہی میں ایک اسکول میں مدرس ہیں) بھی معیت اور رفاقت کے لئے رائے بریلی سے آگئے تھے، ان کی وجہ سے قافلہ میں قدیم اعزّہ کے مساکن کے تعیّن اور نشاندہی میں بڑی مدد ملی۔

ایک فتنہ اور اس کا جواب

جے پور میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس کے اختتام پر اجلاس کی

جو کارروائی اور اس کی جو منظور شدہ تجاویز اخبارات میں شائع ہوئیں ان میں اجلاس کی ایک اہم اور بنیادی تجویز اور مسلمانوں سے اس پر عمل کرنے کی دعوت اور مطالبہ شائع ہوا اس میں ملک کے مختلف حصوں اور شہروں میں ایسے اداروں اور مراکز قائم کرنے کی تجویز بھی تھی، جن میں متنازع فیہ عائلی اختلافات اور مسائل کے بارہ میں شریعت کے مطابق فیصلہ کیا جا سکے اور مسلمان ایسے مسائل اور تنازعات کو سرکاری عدالتوں میں لے جانے کے بجائے ان مراکز میں لے جائیں جن میں علماء اور اہلِ فتویٰ قرآن و حدیث اور شریعت کی روشنی میں فیصلہ صادر کریں اور فریقین شریعت کے احترام اور اللہ اور اس کے رسول کے منشاء کی تعمیل میں ان پر عمل کریں اور ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔

اس کے لئے قدیم سے ہندوستان اور اس کے باہر "دار القضاء" کی اصطلاح مروّج اور مستعمل ہے اور اس پر کبھی کسی کو اعتراض نہیں ہوا، تجویز کی اشاعت اور بعض تقریروں میں دار القضاء کے بجائے "شرعی عدالتوں" کا جملہ آ گیا اور اپیل کی گئی کہ ہر جگہ شرعی عدالتیں قائم کی جائیں، اس تعبیر اور اصطلاح سے انگریزی ہندی پریس اور بعض اردو اخبارات میں بھی اور ملک کی موجودہ صورتِ حال کے پیش نظر غیر مسلم حلقہ میں مسلمانوں کے سلسلہ میں جو حسّاسیت (ELERGY) اور جذباتیت (SENSITIVENESS) پیدا ہو گئی ہے، پبلک کو یہ تأثر دیا گیا کہ مسلمان اس ملک میں ایک متوازی نظامِ عدالت اور گویا "حکومت اندرون حکومت" قائم کرنا چاہتے ہیں وہ سرکاری عدالتوں کے مقابلہ میں شرعی عدالتیں قائم کرنے والے ہیں، اس موضوع پر انگریزی ہندی اخبارات میں (جن میں بعض سطحی و جذباتی اردو اخبارات بھی تھے) سخت تنقیدیں اور

بعض قوم پرست حلقوں میں سخت ردّ عمل پیدا ہوا اور پڑھے لکھے طبقہ میں ایک نیا موضوع بحث اور قلمی معرکہ سامنے آگیا جس میں متعدد مسلمان اہلِ قلم اخبار نویسوں اور مراسلہ نگاروں نے بھی حصّہ لیا، اور غیور و حسّاس اور فہیم مسلمانوں اور متوازن مزاج مسلم اخبارات میں اس کی ضرورت سمجھی گئی کہ اس غلط فہمی کو رفع کیا جائے اور کوئی ایسا بیان شائع ہو جس سے یہ غلط فہمی رفع ہو اور بورڈ کا مقصد اور دائرۂ کار سامنے آئے۔

اکتوبر کی ۱۳ر تاریخ تھی کہ لکھنؤ میں ہمارے قدیم محب و مخلص دوست اقتدار علی خاں صاحب انجینیر کی بیگم صاحبہ کا (جو ایک با خبر تعلیم یافتہ خاتون ہیں اور اخبارات میں ان کے مراسلے اور مضامین بھی آتے ہیں) ٹیلیفون آیا کہ اس اصطلاح اور تعبیر (شرعی عدالتیں) سے بہت غلط فہمی پھیل رہی ہے اور متعصب حلقوں کو مسلمانوں کے خلاف جذبات بھڑکانے کا موقع مل رہا ہے، ہمارے ایک داماد طارق حسن صاحب ہیں جو انگریزی اخبارات اور پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے ایک ممتاز نامہ نگار اور ترجمان ہیں آپ اجازت دیں تو ہم ان کو آپ کے پاس بھیج دیں وہ آپ سے گفتگو کریں گے اور اس کی روشنی میں اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ہم نے اس کی اجازت دے دی اور وہ ۱۳ر اکتوبر کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تشریف لے آئے، انھوں نے ہم سے تجویز کی تشریح چاہی ہم نے وضاحت کر دی کہ بورڈ کے بحث و مباحثہ اور تجویز میں عام طور پر "دار القضاء" کا لفظ استعمال ہوا، اور وہ عائلی، ازدواجی، طلاق و میراث اور محدود باہمی تنازعات کے بارہ میں شریعت کا حکم معلوم کرنے اور اس پر عمل کرنے کا ذریعہ اور شرعی رہنمائی کا مرکز ہوتا ہے، جو خاندانوں میں

زوجین میں اور فریقین میں پیش آتے رہتے ہیں، اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ فریقین اس فیصلہ کو اکثر احترام کے ساتھ اور حکم شرعی سمجھ کر قبول کرتے ہیں اور عدالتوں کی طوالت، مصارف اور اپیلوں کی زحمت سے بچ جاتے ہیں، پھر شریعت پر عمل کرنے کی وجہ سے مستحقِ ثواب اور تابعِ شریعت ثابت ہوتے ہیں۔

طارق حسن صاحب کی فرض شناسی اور مستعدی کا اظہار ہوا کہ اگلے ہی دن (THE TIMES OF INDIA) کے لکھنؤ کے ایڈیشن مورخہ ۱۴؍اکتوبر کے پہلے صفحہ پر (اور اس کا بقیہ دوسرے صفحہ پر) نمایاں طریقہ پر وہ گفتگو شائع ہوگئی، اس میں دارالقضاء اور قاضی کی پوری تشریح آگئی اور یہ کہ صدیوں سے ہندوستان میں یہ مراکز اور ادارے قائم ہیں، اور ان پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا، اور ان سے بہت سی سہولتیں حاصل ہوئیں، اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ پریس نے اس سے آنے والے انتخابات کے سلسلہ میں غلط فائدہ اٹھانے کا کام لیا ہے، ان مرکزوں کو کسی فریق کو سزا دینے اور سرکاری عدالتوں کی طرح حاکمانہ طریقہ پر عمل کرنے کا اختیار نہیں (الیٰ آخرہ)

۱۵؍اکتوبر کو "قومی آواز" کے نمائندہ حسین امین صاحب نے بھی راقم سے ملاقات کی اور اس مسئلہ پر گفتگو کی، اگلے دن ۱۶؍اکتوبر کو ان کا انٹرویو بھی "قومی آواز" میں نمایاں طریقہ پر شائع ہوا، ان کے بیان میں اتنا اضافہ اور ہے کہ:۔

"متعدد ریاستوں میں ایسے ادارے قائم ہیں جہاں معاملات کا تصفیہ ہو جانے کے بعد فریقین آپس میں گلے مل گئے، بہار میں امارت شرعیہ بہت بڑے پیمانے پر مدتوں سے قائم ہے اور اس کے ماتحت کثیر تعداد میں دارالقضاء ہیں، اڑیسہ میں بھی، بنگلور اور خود لکھنؤ میں بھی دارالقضاء

اور دارالافتاء ہیں، مولانا نے کہا کہ دارالقضاء بہت کارآمد ہوتے ہیں کیونکہ دیوانی عدالتوں کے بہت کم وکلاء صاحبان شرعی قوانین جانتے ہیں، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ شرعی عدالت کے فیصلوں کو (خاص طور پر بہار میں) دیوانی عدالتوں میں تسلیم کیا گیا اور ان کا احترام کیا گیا ہے، وہ معاملات جو شرعی طریقہ پر طے کئے جا سکتے ہیں، عدالتوں کی دوڑ بھاگ اور بے جا اور اکثر ناقابلِ برداشت مصارف کے بغیر حل ہو جاتے ہیں، انھوں نے افسوس ظاہر کیا کہ ذرائع ابلاغ کے بعض حلقوں میں دارالقضاء کے بارہ میں بلاوجہ تنازعہ اٹھا دیا گیا اور رائی کا پہاڑ بنا دیا۔[1]

سفر سمرقند و بخارا

راقم سطور کے عالمِ اسلام کے نامی گرامی، مردم خیز و عطر بیز، تاریخ ساز اور مرکزِ علم و روحانیت، خطّہ "ماوراء النہر" کی تاریخ سے واقفیت، اور اس کا ممنون احسان اور اس کی عدیم النظیر شخصیتوں کا مدّاح و معترف ہونے کی غیرت نے (علمی طور پر) گوارا نہیں کیا کہ وہ یورپ اور امریکہ کا بار بار سفر کرے اور آخر میں اپنی زندگی کا وہ طویل ترین سفر بھی کرے جس کا ذکر پچھلے صفحات میں آیا ہے، اور وہ ماوراء النہر[2] کے اس اہم خطہ بلکہ

---

[1] "قومی آواز" لکھنؤ ۱۶/ اکتوبر ۱۹۹۳ء

[2] دریائے آکسس (OXUS) (عربی "جیحون") فارسی بولنے والی قوموں اور ترکوں کے درمیان یعنی ایران و توران کے درمیان ایک حدِ فاصل مانا جاتا تھا، اس دریا کے پار شمال میں جس قدر ممالک تھے ان کو عرب ماوراء النہر کہتے تھے، اور جو اس دریا کے مغرب میں تھا اس کو خراسان (باقی ص۲۸۵ پر)

مستقل ملک کی زیارت سے محروم رہے جس نے ایک طرف حدیث میں امام بخاریؒ، امام ترمذیؒ، جیسے ائمۂ حدیث، فقہ میں فقیہ ابواللیث سمرقندی شمس الائمہ سرخسی (صاحب المبسوط) ابوالحسن علی ابن ابی بکر مرغینانی (صاحبِ ہدایہ) ابویعقوب اسحاق بن ابراہیم الشاشی[1] (صاحبِ اصول الشاشی) علم کلام کے ایک عالم جلیل ابومنصور ماتریدی پیدا کیے، دوسری طرف حکمت اور علوم عقلیہ میں ابوالنصر فارابی اور الشیخ الرئیس بوعلی بن سینا جیسے نوادرِ روزگار اور فخرِ عالم ہستیاں پیدا کیں جن کو عربی زبان میں "عمالیق" (GIANTS) کہیں گے۔

ان ائمۂ حدیث وفقہ اور نادرۂ روزگار حکماء وفلاسفہ کے علاوہ پیشوائے روحانیت، بانی سلسلۂ طریقت اور مجدد اخلاص وتعلق مع اللہ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ (بانی سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ) خواجہ عُبید اللہ احرار جیسے سرآمدِ روزگار مشائخ، دوسری طرف تیمور جیسا فاتح اور کشور کُشا اور ظہیر الدین بابر بانی سلطنت مغلیہ پیدا ہوئے، اور جس خطّہ میں بخارا، سمرقند، تاشقند (قدیم شاش) فرغانہ، مرغینان، ترمذ، فاراب، خجند، ساباط، فربر اور درجنوں مردم خیز اور کیمیا اثر شہر اور خطّے

(باقی صفحہ ۲۸۳ کا) کہتے تھے جس کا صدر مقام خوارزم تھا، ماوراء النہر کی سرزمین بڑی سرسبز وشاداب اور مردم خیز واقع ہوئی تھی (مستفاد از "جغرافیہ خلافتِ مشرقی"، تصنیف: جے۔ لی۔ اسٹرینج، معجم البلدان جلد ۹) ماوراء النہر میں سنکیانگ، قازقستان، قرغزیا، تاجکستان، ازبکستان، ترکمانستان، آذربائیجان شامل ہیں، اس علاقہ بلکہ ملک کے اہم شہروں میں بخارا، سمرقند، فرغانہ، مرغینان، سُغد، نسف، ترمذ، فاراب، شاش، خجند، ساباط، اسبیجاب، اشروسنہ، فربر، اوزجند شامل ہیں۔

[1] شاش کی طرف نسبت ہے جس کو آج کل تاشقند کہتے ہیں۔

واقع ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس سفر کا ایک غیبی انتظام فرمایا اور اس کے لئے ایک ایسی تقریب پیدا کی جو اس خطّہ کے شایانِ شان اور حسب مرتبت تھی، سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی نے اپنے ایک گزشتہ اجلاس میں یہ طے کیا تھا کہ وہ امام بخاریؒ کے مزار اور اس سے ملی ہوئی مسجد کے جوار میں عالی مرتبت امام کی یادگار میں اور ان کے بے نظیر کارنامہ (جامع صحیح کی تدوین اور حدیث کی خدمات) کا عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق تعارف کے لئے ایک علمی مرکز قائم کرے گا، جہاں تحقیقی کام کرنے والے اور اس کارنامہ کے قدر شناس بحث و تحقیق کا کام کریں گے اور ان کے کمالِ علمی و انفرادیت اور خدمتِ دین کے کارنامہ کو اہلِ علم اور اہلِ عصر کے سامنے پیش کریں گے، اس تجویز میں برونائی کی نوزائیدہ سلطنت (جو مالی وسائل کے لحاظ سے بعض بڑے بڑے ملکوں پر فوقیت رکھتی ہے) کے فرماں روا سلطان حاجی حسن کی سرپرستی اور تائید اور اس کے وزیر تعلیم پیہن عبدالعزیز عمر کی (جو سنٹر کے ممبر بھی ہیں) دلچسپی اور معاونت شامل تھی، سنٹر کے اخیر اجلاس میں (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) اس کے لئے ۲۳ / ۲۴ / اکتوبر کی تاریخیں مقرر ہو گئیں، اور راقم سطور نے وہاں تو اس کا وعدہ اور ارادہ کر لیا کہ یہ بڑی سعادت کی بات اور زندگی کا یادگار سفر ہوگا لیکن ۲۰ ستمبر کو ترکی، یورپ، امریکہ اور حجاز مقدس کے سفر سے جب واپسی ہوئی تو سفر کی تکان، جمع شدہ ڈاک اور لکھنؤ اور رائے بریلی کے قیام کی مصروفیتوں اور ضرورتوں نے اس ارادہ اور فیصلہ میں تردد پیدا کر دیا، اس درمیانی مدّت میں ضلع اعظم گڑھ کا سفر پیش آیا جو کار کے ذریعہ ہوا، وہاں مظفر پور (ضلع اعظم گڑھ) میں واقع عزیز گرامی مولوی تقی الدین ندوی کے

قائم کردہ مدرسہ کے جلسہ میں شرکت کی جو ایک چھوٹی کار کے ذریعہ ہوا، سڑکیں خراب اور بعض جگہ شکستہ تھیں، پھر بذریعہ کار مئو جانا ہوا، جہاں چار پانچ پروگرام پورے کرنے پڑے وہاں رفیق عزیز مولوی سعید الرحمٰن ندوی کی توجہ و تعلق سے ایک اچھی کار مل گئی، پھر خاص شہر اعظم گڑھ میں دار المصنفین کی مجلس انتظامی میں شرکت کی اور وہاں سے بذریعہ کار ہی رائے بریلی واپسی ہوئی، تقریباً دو سو کلومیٹر بذریعہ کار جانا اور دو سو کلومیٹر بذریعہ کار آنا ہوا، رائے بریلی سے سلطانپور، وہاں سے جونپور اور وہاں سے اعظم گڑھ پہنچنا ہوا تھا، مظفر پور پہنچ کر ایسا تکان اور ضعف محسوس ہوا کہ ڈاکٹر کو بلانا پڑا، انھوں نے ٹسٹ کیا اور بتایا کہ بلڈ پریشر (LOW) ہے اور آرام کی ضرورت ہے، اس کے باوجود جس مقصد کے لئے یہ سفر ہوا تھا اس کی تکمیل نہ کرنے سے شرم آئی اور بعد مغرب جلسہ میں شرکت بھی کی اور طویل تقریر بھی۔

اس کے چند ہی دن کے بعد ازبکستان کا سفر کرنا تھا جو اگرچہ ہوائی جہاز سے تھا لیکن لکھنؤ سے دہلی اور دہلی سے تاشقند جانا تھا، صحت کی اس حالت اور کاموں کے تقاضے کے پیش نظر سفر کے بارہ میں بڑا تردد پیدا ہو گیا اور سفر سے معذرت کر دینے کا رجحان غالب آ گیا، لیکن اچانک دہلی سے یہ اطلاع ملی کہ مُحِبِّ گرامی محمد عثمان صاحب حیدرآبادی صرف ہماری معیت و رفاقت اور ہم کو آرام پہنچانے کے لئے اپنے مصارف پر ریاض سے دہلی پہنچ گئے ہیں، اگر ہم نے سفر کو ملتوی کر دیا تو ان کا آنا جانا بیکار ہوگا، اور اس کے مصارف ہی ان کے حصہ میں آئیں گے، عزیزی محمد رابع ندوی کو ہمارے ساتھ جانا تھا، اور ان کا انتخاب سنٹر کے اسی جلسہ میں ہوا تھا، جس کا ذکر گزر چکا، اچانک توکلاً علی اللہ (اس سفر کی اہمیت اور اس تاریخی و دینی

ذوق کی بنا پر جو وراثۃً ملا ہے) سفر کا عزم کر لیا اور کمر ہمت باندھ لی اور دہلی عزیزی نیاز احمد کو (جو اپنے ہم وطن و معاون ہیں، اور جن سے اندرون و بیرون ملک کے سفروں میں ہوائی جہاز اور ٹرین میں بکنگ کراتے ہیں اور متعلقین کی خیریت معلوم کرتے اور ان کو اپنی خیریت کی اطلاع دینے میں ہر موقع پر مدد ملتی ہے) اس کی اطلاع کر دی اور انھوں نے ہم تینوں (راقم و عزیزی محمد رابع اور بھائی محمد عثمان صاحب) کے لئے ۲۲؍ اکتوبر کو صبح ۱۱ بجے ازبک ایرلائن سے تاشقند جانے والے جہاز میں سیٹیں بک کرا لیں، وکان أمر اللّٰہ قدرًا مقدورًا۔

تاشقند میں

۲۲؍ اکتوبر کو ۱۱ بجے دہلی سے ازبک ایرلائن سے تاشقند کے لئے روانگی ہوئی، جہاز میں داخل ہوئے تو فاضل گرامی پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی پر نظر پڑی جس سے بڑی مسرّت ہوئی، صدر جمعیۃ العلماء مولانا سید اسعد مدنی اور ان کے رفیق مولانا سعید احمد پالن پوری بھی نظر آئے، بتایا گیا تھا کہ ڈھائی گھنٹے میں جہاز تاشقند پہنچ جاتا ہے لیکن تین ۳ گھنٹے سفر میں صرف ہوئے اور ظہر کے وقت ہم لوگ تاشقند پہنچ گئے، وہاں ویزے کی کارروائی میں خاصی دیر لگی اور پورے سفر میں یہ اندازہ ہوا کہ یہاں مشرقی مزاج کارفرما ہے اور کارروائی میں مغربی ممالک کی سی سرعت اور عجلت نہیں، ہم لوگوں کا قیام تاشقند میں ازبکستان (UZBEKISTAN) ہوٹل میں ہوا، جو ایک شاندار ہوٹل ہے جس میں ۱۵ منزلیں بتائی جاتی ہیں، باہر سے وہ جالیوں کا ایک جال معلوم ہوتا ہے۔

خیال تھا کہ شاید رات اسی ہوٹل میں گزارنی پڑے لیکن کچھ دیر کے بعد سمرقند جانے کا اعلان ہوا اور سمرقند جانے والی فلائٹ سے چالیس منٹ میں (بوقت مغرب) سمرقند پہنچ گئے، مدعوئین عموماً سمرقند ہوٹل میں ٹھہرائے گئے، ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف صاحب (سابق سکریٹری جنرل رابطۂ عالمِ اسلامی مکہ معظّمہ) اور راقم اور اس کے دونوں رفیقوں عزیزی محمد رابع ندوی اور برادرم محمد عثمان صاحب کو گورنمنٹ گسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔

۲۳ ر اکتوبر کو صبح ۱۰بجے سے ۱۲ بجے تک افتتاحی جلسہ ہوا جس میں گورنر سمرقند اوّل نائب وزیر اعظم، ڈاکٹر عبداللہ نصیف، راقم سطور اور مؤتمر اسلامی کے جنرل سکریٹری حامد الغابد اور اسلامک سنٹر آکسفورڈ کے سکریٹری فرحان نظامی نے تقریریں کیں۔

تقریریں زیادہ تر ازبکی اور انگریزی زبان میں ہوئیں، ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف اور راقم نے عربی میں خطاب کیا، مجھے جلسے میں شدّت سے احساس ہو رہا تھا کہ جلسہ پر وہ فضا طاری نہیں جو ایک امام حدیث (بلکہ امیر المؤمنین فی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اصحّ الکتب بعد کتاب اللہ کے مصنّف) کی تقریب یادگار اور اعتراف وتعارف کے جلسہ پر طاری ہونی چاہئے، میں نے اپنی تقریر میں اس کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ کسی فاتح، سورما (بطلٌ من الأبطال) کے سلسلہ میں جو تقریب منعقد کی جاتی ہے، اس میں وہ زبان بولی جاتی ہے اور وہ تقریریں کی جاتی ہیں جن سے سننے والوں میں جوانمردی، سپہ گری (فتوّۃ وبطولۃ) کے جذبات پیدا ہوں اور فضا پر اس کا عکس پڑے، کسی ادیب وشاعر کے تعارف واعتراف میں جلسہ ہوتا ہے تو فضا پر ادبیت وبلاغت کا سایہ محسوس ہوتا ہے، یہی حال کسی مُصلح اور داعی انقلاب کا ہے کہ ہر ایک کے تعارف

کے لئے الگ زبان علیحدہ اثر اور سامعین پر اس کے موضوع اور میدان عمل کی جھلکیاں سامنے آتی ہیں۔

لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ دیر سے امام بخاری کا تعارف اور تذکرہ ہو رہا ہے، لیکن نہ ان کا موضوع اور ان کا امتیاز جلسہ پر سایہ فگن ہے اور نہ کوئی ایسا مضمون اور حقیقت سامنے لائی گئی جس سے زندگی کی راہ متعین کرنے میں اور اس کو نبوّت اور رسالت اور احادیث نبویہ کی روشنی میں گزارنے کا جذبہ پیدا ہو، اس لئے میں صحیح بخاری کی پہلی حدیث پڑھتا ہوں جس سے بہتر مقدمہ اور تمہید کسی دینی کتاب کی نہیں ہو سکتی اور جس کے ذریعہ امام بخاریؒ نے سب کچھ کہدیا ہے کہ وہ کتاب کس مقصد اور نیت سے لکھ رہے ہیں اور طالب علم حدیث کو اپنی زندگی کا کیا رُخ متعین کرنا چاہئے اور اس کی کیا نیت اور مقصد ہونا چاہئے؟ وہ جامع صحیح کی پہلی حدیث ہے :۔

"إنّما الأعمال بالنّيات وإنّما لكلّ امرئٍ ما نوى" (اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، اور ہر شخص کے حصّہ میں وہی نتیجہ آئے گا جس کی نیت کی تھی) ہمیں اپنی زندگی میں اسی کو رہنما اصول اور دستور العمل بنانا چاہئے کہ ہم جو کام کریں رضائے الٰہی کے لئے کریں اور ہماری نیت اجر و ثواب کی ہو۔

اور آخر میں وہ حدیث پڑھوں گا جس پر امام نے اپنی کتاب ختم کی، وہ حدیث ہے:

كلمتان حبيبتان إلى الرحمٰن، خفيفتان على اللسان، ثقيلتان في الميزان، سبحان الله وبحمده سبحان الله العظيم۔

۲۴ر اکتوبر کو صبح ۹½ بجے سے دوپہر ۱۲ بجے تک مقالات کی چار نشستیں ہوئیں، جن میں سے ایک نشست کی صدارت عزیزی محمد رابع ندوی نے بھی کی جس نشست میں

میں نے اپنا مقالہ پڑھا اس کی صدارت فاضل جلیل واستاد حدیث شیخ عبد الفتاح ابوغدہؒ کر رہے تھے، میرے مقالہ کا عنوان "الإمام محمد بن اسماعیل البخاری وکتابہ صحیح البخاری، مکانہما فی تاریخ الاسلام والدین والعلم والمکتبۃ الاسلامیۃ العالمیۃ" تھا[1] جس میں میں نے حدیث کی جمع وتدوین کی ضرورت، دین کو تحریف سے اور اُمّت کو انحراف سے بچانے میں اس کے کارنامے اور صحیح اسلامی ودینی ماحول قائم کرنے اور اس کی حفاظت کرنے میں حدیث کے کردار کا ذکر کیا تھا، اور بتایا تھا کہ تاریخ کی شہادت ہے کہ جس دور اور جس ملک میں حدیث سے اشتغال بند ہوگیا اور اس کے ساتھ اعتنا باقی نہ رہا وہاں بدعات کا اور خلاف سنّت اور خلاف شریعت امور کا ظہور ہوا، جن کو حدیث کے بغیر روکا یا مٹایا نہیں جا سکتا تھا، اس لئے کہ وہی معروف ومُنکَر اور سنت وبدعت میں امتیاز پیدا کرتی ہے اور یہی راز ہے کہ مغربی تہذیب کو اختیار کرنے والوں اور فروغ دینے والوں نے حدیث وسنت ہی کو اپنی مخالفت ومحاذ آرائی کا نشانہ بنایا کہ وہی ان کے راستہ میں اور ان کے مقصد کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ پیدا کرتی ہے، اس کے ساتھ امام بخاریؒ کے امتیاز اور کارنامے اور جامع صحیح کی خصوصیات اور مرتبۂ عالی کے بارہ میں بھی کچھ روشنی ورہنمائی دی گئی۔

آخر میں اس خطرہ اور اندیشہ کے پیش نظر کہ کہیں کسی مرحلہ پر امام بخاری کی ضریح (قبر) پر وہ تعمیرات شروع نہ ہوجائیں جو ہندوستان میں صالحین کی قبور پر قائم کی گئیں اور

---

[1] یہ مضمون "الامام محمد بن اسماعیل البخاری وکتابہ صحیح البخاری الحدیث واللہ ودورہما فی الصیانۃ عن التحریف والانحراف" کے نام سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مطبع سے "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" کی طرف سے شائع ہوگیا ہے۔

وہ رسوم و اعمال شروع ہو جائیں، جو صریحاً خلاف سنّت اور توحید، اسلامی تعلیمات اور اسوۂ صحابہؓ کے مخالف ہیں، اس لئے آخری حصّہ میں ان دو[2] حدیثوں کو بلفظہ نقل کیا گیا: لعن اللہ الیھود والنصاری اتخذوا قبور انبیائھم مساجد[1] (اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا) نیز فرمان نبویؐ: لا تجعلوا قبری عیداً[2] (میری قبر کو میلہ کی جگہ نہ بنا لو)

الحمد للہ مقالہ توجہ سے سنا گیا اور تعمیرات کے منصوبوں اور نقشوں کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ ایسی کوئی چیز پیش نظر نہیں ہے جس سے کوئی "درگاہ" یا عرس اور جشن کی جگہ بن جائے زیادہ تر مسجد کی توسیع اور ایک علمی و تحقیقاتی مرکز کا قیام زیر تجویز ہے، اور اس کے نقشے سامنے آئے۔

تاریخی زیارتیں

۲۴ اکتوبر کو ظہر کے وقت سمرقند کے باہر تاریخی آثار اور ائمۂ دین کے قبور پر فاتحہ پڑھنے کے لئے نکلنا ہوا، اس سلسلہ میں خرتنگ جانا ہوا جو سمرقند سے ۱۵ کلو میٹر پر واقع ہے وہاں امام بخاریؒ کی ضریح مبارک پر فاتحہ پڑھی، اس سے ملحق چند گز کے فاصلہ پر ایک چھوٹی مسجد ہے، استاد حدیث اور عالم محقق شیخ عبد الفتاح ابو غدّہ بھی اسی وقت پہنچ گئے، اور کسی طرح لوگوں کو ہم لوگوں کی آمد کا علم ہو گیا، مسجد بھر گئی،

---

[1] الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز۔

[2] کتاب المناسك، باب زیارة القبور، سنن أبی داؤد۔

ظہر کی نماز وہیں ادا کی، حاضرین سے خطاب کرتے اور دعا کرتے اور کراتے کا شرف بھی حاصل ہوا، دو مرتبہ اس کی نوبت آئی، شیخ عبدالفتاح نے بھی خطاب فرمایا اور دعا کی اس موقع پر عزیزہ فاضل مولوی سید سلمان حسینی ندوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء، مولوی ناصر علی استاد حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء اور متعدد احباب ورفقاء بھی موجود تھے، ہندوستان میں اس کا خیال نہیں تھا کہ امام بخاریؒ کی قبر سمرقند کے مضافات میں واقع ہے ہم اس کو بخارا ہی میں سمجھتے تھے، معلوم ہوا کہ حکومتِ وقت اور علماء کے ایک فریق کی مخالفت کی وجہ سے (بہت سے صالحین اور محققین کی سنّت کے مطابق) ترک وطن کرنا پڑا اور سمرقند کو ان کا مرقد بننے کا شرف حاصل ہوا۔

وہیں ایک بڑے ریسٹورینٹ میں کھانے کا نظم تھا، کھانا کھایا اور قیام گاہ واپسی ہوئی، بعد عصر سمرقند کے دوسرے تاریخی مقامات دیکھنے کے لئے نکلنا ہوا الغ بیگ کے مدرسہ کی شاندار عمارت دیکھی، حضرت قثم بن عبّاس کے مزار کی دور سے زیارت کی جو جہاد کے سلسلہ میں سمرقند آئے تھے، اور یہیں ان کا وقت آخر آیا، اس کے بعد خواجہ عبیداللہ احرار کا مدرسہ اور مسجد دیکھی اور ان کی قبر کی بھی زیارت کی جو سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک جلیل القدر شیخ اور اس سلسلۃ الذہب کی ایک اہم کڑی ہیں، وہاں مولانا جامی کا یہ شعر یاد آیا ؎

چوں فقر اندر قبائے شاہی آمد
زندبیر عبید اللّٰہی آمد

کانفرنس کا ضابطہ سے اختتام عمل میں آیا، ۲۵ر اکتوبر کا دن خالی تھا،

خیال ہوا کہ اس دور دراز ملک میں آنے کے بعد جس کا شرف ہی سمرقند و بخارا سے وابستہ ہے (خاص طور پر بخارا سے) بخارا کے دید و زیارت سے محروم رہنا ایک بڑا خسارہ اور ناقدری ہے، چنانچہ بخارا جانے کا پروگرام بنایا گیا معلوم ہوا کہ وہ یہاں سے تین سو کلو میٹر پر واقع ہے، محبی محمد عثمان صاحب کی توجہ اور تعاون سے ایک ایسی بڑی کار (MINI BUS) کا انتظام ہو گیا جس میں متعدد سیٹیں اور وسیع جگہ تھی، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ بھی رفیق سفر تھے، وہ ازراہِ عنایت اپنی سیٹ چھوڑ کر ہمارے قریب کی سیٹ پر بیٹھ جاتے اور اپنی محبت و رفاقت سے مشرف اور علمی گفتگو سے مستفید فرماتے، ہماری زبان سے بعض مواقع پر کچھ حسب حال عربی اشعار نکلتے تو وہ اپنے صاحبزادہ سلمان سے کہتے کہ ان کو قلم بند کرلو۔

ظہر کے وقت ہم بخارا کے حدود میں داخل ہوئے بخارا سے تقریباً ۲۰ کلو میٹر پیشتر بانی سلسلۂ نقشبندیہ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ کا مدرسہ مسجد اور مزار ہے[1]، موٹر ڈرائیور پہلے وہیں جا کر رکا ہم لوگوں نے اتر کر ظہر کی نماز پڑھی اور قبر مبارک پر فاتحہ پڑھی، قبر ایک چھوٹے سے حجرہ کے اندر ہے جو چاروں طرف سے بند ہے، دروازہ تو دروازہ کوئی روزن اور کھڑکی بھی نہیں جس سے جھانکا یا دیکھا جا سکے۔

راقم کا خاندان تقریباً تین سو برس سے زائد کی مدت سے اسی سلسلہ سے منسلک ہے، جد امجد حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی نقشبندی (م ۱۰۹۶ھ) حضرت سید آدم بنوری کے جلیل القدر خلیفہ تھے، جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلیفۂ اعظم ہیں، شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کا خاندان بھی اسی سلسلہ کا حامل

---

[1] خواجہ بہاء الدین نقشبند کا سنہ ولادت ۷۱۳ھ ہے، اور سنہ وفات ۷۹۱ھ ہے۔

و داعی تھا، پھر امامِ طریقت و اصلاح و جہاد حضرت سید احمد شہیدؒ اسی سلسلہ کے شیخ و مُرشدِ کامل ہیں، اور خود راقم کو بھی اس سلسلہ سے وابستہ ہونے کا شرف حاصل ہے[1]، وہاں حاضر ہو کر یہ نسبتیں اور یادیں تازہ ہو گئیں، مسجد کے ایک کونہ پر بیٹھ کر جو مزار مبارک سے متصل تھا فاتحہ پڑھی اور ایصال ثواب کیا، مولانا جامی کے یہ اشعار ذہن میں تازہ اور زبان پر جاری ہو گئے ؎

نقشبندیہ عجب قافلہ سالار آنند　　　　می برند از رہِ پنہاں بحرم قافلہ را

ہمہ شیرانِ جہاں بستۂ ایں سلسلہ اند　　　　روبہ از حیلہ چساں بگسلد ایں سلسلہ را

وہاں خاص سکینت محسوس کی اور بدعات اور خلاف شریعت رسوم و مظاہر کا کوئی نشان نہیں دیکھا، اور یہ اس سلسلہ کی قدیمی خصوصیت ہے۔

حضرت خواجہ نقشبند کے مدرسہ اور مسجد سے نکل کر شہر کا رُخ کیا اور ایک بڑے احاطہ میں داخل ہوئے، جس کو "میر عرب کا مدرسہ" بتایا گیا، کہا جاتا ہے کہ امام بخاریؒ یہیں درس حدیث دیا کرتے تھے، میر عرب یمن کے ایک صوفی بزرگ شیبانی النسل تھے، وہاں کچھ ناشتہ اور آرام کر کے سمرقند کا رُخ کیا، جہاں بعد مغرب پہنچنا ہوا، رات سمرقند کے ہوٹل میں (جہاں قیام تھا) گزاری ۲۶ ر اکتوبر کی صبح تاشقند جانے کے لئے ہوائی اڈہ کا رخ کیا، تاشقند میں اسی ہوٹل میں قیام رہا، ۲۷ ر اکتوبر کو ۱۱ بجے دن کو دہلی واپسی کے لئے فلائٹ تھی، یہاں ہوائی اڈہ پر کارروائی میں ویسے ہی طوالت ہوئی جیسی آتے کے وقت ہوئی تھی، راقم کو (جو نقرس کا مریض ہے) بہت زیادہ چلنا پڑا،

---

[1] اس کے ساتھ سلاسلِ عالیہ ثلاثہ، قادریہ، چشتیہ اور سہروردیہ سے بھی انتساب اور استفادہ کا شرف حاصل ہے اور ان کا بھی پورا پورا اعتراف و احترام ہے۔

اتفاقاً صدر جمہوریہ بھی اسی وقت فرانس کے لئے عازم سفر تھے، اس لئے کچھ پابندیاں بھی تھیں، اور ان کی روانگی کے انتظار میں ہمارا جہاز بھی لیٹ ہوگیا، ۲½ گھنٹے بعد دہلی پہنچنا ہوا جہاں اترتے ہی ظہر وعصر کی نماز پڑھ کر لکھنؤ جانے والی فلائٹ میں سوار ہوگئے، جس کی بکنگ اور انتظام عزیزی نیاز احمد رائے بریلوی نے پہلے ہی سے کر رکھا تھا اور اللہ کے فضل وکرم سے عین مغرب کے وقت لکھنؤ کے ایرپورٹ پر پہنچنا ہوا اور یہ تاریخی، علمی اور روحانی سفر بخیر و خوبی انجام کو پہنچا، وإلی اللہ ترجع الأمور۔

''ازبکستان'' پر ایک نظر

''تاشقند، سمرقند اور بخارا کا یہ علاقہ جو ''ازبکستان'' کہلاتا ہے، ستر برس گزرنے کے بعد ماسکو کی کمیونسٹ حکومت کی فرماں روائی اور غلامی سے آزاد ہوا ہے، جو محض ایک نظامِ حکومت اور انتظامِ سلطنت کی حامل اور ذمہ دار نہ تھی، ایک پورے نظریۂ زندگی فلسفۂ حیات اور آئیڈیالوجی (COMMUNISM) کی نہ صرف قائل اور داعی بلکہ اس کو بالجبر مسلّط کرنے والی تھی، جس میں ذاتی ملکیت، فرد کی آزادی، مذہبی امتیاز و تشخص اور اس پر آزادانہ عمل کرنے، اس کے مطابق تعلیم دینے اور نئی نسل کو اس کے مطابق تیار کرنے اور بیرونی دنیا اور ہم مذہب واقوام سے روابط پیدا کرنے کی اجازت نہ تھی، یہاں کے مسلمانوں نے جو سات ریاستوں[1] میں بٹے ہوئے تھے، اور جنھوں نے دین وشریعت سے نہ صرف وابستگی کا صدیوں کا ریکارڈ قائم رکھا تھا، بلکہ ان افراد کو پیدا کیا تھا، جن میں سے ایک بڑی تعداد عالمِ اسلام کی طویل تاریخ اور وسیع رقبہ میں ایسا امتیاز اور

---

[1] ان کے نام سفر کے تذکرہ کے آغاز میں گزر چکے ہیں۔

تشخص رکھتے تھے جس کی کوئی نظیر نہیں، اور جن میں سے ایک معتدبہ تعداد کے ناموروں کے نام اوپر کے مضمون میں آچکے ہیں، یہ کابوس اگرچہ بڑی حد تک اُٹھ چکا ہے اور کمیونزم کو زوال کا سامنا کرنا پڑا ہے پھر بھی (قدرتی اور فطری طور پر) اس کے اثرات (خاص طور پر حکمران اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے) فکر و ذہن سے زائل نہیں ہوئے، ان شہروں میں مسجدیں بھی ہیں اور کچھ عربی و دینی مدرسے بھی (جن میں طلبہ کی ایک محدود تعداد تعلیم پاتی ہے) پھر بھی یہ محسوس ہوا کہ ابھی اس خطّہ کو اپنے ماضی کی طرف واپس جانے کے لئے وقت، جرأت، ذہنی تبدیلی، نئے نظامِ تعلیم اور فکری انقلاب اور عوام و خواص دونوں کی سطح کے مطابق دعوتی و تبلیغی کوششوں کی ضرورت ہے، اور اگر توفیقِ الٰہی شاملِ حال رہی اور یہ مساعی و تحریکات وجود میں آگئیں تو اس مردم خیز اور محسنِ انسانیت خطّہ کا اگر پہلی سی علمی و فکری قیادت نہیں تو اسلامی زندگی کی طرف واپس آنا کچھ بعید نہیں۔ یُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ۔[1]

لاتور کا زلزلہ

۲۹ر اور ۳۰ر ستمبر کی درمیانی رات میں ۳ بجکر ۵ منٹ پر موضع کلاری ضلع لاتور میں زبردست زلزلہ آیا جس سے وہ مکمل طریقہ پر تباہ ہوگیا، اس کی شہرت عام طور پر ہندوستان میں ہوئی اور بہت سے اہلِ بصیرت نے جو غیر معمولی حوادث و مصائب کا رشتہ (جو کائناتی اور آفاقی طور پر پیش آتے ہیں) قرآن مجید بلکہ صحف سماوی

---

[1] ازبکستان کے اس سفر اور اس کے مشاہدات و تاثرات کی تفصیل کے لئے مولوی محمد رابع ندوی کا رسالہ "سمرقند و بخارا کی بازیافت" کا مطالعہ کیا جائے جو "تعمیر حیات" میں بالاقساط بھی شائع ہو چکا ہے، اور مفید اور پُر از معلومات ہے۔

اور مذاہب آسمانی کی روشنی میں ان مظالم اور جرائم سے جوڑتے ہیں، جو ان مقامات کے باشندوں اور انسانوں سے اپنے ہم جنس انسانوں اور خدا کی مخلوق کے بارہ میں پیش آتے ہیں، اور خاص طور پر یہ معلوم کرکے کہ اس علاقہ کے غیر مسلم باشندوں کی ایک کثیر تعداد بُعد مسافت کے باوجود بابری مسجد کے انہدام میں حصّہ لینے کے لئے لاتور سے اجودھیا گئی تھی، اور اس نے اس کارروائی میں حصّہ لیا، اور اپنی پوری دلچسپی اور توجہ سے (بلکہ ایک مذہبی فریضہ سمجھتے ہوئے) اس خدمت کو انجام دیا، یہ بھی سننے میں آیا کہ اس زلزلہ سے ہلاک اور متأثر ہونے والوں میں اور ان کے مکانات اور جائدادوں میں آبادی کے دو مختلف عنصروں (ہندو مسلمانوں میں) کھلا فرق دیکھا گیا، یہ بات ایک وسیع رقبہ اور کثیر زبانوں اور تحریروں میں (جن میں قدرتاً مسلمانوں کی اکثریت تھی) آرہی تھی۔

راقم نے جو تاریخ کا ایک طالب علم ہے، اور انسانی نفسیات اور دینی تاثرات وجذبات کا مطالعہ کرنے والا اور اس کا تجربہ رکھنے والا انسان ہے، جلد ان واقعات اور ان سے نکالے جانے والے نتائج پر یقین نہیں کیا، اس کی خواہش ہوئی کہ وہ اس علاقہ کے یا اس کے قریب کے رہنے والے متعدد صاحب ضمیر، خداترس اور محتاط انسانوں سے اس کی تصدیق کرلے۔

تقدیر الٰہی سے اس کو ۱۱؍ نومبر ۱۹۹۳ء کو کچھ آرام اور کچھ تحریری کاموں کی تکمیل کے لئے اپنے مخلص وکرم فرما دوست جناب غلام محمد صاحب (عرف محمد بھائی) مالک بمبئی آندھرا پردیش ٹرانسپورٹ کے دولت خانہ پر قیام کے لئے (جہاں وہ اکثر اپنے علاقہ کی سخت سردی سے بچنے کے لئے یا بعض تصنیفی وتحریری کاموں کی تکمیل کے لئے سالہا سال سے جایا کرتا ہے) بمبئی کا سفر کیا اور وہاں دو ہفتے قیام رہا، اس عرصہ میں

اورنگ آباد، پونہ اور قرب وجوار کے علاقہ سے متعدد صاحبِ علم ودین اور قابلِ اعتماد احباب ملاقات کے لئے آئے، راقم نے ان سے مختلف اوقات میں اس حادثہ، اس کے رقبہ اور اس کے مختلف المذاہب نشانہ بننے والوں کے بارہ میں صحیح معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی کہ یہ بھی معاصر تاریخ کا ایک حق ہے، اور عبرت وبصیرت اور خوف وخشیّتِ الٰہی کا ایک ذریعہ اور انتباہ وتنبیہ کا ایک آلہ اور وسیلہ ہے، اس سلسلہ میں راقم کے دو قابلِ اعتماد دوستوں کی تحریری رپورٹ حاصل ہوئی جن کے متعلق (جہاں تک ان کے پیش کرنے والوں کی ثقاہت اور سنجیدگی کا اندازہ ہے) غلط بیانی، مبالغہ آمیزی اور مذہب کے اختلاف کی بنیاد پر متعصّبانہ جذبہ کا امکان نہیں معلوم ہوتا۔

ان رپورٹوں سے ایک تو یہ بات واضح اور ثابت ہوئی کہ زلزلہ بہت شدید تھا، کلاری (واقع ضلع لاتور) میں کوئی گھر بلکہ کسی گھر کی کوئی دیوار بھی صحیح سالم باقی نہیں ہے، لیکن اس کے قرب وجوار میں مسجد کی تنہا عمارت جوں کی توں محفوظ ہے، طاقوں پر رکھے ہوئے قرآن پاک اپنی جگہ محفوظ ہیں، قریب میں ایک مندر کی مرکزی ۳۰ فٹ بلند مخروطی عمارت بالکل زمین بوس ہوگئی، اسی روڈ پر بینک کی آر سی سی کی عمارت پوری طرح تباہ ہوگئی، راوی کا بیان ہے یہی بستی نہیں بلکہ ۵۲ بستیاں مکمل طور پر تباہ ہوگئیں، قریب کی بستی کلاری بالکل تباہ ہوگئی، ایسی ہی تحریری روایت کے مطابق ۵۲ بستیاں مکمل طور پر تباہ ہوگئیں، راوی کے بیان کے مطابق محتاط اندازہ میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۷۰۰۰ سے زیادہ ہے، ان بستیوں میں زلزلہ سے جملہ شہید ہونے والے مسلمانوں کی تعداد ۱۰۸ ہے۔

راوی اور مشاہد علینی نے اپنے بیان میں اس کا بھی اضافہ کیا ہے کہ ریاست حیدرآباد میں پولیس ایکشن ہوا تو اس علاقہ میں بڑی تباہی مچائی گئی اور اقلیت کے افراد کو بے دریغ قتل کیا گیا اور ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا گیا، اس علاقہ کی بہت سی مسجدیں جوں کی توں باقی ہیں، حالانکہ مسجدیں گارے مٹی کی ہیں اور ان کی چھت ٹین کی۔

ایک رپورٹ سے یہ معلوم ہوا کہ یہ پورا علاقہ بی۔ جے۔ پی اور شیو سینا کا گڑھ سمجھا جاتا تھا، بابری مسجد کو شہید کرنے کے لئے (بقول راوی) یہاں سے تقریباً ساٹھ لاریاں بھر کر کارسیوک گئے تھے، اور رام مندر کے لئے سونے کی ایک اینٹ بھی یہاں سے بھجوائی گئی تھی، ان کارسیوکوں کا جانے سے پہلے اور آنے کے بعد زبردست استقبال کیا گیا، زلزلہ میں تقریباً سو سے زیادہ گاؤں متأثر ہوئے بعض جارحانہ فرقہ پرست لیڈر اس علاقہ کا دورہ کرنے آئے تو یہاں کے بچے کھچے لوگوں نے انھیں فحش گالیوں سے نوازا، اور بعض نے گریبان تک پکڑ لیا، کلاری گاؤں کی واحد مسجد معجزانی طور پر محفوظ رہی، زلزلہ کے پہلے روز شیوسینا اور پولیس والوں نے لاشوں پر سے زیورات لوٹنے میں بڑی سرگرمی دکھلائی اور دونوں میں ٹکراؤ بھی ہوا، ریلیف کا سامان بانٹنے میں بھی فرقہ واریت کا مظاہرہ کیا گیا، کلاری کی مسجد کے اطراف میں مسلمانوں کے مکانات ہیں، یہ مکانات آج بھی جوں کے توں محفوظ ہیں۔

کُل ہند دینی تعلیمی کنونشن منعقدہ لکھنؤ

دینی تعلیمی کونسل (جس کی صدارت کونسل کے ابتدائی قیام ۱۹۵۹ء سے

اس راقم کے ذمہ چلی آرہی ہے) کا کل ہند دینی تعلیمی کنونشن لکھنؤ میں ۲ ر ۳ ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو ہونا طے پایا تھا، لیکن ملک کے تشویشناک حالات نے (جن کا نقطۂ ارتقاء ۶ ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کے انہدام کا حادثہ تھا) اس کو عارضی طور پر ملتوی اور مؤخر کرنے پر مجبور کیا، حالات میں سدھار پیدا ہونے کے بجائے بگاڑ ہی پیدا ہوتا رہا، کونسل کے ذمہ داروں کی مصروفیتیں، بعض کے سفر اور بعض اہم ذمہ داروں کی علالت نے اس کو اتنا مؤخر کر دیا کہ وہ ۲ ر ۳ ر دسمبر ۱۹۹۲ء کے بجائے ۲ ر نومبر ۱۹۹۳ء کو منعقد کیا جا سکا، شہر میں اس کے انعقاد کے لئے ایک بڑے جلسہ گاہ "رویندرالیہ" کا انتخاب کیا گیا تھا، لیکن قریبی وقت میں شہر کی انتظامیہ نے اس کی اجازت نہیں دی اور مجبوراً اس کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کرنے کا فیصلہ کیا گیا، جس کے لئے ندوۃ العلماء کے کتب خانہ (مکتبۂ علامہ شبلی نعمانیؒ) کی وسیع وشاندار بلڈنگ کے نیچے کی منزل کا (جو ایک وسیع ہال کی حیثیت رکھتی ہے) انتخاب کیا گیا، یہ جلسہ صبح دس بجے سے اس ہال میں منعقد ہوا، وقت کی تنگی اور دعوت واطلاع کے لئے ناکافی مدّت ووسائل کے باوجود مندوبین اور حاضرین کی ایک بڑی تعداد مجتمع ہو گئی، جس میں نہ صرف اترپردیش بلکہ دوسرے اور بعض دور دراز کے صوبوں اور اہم مقامات کے ممتاز اصحاب اور ملّت کے مسائل اور اس کے مستقبل اور مسلمانوں کی نئی نسل کے اسلامی نشو ونما بلکہ بقائے ایمان اور اسلام سے وابستگی کے مسئلہ کی فکر رکھنے والے اصحاب بڑی تعداد میں جمع ہو گئے اور ہال کھچا کھچ بھر گیا۔

تلاوت قرآن مجید کے بعد نامور ماہر تعلیم اور ملّت کے دردمند مفکر جناب سید حامد صاحب (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے اپنا افتتاحی مقالہ پڑھا،

جو غور و توجہ سے سنا گیا، اور جس میں موصوف نے دینی مدارس میں بھی عصری مضامین کے (جو زمانہ حال کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور کسب معاش کے مسئلہ میں معاون ہو سکیں) اضافہ کا مشورہ دیا، جس پر بعد میں کچھ ناقدانہ و مخلصانہ تبصرہ بھی کیا گیا، اس کے بعد وہ موضوع سامنے لایا گیا جس کا عنوان تھا "ریاستی حکومت (یو پی) کی سرکاری نصابی کتابوں کا قومی یکجہتی کے نقطۂ نظر سے جائزہ" اور جس پر ایک مکمل طبع شدہ کتاب کونسل کے ایک ذمہ دار اور ممتاز کارکن حبیب اللہ اعظمی صاحب، ایم۔اے۔بی۔ٹی علیگ سابق پرنسپل کی مطبوعہ کتاب، ہال سے باہر اسٹال پر موجود تھی، جس کا خلاصہ اور اس کے اہم مواد کی نشاندہی نوجوان فاضل ڈاکٹر مسعود حسن عثمانی (فرزند مولانا محمود الحسن عثمانی مرحوم سابق سکریٹری دینی تعلیمی کونسل) پروفیسر ممتاز ڈگری کالج لکھنؤ نے کی، اس کتاب میں جدید مروجہ نصاب کے وہ نمونے اور اقتباسات پیش کئے گئے تھے، جن کو پڑھ کر ایک مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور صاف طریقہ پر محسوس ہو کہ اس نصاب کی موجودگی میں مسلمانوں کی آئندہ نسل کا مسلمان رہنا ہر طرح سے خلاف قیاس اور نفسیاتِ انسانی اور بدیہیات کے مخالف ہے، کتاب میں نصابی کتابوں کے طویل ہندی اقتباسات اور ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد حکومت کے وہ قابلِ نفرت بلکہ اشتعال انگیز نمونے اور واقعات پیش کئے گئے ہیں جن کے نتیجہ میں اس دور اور اس کے ذمہ داروں کی نہ صرف حقارت اور شکایت بلکہ ان سے نفرت و بیزاری پیدا ہونا بالکل قدرتی اور طبعی ہے،[1] کتاب پر راقم کے قلم سے ایک مختصر لیکن واضح اور طاقتور مقدمہ بھی ہے۔

---

[1] یہ کتاب دینی تعلیمی کونسل ۹۹ گوئن روڈ لکھنؤ سے مل سکتی ہے اور وہ قابلِ مطالعہ اور مستحق غور و فکر ہے۔

اس کتاب کے تعارف و تبصرہ اور اس کے کچھ نمونے پیش کرنے کے بعد راقم نے اپنا خطبۂ صدارت پیش کیا، اس کے آخری چند صفحات یہاں پیش کئے جاتے ہیں تاکہ ان معاصرین کو بھی جن کو اس صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ نہیں اور آئندہ کے مؤرخین کو بھی اس غیر فطری، نامنصفانہ، غیر عاقلانہ اور غیر جمہوری آزمائش اور استبدادی طرزِ عمل کا اندازہ ہوسکے :-

"جہاں تک مسلمان کا تعلق ہے اس کے لئے دینی تعلیم اور دین کی واقفیت کی وہی حیثیت ہے جو ایک انسان کے لئے ہوا پانی کی ہے، ایک مسلمان کو مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنے کے لئے، مسلمان کہلانے کے لئے اور پھر آخرت میں خدا اور اس کے رسولؐ کو منہ دکھانے اور نجات حاصل کرنے کے لئے بنیادی دینی عقائد کے جاننے کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسے کہ ایک انسان کو زندہ رہنے کے لئے ہوا پانی کی، اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں، یہی وہ نسبت ہے جس کا یعقوب علیہ السلام دنیا سے کوچ کرتے وقت (حالتِ احتضار میں) اطمینان حاصل کرنا چاہتے تھے، انھوں نے اپنے سب فرزندوں، پوتوں، نواسوں کو جمع کر کے (اور وہ ماشاءاللہ کثیر الاولاد تھے) دریافت فرمایا کہ: "مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ"[1] (میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے؟) یہ بات انھوں نے کس سے کہی تھی؟ ان سے کہی تھی جو نبی زادے تھے، نبی کے پوتے تھے، نبی کے پرپوتے تھے، گویا انھوں نے زبانِ حال سے کہا کہ میری پیٹھ قبر کی زمین سے نہ لگے گی جب تک دنیا سے یہ اطمینان لے کر نہ جاؤں کہ تم

[1] سورۃ البقرۃ - ۱۳۳

خدائے واحد ہی کی پرستش کرتے رہو گے۔

آج اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ اس نسل کو کیسے بچایا جائے، سرکاری تعلیم کی اصلاح کی کوشش کے ساتھ دینی تعلیم کا کوئی متوازی نظام بھی چلانا چاہیئے، اسی بنیاد پر دینی تعلیمی کونسل قائم ہوئی، اور اس کی دعوت وجدّوجہد سے ہزاروں مکاتب و مدارس قائم ہوئے، ملک کی موجودہ سیاسی تبدیلیوں اور انتخابی نتائج اور مذہبی عصبیت پیدا کرنے کے بعض مواقع کے بہم ہو جانے یا پیدا کر لینے کی وجہ سے اس دینی، ذہنی اور تہذیبی نسل کشی کا خطرہ کئی گنا بڑھ گیا ہے، اس وقت کا اہم ترین کام نظامِ تعلیم کی اصلاح کے مطالبہ اور اس کے لئے جدّوجہد کے ساتھ آزاد دینی مکاتب و مدارس کے قیام اور مساجد اور گھروں میں ضروری دینی تعلیم اور مبادیِ دین کی تلقین، اُردو پڑھنے لکھنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے مراکز اور مواقع پیدا کرنے کی جدّوجہد ہے اور اس کام کو مقبول ترین عبادت، رضائے الٰہی کا ذریعہ اور اس ملک میں حفاظتِ دین کا واحد طریقہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

آزاد مکاتب و مدارس، صباحی و شبینہ حلقہائے تعلیم اور گھر کی دینی تعلیمی تربیت، اسلامی اصول اور اخلاق کی پابندی، راست گوئی و راست روی اور سیرت و تعلیمات نبوی سے واقفیت کے عمومی و مؤثر انتظامات سے صرف ملّت ہی کو فائدہ نہیں پہنچے گا بلکہ یہ پورے ملک اور جمہوریۂ ہند کے مفاد میں بھی ہے، جو تیزی سے اخلاقی زوال، خود پرستی، دولت پرستی اور عمومی بدنظمی اور کرپشن کی طرف جا رہا ہے، اس اسلامی تعلیم و تربیت کے

اثر سے خاصی تعداد میں وہ طبقہ پیدا ہو گا، جو اس حد تک دولت کا پجاری نہیں ہو گا جس حد تک یہ وبا ملک میں پھیل گئی ہے، اس کو کسی نہ کسی درجہ میں خدا کا خوف اور خدا کے سامنے جوابدہ ہونے کا عقیدہ اس انتہا تک پہنچنے سے باز رکھے گا جس انتہا تک خالص مادّی تعلیم نے پہنچا دیا ہے، نبیّ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کو اپنے ملک، ماحول اور سماج کے لئے اُمّتِ رحمت اور اس کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کے لئے ایک فرض شناس، رحم دل اور ماہر ملّاح (کشتی بان) کا کردار (PART) ادا کرنا ہے جس کی موجودگی میں اس ملک کو تباہ ہونا اور اس کشتی کو ڈوبنا نہیں چاہیئے، اس لئے یہ کام تنہا مسلم فرقہ کے مفاد میں نہیں ملک کے مفاد میں ہے اور اس کو انجام پانا چاہیئے۔

حضرات! آپ اس تعلیمی مسائل کو اپنے ایمان و یقین، اپنے عزم و فیصلہ، جوشِ عمل و ولولۂ کار سے حل کرنے کی کوشش کریں، اگر آپ نے یہ شرطیں پوری کر دیں تو یہ مشکل آسان اور یہ عُقدہ حل شدہ ہے۔

اقبالؔ نے سچ کہا ہے ؎

نشاں یہی ہے زمانہ میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

کمالِ صدق و مروت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں

خودی سے مردِ خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں"

دوسرے دن ۳ر نومبر کو بھی جلسہ جاری رہا اور حاضرین کی تعداد اور دلچسپی و سنجیدگی اسی طرح قائم رہی اور اجلاس بخیر و خوبی اختتام کو پہنچا۔

انتخابات اور ان کے نتائج

کل ہند دینی تعلیمی کنونشن سے فارغ ہونے کے بعد اپنے کچھ تحریری و تصنیفی کاموں میں راقم مشغول رہا، ان کاموں کا سلسلہ لکھنؤ، رائے بریلی میں جاری رہتا کہ پنج سالہ انتخابات کا طوفان پورے ملک پر چھا گیا، ان انتخابات کے سلسلہ میں راقم کی (اپنے امکانی حدود وسائل تک) یہ کوشش رہی کہ سیاسی پارٹیوں میں سے وہ پارٹیاں جو ملک اور اس کے باشندوں کو متحد، پرامن، حقیقت پسند اور ہندوستان کی آبادی کے دو سب سے بڑے عنصر ہندو اور مسلمانوں کو ملک کی تعمیر و ترقی میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے والا، فرقہ وارانہ فسادات سے متنفر اور معاشرہ و انتظامیہ کو ان خرابیوں اور ان امراض سے دور دیکھنا چاہتی ہیں جنھوں نے زندگی کو دشوار، ملک کو بدنام اور فضا کو مسموم و مکدّر بنا رکھا ہے، جس کی موجودگی نے (جیسا کہ بارہا تقریروں میں کہا جا چکا تھا) انگریزوں کے دور غلامی کو یاد کرنے اور اس کو ترجیح دینے کا رجحان پیدا کر دیا تھا، باہم متحد ہو جائیں، ملک اس وقت گویا کوہ آتش فشاں کے دہانہ پر کھڑا ہے، پھر بدنظمی، رشوت خوری، دولت پرستی اور جانب داری اپنے شباب پر پہنچ گئی ہے۔

اس سلسلہ میں تین ہی پارٹیوں پر نظر پڑتی تھی، سماج وادی، بہوجن سماج اور جنتا پارٹی، راقم نے ان تینوں پارٹیوں کے رہنماؤں سے الگ الگ گفتگو کی اور

ان کو اس پر آمادہ کرنے کی مخلصانہ کوشش کی کہ وہ متحد ہو کر ایک محاذ بنائیں، اور ملک و معاشرہ کو اس ہمہ گیر زوال سے بچانے کی کوشش کریں جو تاریخ میں مختلف ممالک، سلطنتوں اور معاشروں (SOCIETIES) کو پیش آیا ہے، اور جس نے بڑی بڑی شہنشاہیوں (EMPIRES) اور تہذیبوں (CULTURES) کا چراغ گل کر دیا ہے۔[1]

پھر ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ (B. J. P.) کسی طرح مرکز اور ریاستوں میں برسر اقتدار نہ آنے پائے، جس کے مقاصد، منصوبوں اور اعلانات کا تفصیل سے ذکر کتاب کے پچھلے صفحات میں آ چکا ہے، اور جس کا مرکزی نقطہ مسلمانوں کی معنوی، فکری، لسانی اور تہذیبی نسل کشی (GENOCIDE) اور مختصر لفظوں میں (تاریخ داں حضرات کے لئے اتنا کہنا کافی ہے کہ) اس ملک کو اسپین بنا دینے کا ہمہ گیر منصوبہ تھا۔

لیکن وہ اپنی اس مخلصانہ، بے غرضانہ اور حقیقت پسندانہ کوشش میں کامیاب نہیں ہوا اور ان پارٹیوں نے اپنے الگ الگ جھنڈے کے نیچے اپنی انتخابی معرکہ آزائی کی مہم شروع کر دی، اس خیال سے کہ انتخابات کی اس آندھی اور طوفان میں غیر جانبدارانہ رویہ اور اپنے کاموں کی مشغولیت کے ساتھ بیٹھنا مشکل ہو جائے گا، اس کے نام اور رجحان سے فائدہ اٹھایا جائے گا اور اس سے تعلق رکھنے والے شہریوں کی حمایت یا ترجیح حاصل کر کے انتخابات میں فائدہ اٹھایا جائے گا، اس کو کسی ایسے مقام پر چلا جانا چاہیئے جہاں اس سے یہ کام نہ لیا جا سکے۔

یہاں پر اس حقیقت کا اظہار و اعتراف کرنا بھی ایک اخلاقی فریضہ ہے کہ

---

[1] مثال کے طور پر گبن کی مشہور کتاب "زوال و سقوط روما" اور پروفیسر آرتھر کرسٹن سین کی کتاب "ایران بعہد ساسانیان" ملاحظہ ہو۔

پچھلے تجربہ کی بنا پر اس کا میلان طبع شری ملائم سنگھ یادو جی اور ان کی پارٹی سماج وادی کی طرف زیادہ تھا، جنھوں نے اپنی چیف منسٹری کے زمانہ میں بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے قضیہ میں ایک جرأت مندانہ کردار ادا کیا تھا اور اپنی وزارتِ علیا اور قیادت کو داؤں پر چڑھا دیا تھا، اس سلسلہ میں راقم نے "کاروانِ زندگی" کے حصّہ چہارم میں اپنے جس تأثر کا اظہار کیا تھا، اس کو ان کے بعض حامیوں نے (جو اس راقم کا احترام کرنے والوں میں سمجھے جاتے تھے) تصویر کے ساتھ شائع کر کے لوگوں میں تقسیم کیا تھا، اور اس سے راقم سے تعلق اور مراسم رکھنے والوں نے راقم کے رجحان کا اثر لیا۔

اسی بنیاد پر غالباً ۹ر نومبر کو شری ملائم سنگھ جی یادو چکمنڈی کے چند اہلِ تعلق کے ساتھ راقم سے ملنے اور اپنے تأثر یا تشکر کا اظہار کرنے کے لئے ندوہ آئے اور اپنے جذبات اور تشکر اور ممنونیت کا اظہار کیا، اس وقت بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ الکشن کے نتیجہ سے پوری طرح مطمئن ہیں اور ان کو اپنے منتخب ہوجانے کا یقین ہے۔

یہ انتخابات ہندوستان کی چار ریاستوں، اُتّر پردیش، مدھیہ پردیش، ہماچل پردیش، اور راجستھان میں ہونے والے تھے، راقم نے یہ سمجھ کر کہ لکھنؤ اور اس کے اطراف اس کھونچال کا سب سے بڑا مرکز ہوں گے اور وہ ترجیح اور جانب داری سے محفوظ نہیں رہ سکے گا، فیصلہ کیا کہ اس الکشن کے زمانہ میں کسی دُور اُفتادہ مقام پر چلا جائے، جہاں وہ سکون کے ساتھ اپنے تحریری و مطالعاتی کاموں میں مشغول رہے، چنانچہ ۱۱ر نومبر ۱۹۹۳ء کو وہ بمبئی چلا گیا جہاں وہ اپنے مخلص دوست و میزبان محمد بھائی کے یہاں دو ہفتے مقیم رہا (جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے) جہاں وہ اس معرکہ آرائی سے محفوظ و مامون رہا، اس لئے کہ مہاراشٹر میں انتخابات ہونے نہیں تھے۔

۲۵ر نومبر کو وہ اپنے مستقر پر واپس آیا، ۲۷ر نومبر کو جب گنتی شروع ہوگئی تھی، شری ملائم سنگھ یادو جی دوبارہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ملاقات کے لئے آئے، وہ بہت مطمئن و مسرور نظر آرہے تھے، اور ثانوی اور ذیلی طریقہ پر ان کو ہمارے حلقۂ احباب سے جو مدد ملی تھی اس کے بہت ممنون تھے، لکھنؤ پہنچ کر یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ بہوجن سماج اور جنتا پارٹی نے بھی ان کے ساتھ اخلاقی تعاون کیا ہے اور کانگریس نے بھی B.J.P. کے مقابلہ میں وزارت کی تشکیل اور اختیارات کی سپردگی میں ان سے تعاون کا وعدہ کیا ہے۔

۲۹ر نومبر کو نتائج کا اعلان ہوا اور اس کے نتیجہ میں یادو جی نے ۴ر دسمبر ۱۹۹۳ء کو حلف لیا اور ۲۷ ممبر والی وزارت بنائی، یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ ان کو مغربی یوپی میں وہ کامیابی نہیں ہوئی جو مشرقی یوپی میں ہوئی تھی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں بھی کئی امیدوار جنتا پارٹی کی نسبت سے کھڑے ہوئے تھے (اور معذرت کے ساتھ کہا جاتا ہے) کہ ایک ایک حلقۂ انتخاب کے لئے کئی کئی مسلمان امیدوار کھڑے ہو گئے جن کی وجہ سے ووٹ بٹ گئے اور (B. J. P.) کے متعدد امیدوار کامیاب ہوئے۔

یہ ان سطور کے لکھنے کے وقت تک کی روداد ہے، آگے خدا کو علم ہے کہ کامیاب پارٹی بھی کہاں تک اپنے اصولوں پر قائم رہتی ہے، اور وہ صوبہ کی آبادی کے مختلف عناصر میں اعتماد اور خیرسگالی کا جذبہ پیدا کرنے میں کتنی مخلصانہ جدّوجہد کرتی ہے، اور بابری مسجد اور رام جنم بھومی کا قضیہ تو اس وقت مرکز کے ہاتھ میں ہے) آبادی کے ہر عنصر اور فریق کو اس کے جائز حقوق دلانے، اس کے مذہب، تہذیب، تعلیم اور زبان کے تحفّظ کا کہاں تک بندوبست کرتی ہے اور انتظامی خرابیوں کو دور کرنے پر

میں کہاں تک کامیاب ہوتی ہے،[۱] والغیب عند اللہ۔

دہلی کا سفر اور وزیر اعظم صاحب سے ملاقات

مسلم پرسنل لا بورڈ نے اپنے جے پور کے اجلاس میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ ۳ ر دسمبر کو (جو جمعہ کا دن ہوگا) سارے ملک میں یوم دعا منایا جائے، اور مسلمانوں کو بابری مسجد کی بازیافت کے لئے تعمیری طریقہ پر کوشش کرنے پر آمادہ کیا جائے اور ۶ ر دسمبر کو نرسمہاراؤ جی سے ارکان کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ ملاقات کی جائے اور ان کو ان کا وعدہ یاد دلایا جائے اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کی بے چینی اور ان کے اس مسئلہ پر متفق ہونے کا اظہار کیا جائے، راقم نے اس غرض کے لئے ۵ ر دسمبر کو رفیق محترم مولانا برہان الدین صاحب استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء و رکن مجلس عاملہ مسلم پرسنل لا بورڈ اور عزیزی عبدالرزاق کی معیت میں دہلی کا سفر کیا، معلوم ہوا تھا کہ انھوں نے ۶ ر دسمبر کو ۱۰ بجے دن کا وقت ملاقات کے لئے دیا ہے، لیکن دہلی اسٹیشن جا کر معلوم ہوا کہ انھوں نے اس وقت ملاقات سے معذرت کر دی ہے اور ۴ بجے شام کا وقت مقرر ہوا ہے، بہت سے ارکان کو اس میں بھی شبہ تھا کہ وہ اس کی پابندی کریں گے یا اس سے بھی معذرت کر دیں گے، لیکن ایسا پیش نہیں آیا، حسب قرارداد پرسنل لا بورڈ کے عہدیدار اور ارکان جن کی تعداد

---

[۱] ۲۲ ر دسمبر ۱۹۹۳ء کو اسمبلی میں شکریہ کی تحریک اعتماد کی تجویز منظور ہونے کے موقع پر تنری ملائم سنگھ یادو جی نے ایک جرأت مندانہ اصول پسندانہ اور طاقتور تقریر کی جس کا مضمون "قومی آواز" لکھنؤ کے ۲۳ ر دسمبر ۱۹۹۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے، خدا کرے وہ اسی انداز فکر و معیار کے مطابق انتظامیہ کو چلائیں اور باہمی منافرت اور فرقہ وارانہ اثرات کو زائل کرنے کی کوشش کریں۔

۵۰-۵۱ تک پہنچتی تھی، پہلے محترمی ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب کی رہائش گاہ پر جمع ہوئے[۴] اور وہاں سے انھوں نے وزیراعظم کی کوٹھی کا رُخ کیا، وہاں کچھ تاخیر کے ساتھ وہ اپنے تین[۳] چار[۴] رفقاء کے ساتھ (غالباً جن میں ایک وزیر داخلہ مسٹر چوہان بھی تھے) باہر آئے، بحیثیت صدر کے راقم نے گفتگو کا آغاز کیا اور کہا کہ نفسیاتی اور اخلاقی طور پر خوشی تو جب ہوتی کہ ہم آپ کا شکریہ ادا کرنے آتے کہ آپ نے مسئلہ کو حسب وعدہ حل کرنے کا عزم اور بندوبست کرلیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ بجائے شکریہ کے خوشگوار فریضہ کے ادا کرنے کے ہم شکایت کا کردار ادا کر رہے ہیں کہ ابھی تک اس سلسلہ میں کچھ نہیں ہوا، اس تمہیدی گفتگو کے بعد انگریزی کا وہ خط پڑھ کر سنایا گیا، جس میں صاف اور صریح لہجہ میں اس مسئلہ میں ان کے وعدہ کے عدم ایفاء کی شکایت اور مسلمانوں کے (باتفاق آراء) مطالبہ کا اظہار تھا، نرسمہاراؤجی نے اس کے جواب میں مختصر گفتگو کی جس سے کوئی واضح نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا تھا بلکہ وہ ایک طرح کی معذرت اور دفع الوقتی تھی، وفد کے متعدد ارکان نے زوردار لہجہ اور زبان میں اظہار خیال کیا اور مختصر تقریریں کیں، وفد مایوسی کے ساتھ واپس ہوا اور اس نے یہ تاثر لیا کہ وہ کچھ کرنے والے نہیں ہیں۔

نرسمہاراؤجی سے ملاقات کے علاوہ مجلس عاملہ کا ایک جلسہ رات کو ہوا دوسرا محترمی ابراہیم سلیمان صاحب کی رہائش گاہ پر اگلے دن شام کو ہوا، راقم پہلے جلسہ میں اپنی طبیعت کی ناسازی اور تکان کی وجہ سے شریک نہ ہوسکا، پریس کانفرنس میں بھی وہ شریک نہیں ہوا، ٹی وی (T. V.) پر اس ملاقات کو دکھایا گیا اور ریڈیو پر بھی یہ پروگرام آیا، اس کام سے فارغ ہو کر راقم ۸ر دسمبر ۱۹۹۳ء کو لکھنؤ اپنے مستقر پر آگیا۔

بابری مسجد کے انہدام اور اس کی ذمہ داری کے سلسلہ میں چند ممتاز ماہرین قانون کی ایک شہادت اور وضاحتی بیان

اس بات کو ختم کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بابری مسجد کے قضیہ اور حادثہ پر اور یہ کہ اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے چند ممتاز ماہرین قانون کا ایک بیان جو ۱۴؍ دسمبر ۱۹۹۳ء کے انگریزی اور اردو اخبارات میں شائع ہوا ہے نقل کر دیا جائے کہ اخبارات کے صفحات و مندرجات کے بارہ میں حفظ و بقا کا' اور اس کا بھروسا نہیں کیا جا سکتا کہ تاریخ میں اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے گا اور ان کو کسی متنازعہ مسئلہ میں کسی تائیدی یا تردیدی شہادت کے طور پر پیش کیا جا سکے گا۔

"نئی دہلی ۱۳؍ دسمبر۔ تین سرکردہ ماہرین قانون کی زیر قیادت ایک شہری ٹریبونل نے اپنے فیصلہ میں اجودھیا میں بابری مسجد کی مسماری کے لئے مرکزی حکومت اور سنگھ پریوار کے اعلیٰ لیڈروں کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

۸۲ صفحات پر مشتمل اپنے فیصلہ میں جسے آج یہاں جاری کیا گیا جسٹس او چینیا ریڈی، جسٹس ڈی ایس تیواتیا نے کہا کہ سنگھ پریوار کے لیڈروں کو "ایک منظم سازش میں ملوث ہونے کا قصوروار" پایا گیا ہے، فیصلہ میں کہا گیا ہے کہ مرکزی حکومت نے مجرمانہ غفلت برتی اور آئینی حکومت کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری پوری کرنے سے بدنیتی کے ساتھ انکار کیا۔

ججوں نے ٹربیونل کی جانب سے گزشتہ سال تیار کی گئی رپورٹ کی بنیاد پر فیصلہ دیا ہے اس میں بہار کے سابق سکریٹری کملا پرساد کی زیر قیادت ایک تحقیقاتی کمیشن کی تشکیل بھی شامل ہے جس نے گزشتہ سال دسمبر کے اجودھیا کے واقعات سے پہلے اس کے دوران اور بعد میں موقع پر تحقیقات اور عوامی سماعت کے بعد اپنی رپورٹ پیش کی۔

ججوں نے اپنے فیصلہ میں کہا ہے کہ "۶ر دسمبر سے تین چار روز قبل اجودھیا میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کے بارہ میں جانکاری کے باوجود اتر پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ اور فیض آباد کے ضلعی افسران نے کوئی کارروائی نہیں کی۔"

ٹربیونل نے مسجد کی مسماری کے لئے لال کرشن اڈوانی، مرلی منوہر جوشی اشوک سنگھل، وجے راجے سندھیا، ونے کٹیار، اوما بھارتی، سادھوی رتھمبرا، مسٹر ایچ وی سیشادری، مسٹر پرمود مہاجن، مسٹر بی ایل شرما، مسٹر مورلیشور ساوے، آچاریہ دھریندر، مسٹر کے ایس سدرشن اور مسٹر چمپت رائے کو قصوروار ٹھہرایا ہے۔

فیصلہ میں کہا گیا ہے کہ مذکورہ بالا لیڈران ۵ر دسمبر کی رات مسٹر ونے کٹیار کی رہائش گاہ پر اور ۵، ۶ر دسمبر کو رام کتھا کنج میں موجود تھے۔

ججوں نے کہا کہ مرکز نے دانستہ طور پر اور ممکنہ نتائج کے بارہ میں جاننے کے باوجود بے عملی دکھائی۔

ان کے مطابق حکومت نے خود کو بری الذمہ ثابت کرنے کے لئے قرطاس ابیض میں جو یہ کہا ہے کہ "مسجد کا انہدام اچانک ہوا اور منصوبہ بند نہیں تھا" غلط ہے، ساتھ ساتھ اس وہائٹ پیپر میں اس بات کا بھی ذکر نہیں ہے کہ حکومت نے ممکنہ صورتِ حال کے پیش نظر کیا اقدامات کئے تھے۔

فیصلہ میں کہا گیا ہے کہ ۶ر دسمبر سے پہلے منظم پرچار اور رائے عامہ ہموار کرنا، منظم طریقے سے انہدام کی کارروائی کا عمل، ڈھانچے کو گرانے کے لئے رسّی اور دوسرے ضروری ساز و سامان کی موقع پر موجودگی، جس رفتار سے اسے گرایا گیا اور ملبہ کی صفائی کے بعد وہاں پر مندر کی تعمیر یہ سب ہی اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتی ہیں کہ یہ ایک گہری اور منظم سازش کا نتیجہ تھا۔

مرکزی حکومت کے بارہ میں ججوں نے کہا کہ وہ "فیصلہ نہ لینے اور تاخیر کرنے کا قصوروار ہے" آئین کی دفعات ۳۵۶،۳۵۵ اور ۳۵۷ اور ساتویں شیڈول کی دفعہ ۲، اے کے تحت مرکز کو ریاستوں میں شورش کو روکنے کے لئے حفاظتی دستوں کی تعیناتی کا حق حاصل ہے۔ انھوں نے کہا کہ مرکز یہ اختیارات استعمال کر سکتا تھا اور اسے کرنا چاہئے تھا۔

فیصلہ میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ مذہب کو حکومت، مملکت اور سیاست سے الگ کیا جائے اور سفارش کی ہے کہ فرقہ پرست تنظیموں پر پابندی عائد کی جائے۔

اس میں یہ بھی مطالبہ کیا گیا ہے کہ ایسی سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کر دی جائے جو اپنے ناموں کے ساتھ فرقوں کے ناموں کا استعمال کر رہی ہیں۔

انتخابات میں حصّہ لینے والے امیدواروں کے بارہ میں فیصلہ میں سفارش کی گئی ہے کہ وہ تمام عوامی معاملات میں مذہبی معاملات سے احتراز کریں۔"[1]

ایک اہم اور غم ناک حادثہ

رفیق قدیم اور مُحبِّ مخلص و محترم مولانا محبّ اللہ صاحب لاری ندوی ایم۔اے (علیگ) مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء عرصہ سے علیل چلے آرہے تھے، لیکن اپنی علالت اور ضعف کے باوجود دارالعلوم کے اہتمام کا فرض منصبی مستعدی اور احساسِ ذمّہ داری کے ساتھ ادا کر رہے تھے، شام کی مجلس میں جب مہمان خانہ کے سامنے کرسیوں پر اس راقم کی اساتذۂ دارالعلوم کی ایک معتد بہ تعداد اور بعض عزیز و بعض معزز مہمانوں کے ساتھ نشست ہوتی تھی تو وہ اپنے مکان سے (جو دارالعلوم کے احاطہ ہی میں واقع ہے) خراماں خراماں خود یا کسی رفیق کے سہارے تشریف لاتے تھے، اور یہ راقم بھی وقتاً فوقتاً ان کی قیام گاہ پر جا کر ان کی عیادت اور پرسشِ احوال کا فرض انجام دیتا تھا، ان کو معدہ اور شدید ضعف کی شکایت تھی، اور ایک سے زائد بار اسپتال میں بھی داخل ہوئے تھے، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا اور ضعف بڑھتا گیا، ہاتھ میں شدید رعشہ تھا اور غذا برائے نام۔

---

[1] ماخوذ از "قومی آواز" لکھنؤ مورخہ ۱۵ ر دسمبر ۱۹۹۳ء

لیکن اس کا اندیشہ نہ تھا کہ اچانک حادثۂ وفات پیش آجائے گا، بمبئی سے واپسی پر دو تین دن لکھنؤ ٹھہر کر راقم رائے بریلی آیا تھا کہ ۲۹ نومبر کو صبح ۸ بجے کے قریب عزیزی محمد رابع سلمہ کا ٹیلیفون آیا کہ مہتمم صاحب کا انتقال ہوگیا اور بعد مغرب تدفین ہے[1]، یہ خبر قدیم رفاقت، ہم درسی، دارالعلوم کی خدمت اور انتظامات کے سلسلہ میں باہمی اعتماد اور تعاون کی بناپر، نیز ان کے اخلاق و اخلاص، بے نفسی اور دینداری کی بناپر دل و دماغ پر بجلی بن کر گری، اور راقم یہ خبر سننے کے بعد ہی بذریعہ کار اس طرح دارالعلوم پہنچ گیا کہ اس نے ظہر کی باجماعت نماز میں شرکت کی، اور عزیز ارجمند اشتیاق فرزند مولانا مرحوم سے تعزیت کی، بعد نماز مغرب نماز جنازہ ہوئی، یہ خدمت بھی اسی گنہگار کو ادا کرنی پڑی، پھر ڈالی گنج کے مقبرہ میں جہاں متعدد ندوی فضلاء و اہلِ تعلق (مولانا عبدالباری صاحب ندوی مرحوم صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی سابق مہتمم دارالعلوم کے والد محترم حافظ محمد الیاس صاحبؒ ناظم اوقاف بھوپال، مولانا محمد اسباط صاحب مرحوم و مولانا نورالحسن صاحبؒ استاد دارالعلوم اور فاضل عزیز مولوی عبدالنور صاحب (مولوی نورعظیم ندوی مرحوم) مدفون ہیں، پہنچ کر تدفین میں شرکت کی، جنازہ کی مشایعت کرنے والوں کا اتنا بڑا مجمع غالباً سالہاسال سے نہ ہوا ہوگا، مخصوص اہلِ شہر اور اہلِ تعلق کے علاوہ دارالعلوم کے تمام اساتذہ اور سب طلبہ جن کی تعداد کم سے کم دو ہزار ہوگی جنازہ کے ساتھ تھے۔

مولانا محب اللہ صاحب ندوی راقم کے درس حدیث اور دارالعلوم کے آخری

---

[1] مولانا کی عمر انتقال کے وقت ۸۶ سال تھی، ولادت ۱۹۰۷ء میں ہوئی اور وفات ۱۹۹۳ء میں۔

درجہ کے ساتھیوں میں تھے، وہ اس وقت بھی بڑے متواضع، باوقار اور تعلیم میں یکسو رہنے والے طلبہ میں تھے، دارالعلوم سے فراغت کے بعد وہ علی گڑھ گئے، اور وہاں سے انھوں نے پولیٹیکل سائنس میں ایم۔ اے پاس کیا، ان کے زمانۂ قیام علی گڑھ کے دوران بھی یہ راقم متعدد بار علی گڑھ گیا اُس وقت وہ اور ہمارے اور ان کے دوسرے ساتھی مولوی مصطفےٰ کریم صاحب ندوی ایم۔ اے میں پڑھ رہے تھے، اور آفتاب ہال میں دونوں مقیم تھے، آفتاب ہال کے اعزازی امام بھی تھے، وہاں بھی ان کی وضع قطع، فرائض کی پابندی اور عقائد وخیالات میں کوئی فرق نہیں آیا، بلکہ اس طرح کی روایات بھی سننے میں آئی ہیں کہ بعض طلبہ اس وقت جو کمیونزم سے متأثر ہو رہے تھے، ان کی گفتگو اور افہام وتفہیم سے راہ راست پر آئے اور ان کے خلاف مذہبی رجحانات میں تبدیلی آگئی۔[1]

علی گڑھ سے فراغت کے بعد انھوں نے کچھ عرصہ لار کے باشندوں اور برادری کے طرزِ عمل کے مطابق کانپور میں تجارت بھی شروع کی لیکن وہ جلد دل برداشتہ ہو گئے، اور انھوں نے دارالعلوم سے تعلق پیدا کر لیا، ۱۹۶۹ء میں ان کا بحیثیت مہتمم دارالعلوم کے انتخاب ہوا اور اپنی زندگی کے آخر تک وہ ذمّہ داری پر نیک نامی اور اعتماد و مقبولیت کے ساتھ فائز رہے، اور اسی ایک عظیم دینی و علمی مرکز کی ذمّہ داری کے دوران انھوں نے داغِ مفارقت دیا،[2] اور ان کے شرکائے کار، معاونین اور اساتذہ وطلبہ نے ان کی دیانت داری، بے آزاری اور حریفانہ کشمکش یا منصب سے ناجائز فائدہ

---

[1] یہ بھی معلوم ہوا کہ انھوں نے P.C.S کے امتحان میں بھی شرکت کی تھی، اور کامیاب ہو گئے تھے، لیکن جسمانی طور پر اور صحت کی کمزوری کی بنا پر ان کا انتخاب نہیں ہوا، اور یہ ان کے حق میں اچھا ہی ہوا۔ [2] اپنے پسماندگان میں تین فرزند اور ایک دختر کو چھوڑا۔

اٹھانے سے بیزاری کی شہادت دی اور وہ اسی مقبولیت اور اعتماد کے ماحول میں دارالعلوم سے جدا اور دنیا سے رخصت ہوئے، اور اپنے رفقاء کو جن کی بہت کم تعداد رہ گئی ہے، اور حلقۂ احباب کو جو (ان کے میدانی کاموں سے دور اور شہرت و عزّت حاصل کرنے سے نفور ہونے کی بنا پر) بہت وسیع نہ تھا داغِ مفارقت دے گئے۔ ؎

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

ایک المناک حقیقت اور اس کے ازالہ کے لئے امکانی جدّوجہد

جن قارئین کتاب کی ممالک اسلامیہ اور دول عربیہ (ممالک عربیہ) کے موجودہ حالات پر وسیع اور گہری نظر ہے، ان کو براہِ راست وہاں کا سفر کرنے اور کبھی کبھی متعدد بہ قیام کرنے کی نوبت آئی ہے، یا وہاں کے اخبارات و رسائل اور وہاں سے شائع ہونے والے لٹریچر پر ان کی مسلسل اور گہری نظر ہے اور اس کے ساتھ ان ملکوں کے "انتظامیہ" اور حکمراں جماعتوں یا قانون ساز اداروں کے رجحانات، اقدامات، اعلانات اور تشکیل نو کے منصوبوں اور عزائم سے واقف ہونے کا ان کو موقع ملتا ہے، وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ان ملکوں کے اصحابِ اقتدار (اور کسی حد تک قائدین واہلِ قلم) میں کچھ عرصہ سے "اسلامی اقتدار کے لئے جدّوجہد" سے ایک خوف وہراس، نزاکتِ احساس، جس کو ہم ادیانہ "توہّم" و"اختلاج" سے تعبیر نہ کریں تو ضرورت سے زیادہ "احساسِ خطر" اور "شدّتِ اندیشہ" سے تعبیر کرسکتے ہیں جس کو انگریزی میں (ALLERGY) اور عربی میں "حسّاسية زائدة" سے تعبیر کرتے ہیں، یہ طرز فکر اور نفسیاتی کیفیت بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ وہ اسلام کے حدود و تعزیرات کے نافذ

کرنے کے مطالبہ، معاشرہ کو اسلامی قالب میں ڈھالنے، نظامِ تعلیم، ذرائع ابلاغ، اور قانون سازی کو شریعتِ اسلامیہ کے تابع بنانے کی تحریک، و دعوت اور سعی وجدّ وجہد سے خائف ہونے پر منحصر نہیں رہ گئی ہے، کہیں کہیں عام دینداری، فرائض کی شدّت واہتمام سے پابندی، مغربی تہذیب کی اندھی تقلید سے بیزاری، بعض اہم اسلامی شعائر کے اعلان واحترام کے مظاہرہ و مطالبہ سے بھی خائف ہونے کی حد شروع ہو گئی ہے، اور اس حقیقت کے بنا پر بعض عرب ملکوں[1] کے وہ اعلانات واقدامات ہیں جن کا ذکر کرنے سے ندامت وشرمندگی کے علاوہ اس بات کا بھی اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ غیر اسلامی ملکوں اور خصوصاً برِّصغیر ہند میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی دینے میں فرق نہ پڑ جائے اور ان کے بعض فرائض شرعی اور قوانین اسلامی (مثلاً مسلمانوں کے اپنے عائلی قانون (PERSONAL LAW) پر عمل کرنے کی مخالفت اور اس کے بالمقابل ان کو غیر اسلامی قانون کے تابع بنانے مثلاً یونیفارم سول کوڈ (UNIFORM CIVIL CODE) کے نافذ کرنے کا جواز نہ پیدا ہو جائے جس کو مسلمانوں نے اپنی عمومی جدّ وجہد اور ہمہ گیر تحریک کے ذریعہ ناکام بنا دیا تھا، اور پارلیمنٹ نے سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف مسلمانوں کے عائلی قانون کی بقا اور تحفّظ کا فیصلہ کیا تھا، جس کی تفصیل اوپر کے صفحات میں گزر چکی ہے۔

اس غیر طبعی وغیر شرعی صورتِ حال کے پیدا ہونے کے متعدّد اسباب ہیں، جن میں سے یہاں چند کا ذکر کیا جاتا ہے:۔

۱۔ اوّلاً مغربی نظامِ تعلیم جس کے نتیجہ میں بالخصوص اونچے مراحل میں تعلیم پانے والے

---

[1] خصوصاً لیبیا، تونس، الجزائر اور کسی حد تک مصر۔

نوجوانوں میں (جن کے ہاتھ میں ملک کا اقتدار آنے والا ہے اور وہی عام طور پر کرسیِ حکومت پر متمکن ہوتے ہیں) اپنے دین، شریعت، تہذیب اور تاریخ کے بارہ میں احساس کہتری (INFERIORITY COMPLEX) کا پیدا ہونا، جو تعلیمی نصاب مغربی لٹریچر اور مستشرقین کی کتابوں کا (جو تحقیق و مطالعہ کا نقطۂ عروج سمجھی جاتی ہیں) لازمی نتیجہ ہے، اس مغربی نظام تعلیم کے مشرق اسلامی میں بے محل مصر بلکہ قاتل ہونے کی مثال اس سے بہتر نہیں دی جا سکتی جو ایک مغربی فاضل نے اپنی ایک کتاب میں لکھی ہے:

"ایک مشرقی حکایت غیر محتاط غیر ملکی تعلیمی مشیروں سے سرزد ہونے والی غلطیوں کی پوری تصویر کشی کرتی ہے، کسی زمانہ میں ایک بہت بڑا سیلاب آیا جس میں ایک بندر اور ایک مچھلی پھنس گئے، بندر تیز طرّار اور تجربہ کار تھا، لہٰذا ایک درخت پر چڑھ کر وہ سیلاب کی طوفانی موجوں سے محفوظ مقام پر جا بیٹھا، اب اس نے نیچے نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہے کہ غریب مچھلی امنڈتی ہوئی لہروں کے خلاف جدّوجہد میں مصروف ہے، پوری ہمدردی اور نیک نیتی کے جذبہ کے ساتھ وہ نیچے آیا اور اس نے مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا، پھر جو نتیجہ نکلا وہ ظاہر ہے۔"[1]

یہ مثال ان مشرقی اور اسلامی ملکوں پر پورے طور پر صادق آتی ہے، جنھوں نے مغربی نظامِ تعلیم کے نفاذ اور مغربی اقدار و معیار (VALUES AND IDEALS) کی مقبولیت اور تسلیم شدہ حقائق بننے کا

---

[1] (I. N. THUT ANDDON ADAMS : EDUCATION PATTERNS IN CONTEMPORARY SOCIETIES "MOGRAW HILL BOOK CO. NEW YORK. P. 63)

موقع دیا۔[1]

۲۔ اس کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام کی ہر عہد میں رہنمائی و قیادت کرنے کی صلاحیت، اور اس کی افادیت و ضرورت بلکہ تفوق و امتیاز ثابت کرنے بلکہ دل نشین بنانے کی اکثر ممالک اور بیشتر مدتِ حیات میں منصوبہ بند، مفکرانہ اور یقین افروز سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی، مختصر الفاظ میں اونچے پڑھے لکھے طبقہ میں اسلام کی صلاحیتِ بقا اور ہر عہد میں اس کی ضرورت پر نوجوان اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کا اعتماد بحال کرنے کی منظم، مؤثر اور عمر و ذہانت اور صلاحیتِ فہم کے مطابق کوئی عام مؤثر تحریک یا دعوت نہیں چلائی گئی، کچھ انفرادی و سطحی کوششیں ہوئیں اور کچھ محدود اور قلیل التعداد لٹریچر وجود میں آیا (جس کی قدر و قیمت کا انکار نہیں کیا جاسکتا) لیکن اس کو دعوت کا ایک عام میدان اور مؤثر کوششوں کا موضوع اور ہدف نہیں بنایا گیا،[2] جس کا نتیجہ حکمراں طبقہ، اہلِ قلم کی ایک بڑی تعداد، جامعات (UNIVERSITIES) کے پروفیسروں، دانشگاہوں کے ذمہ داروں، اور ذرائع ابلاغ پر اثر و تسلط رکھنے والوں کے ذہن، اسلام کی

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" کا باب "عالم اسلام میں تجدد و مغربیت کی تحریک" ص۵۴-۸۷ اور کتاب کا باب "مغربیت کے عالمگیر رجحان کے اسباب اور ان کا علاج" ص۲۴۲-۲۵۵۔

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" ص۲۴۲-۲۵۲ اور مصنف کا عربی رسالہ "الحاجة الی التركيز علی جانب حاسم فی مجال الدعوة" شائع کردہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

نشأۃ ثانیہ، اس کی صلاحیتِ قیادت بلکہ صلاحیتِ بقا کے بارہ میں بھی اگر مایوس نہیں تو متردّد و متشکک نظر آتے ہیں، اور جب یہ طبقہ منصب قیادت یا منصبِ حکومت پر متمکن ہو جاتا ہے تو وہ سیکولرزم (SECULARISM) "علمانیت" ہی کو مشکلات کا واحد حل اور اقتدار و حکومت کی بقا کا ضامن سمجھتا ہے، اور اس وقت یہی رجحان بہت سے مسلم ممالک اور چند عرب ممالک میں کام کر رہا ہے۔

۳۔ ایک اعتراف حق، اظہار حقیقت اور ایک مؤرخ و ناقد کے بے لاگ جائزہ کے تقاضہ سے اس حقیقت کا بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ اس صورتِ حال کے پیدا ہونے اور حکمراں و قانون ساز اور دانشور طبقہ کے دینی و دعوتی تحریکات اور اسلامی بیداری کی دعوت دینے والوں سے خائف و محتاط رہنے میں اس کو بھی دخل ہے کہ یہ تجربہ میں آیا ہے کہ ان میں سے بہت سی تحریکیں، اصلاحِ عقائد و اعمال، رجوع إلی اللہ، تمسک بالشریعہ اور عمل بالدین کے لئے شروع ہوئیں لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ سیاست کے میدان میں آ گئیں اور انھوں نے (نیک مقاصد کے ساتھ سہی) حکومت و اقتدار پر قبضہ کرنے اور ملک کی زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش شروع کر دی اور ان کا براہِ راست حکومتوں سے تصادم ہو گیا۔

یہ اسی غلط اندیشی کا نتیجہ ہے جس کو راقم السطور نے اپنے عربی سفرنامۂ یمن[1] میں ایک یمنی عالم کے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:۔

"راستے دو ہیں ایک یہ کہ ایمان کرسی والوں (صاحبان اقتدار و اہلِ حکومت) تک پہنچ جائے اور وہ ملک، معاشرہ میں دین کی نمائندگی کریں، اسلامی زندگی

[1] یہ کتاب "نفحات الایمان بین صنعاء و عمان" کے نام سے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

پیدا کرنے کی کوشش کریں اور شریعت کے احکام کا نفاذ کریں، اور دیندار لوگ اور اہلِ علم کا طبقہ ان کی حمایت و نصرت کرے اور ان کے لئے دعاگو رہے، لیکن وہ کسی بڑے منصب اور اس سے بڑھ کر حکومت کے حصول کی کوشش نہ کرے، دوسرا طرزِ فکر اور طرزِ کار یہ ہے کہ اہلِ ایمان (دینی دعوت دینے والے اور اسلامی تحریکوں کے قائدین) خود کرسیوں تک پہنچ جائیں اور حکومت و اقتدار کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آجائے، پہلا طرزِ فکر اور طرزِ عمل مثبت نتائج پیدا کرنے والا اور اہلِ دین و اہلِ حکومت کو براہِ راست ٹکراؤ سے بچانے والا ہے، دوسرا طرزِ فکر اور طرزِ عمل (براہِ راست کرسیِ حکومت پر متمکن ہو جانے کی کوشش اور ہدف) مشکلات پیدا کرنے والا، اہلِ دین ہی نہیں بلکہ دین سے ٹکر لینے اور اس سے خائف اور متوحش ہونے پر آمادہ کرنے والا ہے"۔

انھوں نے فرمایا "میں نے آپ کی کتابوں سے یہی سمجھا ہے کہ آپ پہلے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو (ایمان کے کرسیِ حکومت تک پہنچ جانے کی کوشش اور صاحبِ اقتدار طبقہ کو دین کی حمایت و نصرت پر آمادہ کرنے کی سعی) بہت سی غیر ضروری مشکلات اور حکومت کی دین سے معرکہ آرائی سے بچانے والا سمجھتے ہیں، دوسرا طرزِ فکر و طرزِ کار صدہا مشکلات کا پیدا کرنے والا اور ایک ایسی جنگ آزمائی و محاذ آرائی کی فضا پیدا کرنے والا ہے جس میں توانائی اور وقت کا ضیاع ہے اور دینی مستقبل کو مشکوک بنانے والا ہے"۔

راقم نے عرض کیا کہ اس عاجز کا بالکل یہی خیال ہے، اور ہندوستان کے مصلحِ اعظم مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (متوفی ۱۰۳۴ھ) کا یہی طرزِ کار تھا، جس نے

ہندوستان کی مسلم سلطنت کے مغلیہ خاندان میں انقلاب پیدا کر دیا اور سلطان جلال الدین اکبر (متوفی ۱۰۱۴ھ) سے لے کر (جو ہندوستان کو کھلے طور پر برہمنیت، اور ہندو تہذیب اور مخالف اسلام عقائد کی طرف لے جا رہا تھا) سلطان محی الدین اورنگ زیب عالمگیر (متوفی ۱۱۱۸ھ) تک (جن کو بعض اہلِ نظر نے "چھٹا خلیفۂ راشد" کے لقب سے یاد کیا ہے) مسلسل انقلاب آتا رہا، اور ہر تخت نشین کے بعد اس کا جانشین اس سے بہتر ہوتا رہا، یہاں تک کہ ہندوستان اس عمومی خطرۂ ارتداد سے بچ گیا جس کا ڈر اکبر کے اقدامات واحکام اور عزم اور منصوبہ سے پیدا ہو گیا تھا۔[1]

ایک اظہارِ حقیقت اور احتسابِ نفس کے تقاضے سے اس کا اعتراف کیا جاتا ہے کہ بہت سی دینی دعوتوں اور تحریکوں نے اس معاملہ میں عجلت سے کام لیا اور ان کے قائدین کے بعض اقدامات و اعلانات، اور اس سے زیادہ ان کے تابعین اور ترجمانوں نے غیر ضروری طریقہ پر بعض اسلامی حکومتوں کو اپنا حریف بنا لیا، بعض اسلامی و عرب ملکوں میں اسی چیز نے ان کو اسلامی بیداری اور اسلام و دین کے نام پر جماعت سازی سے خائف بنا دیا، جن کا اثر و رسوخ ان ملکوں میں بڑھتا جا رہا تھا، یہاں تک کہ جماعت کو خلاف قانون قرار دینے اور اس کے ارکان کے قید و بند کا مرحلہ پیش آگیا، شہادت بالحق کے طور پر کہا جاتا ہے کہ اس میں ان جماعتوں اور ان کے قائدین کا قصور کم، اہلِ حکومت کے توہّمات کا جس کو کسی شاعر نے اس بلیغ مصرعہ میں ادا کیا ہے۔ ع

عشق است و ہزار بدگمانی

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" کا حصّہ چہارم

کا حصہ زیادہ تھا لیکن بہرحال اس تجربہ سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے اور اس کی روشنی میں غیر ضروری مشکلات کے پیدا ہونے بلکہ حکومتوں کو اسلام کا حریف اور دین و شریعت کے ادنیٰ نفاذ کا مخالف اور دعوت و اصلاح کے کام کو آزادانہ طریقہ پر انجام دینے کے مواقع کو ختم کرنے والا انہیں بنانا چاہیے۔

۴۔ اسلامی بیداری، دین و شریعت کی ترویج و اشاعت اور حکومتوں کے اسلام سے کھلے ہوئے انتساب بلکہ افتخار سے خائف ہونے اور علمانیت (SECULARISM) کا میلان پیدا کرنے میں امریکا کی بالواسطہ اور بلاواسطہ کوششوں کو بھی بڑا دخل ہے، اس نے روس کے انقلاب اور کمیونزم (COMMUNISM) کے زوال کے بعد اسلام ہی کو اپنا حریف اور اپنے عالمی اقتدار کے راستہ میں سب سے بڑا خطرہ اور سدِّ راہ سمجھ لیا ہے، اور اس نے دوسرے ذرائع ابلاغ اور سیاسی تدبیروں سے کام لینے کے بعد اب اصول پسندی، عقیدہ کے استحکام اور دینی و دنیوی معاملات میں دین و شریعت کو حَکَم سمجھنے اور بنانے کے خیال و عقیدہ (جس کو وہ (FUNDAMENTALISM) کے نام سے یاد کرتا ہے) کے خلاف عالمگیر پیمانہ پر پروپیگنڈہ شروع کر دیا ہے اور بعض ایسی زبانوں سے بھی اس کی ناپسندیدگی اور اس پر تنقید کا کام لیا ہے جس کی بالکل توقع نہیں تھی۔ ع

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑے زمانہ میں

اب ہم ان "روشن خیال" اور "ترقی پسند" اسلامی ملکوں کے ذمہ داروں اور اصحابِ اقتدار سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس اصول پسندی، عقیدہ و اصول کی پابندی پر تنقید کرنے اور اس سے بے اطمینانی کا اظہار کرنے اور ایسی دعوت و کوشش

کے (جن میں یا تو کھلے طور پر "علمانیت" (SECULARISM) کا اظہار ہو یا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے) نتائج خود ان کے لئے اور ان کے ملک و معاشرہ کے لئے بڑے پرخطر اور مضر ہوں گے، وہ بہت بڑی طاقت اور دولت سے محروم ہو جائیں گے اور بے ضرورت مشکلات و مصائب کا ان کو سامنا کرنا پڑے گا۔

۱۔ پہلی اور اساسی بات تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس نصرت و حمایت سے محروم ہو جائیں گے جو دین کی نصرت و حمایت اور اعلاء کلمۃ اللہ کے ساتھ مشروط ہے۔

إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ۔ (سورۂ محمد۔ ۷)	اگر تم خدا کی مدد کروگے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تم کو ثابت قدم رکھے گا۔
وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ (سورۂ حج۔ ۴۰)	اور جو شخص خدا کی مدد کرتا ہے خدا اس کی ضرور مدد کرتا ہے۔
كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ۔ (سورۂ بقرۃ۔ ۲۴۹)	بسا اوقات تھوڑی سی جماعت نے خدا کے حکم سے بڑی جماعت پر فتح حاصل کی ہے۔

ان کا ملک اور ان کا دائرۂ حکومت اس سب سے بڑی طاقت اور دولت سے محروم ہو جائے گا جس نے باوجود قلتِ تعداد، بے بضاعتی اور بے سروسامانی کی دنیا کا نقشہ بدل دیا، بازنطینی سلطنت کا چراغ ایک طرف، اور ساسانی شہنشاہی کا چراغ دوسری طرف گُل کر دیا، کتنے ملک جن کی سیکڑوں برس کی تہذیب، جنگی تجربہ اور جنگی ساز و سامان تھا، ان پر فتح حاصل کی، ان کو حلقہ بگوشِ اسلام بنایا، وہاں کی زبان و تہذیب کو اسلامی سانچہ میں ڈھال دیا، اور صدیوں تک ان پر حکمرانی کی اور

اب بھی کثیر التعداد ملکوں پر حکمرانی کر رہے ہیں، وہ دولتِ ایمان، شوقِ شہادت، جذبۂ جہاد اور حمیّت دینی تھی جس کا سرچشمہ اللہ اور اس کے رسول کے ارشادات پر یقین، آخرت پر ایمان، اور جنت کا شوق تھا اور جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے :-

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ ۖ إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ ۖ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ (سورۃ النساء - ۱۰۴)	اور کفار کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرنا، اگر تم بے آرام ہوتے ہو تو جس طرح تم بے آرام ہوتے ہو اسی طرح وہ بھی بے آرام ہوتے ہیں، اور تم خدا سے ایسی ایسی امیدیں رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھ سکتے، اور خدا سب کچھ جانتا اور بڑی حکمت والا ہے۔

اور یہ وہ خلا ہو گا جس کو کوئی چیز پُر نہیں کر سکتی، اور وہ خسارہ جس کی تلافی کسی قوتِ دفاع، جدید اسلحہ اور بڑے ملکوں کی سرپرستی بھی نہیں کر سکتی وذلك هو الخسران المبين

۲ - اس غیر دینی رجحان، دین اور اہلِ دین سے عدم مناسبت بلکہ وحشت اور اپنے ملک و قوم کے سامنے (سیدنا عمر بن عبد العزیز، سلطان صلاح الدین ایوبی اور اورنگ زیب نہ سہی) ایک صاحبِ حمیت مسلمان اور پابندِ شرع حکمراں اور دین و اہلِ دین کے قدرداں کی حیثیت سے نہ آنے سے ان کو اعتماد و محبوبیت کا اور جذباتی طور پر حمیّت و حمایت کا وہ فائدہ اور طاقت حاصل نہ ہو گی جو ایسے حکمرانوں کو حاصل ہوتی ہے اور جس سے وہ بڑی بڑی مشکلات پر قابو پاتے ہیں اور ان کے لئے بے دریغ جانیں دی جاتی ہیں وصدق الله العظيم

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا ۝ (سورۂ مریم ۔ ۹۶)

اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کئے خدا ان کی محبت (مخلوقات کے دل میں) پیدا کر دے گا۔

اس کے برعکس ملک میں سازشیں ہوں گی، ان کو ناکام بنانے اور ان کا بدل مہیّا کرنے کے خفیہ منصوبے بنائے جائیں گے اور ان کی بڑی توانائی اور وقت ان سازشوں کے پتہ چلانے مخالفین کا سراغ لگانے اور ان کو محبوس یا شہر بدر کرنے میں صرف ہوگا، اور ایسے موقع پر کوئی بڑا ملک یہاں تک کہ امریکا بھی ان کی مدد نہیں کر سکے گا۔

اب ہمارے بیدار مغز اور حقیقت شناس حکّام سلطنت، صاحبِ اقتدار طبقہ اور ملک و معاشرہ کا سانچہ ڈھالنے والوں کو غور کرنا چاہیے کہ ان دونوں متقابل راستوں میں سے (صدق و اخلاص، ایمان و حمیّتِ اسلامی، شریعت کے نفاذ، نئی نسل کو اسلامی الفکر و اسلامی العمل بنانے کا کام؟ یا اس کے مقابلہ میں لامذہبیت و علمانیت غیر محدود و غیر مشروط روشن خیالی و ترقی پسندی، مغرب کی تقلید و نقالی، اور کسی بڑی سے بڑی طاقت اور ملک کی غاشیہ برداری) زیادہ مفید و بہتر ہوگی؟

یہ حقائق ہیں جن کو ان ملکوں کے قائدین، اصحاب اقتدار، اور علم و فکر کے علم برداروں ذرائع ابلاغ کے ذمّہ داروں اور علم و ادب فکر و تحقیق کے اجارہ داروں تک پہنچانے کی ضرورت ہے اور یہ وقت کا اہم ترین فریضہ، ممالک اسلامیہ و عربیہ کی اہم ترین خدمت اور تبلیغ و دعوت کا مؤثر ترین اور اہم ترین شعبہ ہے، اس کو نظر انداز کرنے اور اس کی اہمیت نہ سمجھنے سے خطرہ ہے کہ یہ ممالک لامذہبیت اور کھلے ہوئے (اعتقادی نہیں تو ذہنی، فکری اور تہذیبی) ارتداد تک نہ پہنچ جائیں جس کی

ان ممالک کے اسلاف کے مبلّغانہ اور مجاہدانہ، مومنانہ اور زاہدانہ کارناموں سے جو تاریخ میں محفوظ ہیں اور جن کی برکت سے ملک کے ملک مسلمان اور متبع شریعت ہوئے امید نہیں، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ وہ ان کو ان حقائق کی سمجھ عطا فرمائے گا، اسلام کی قدر بخشے گا، اور پھر صراطِ مستقیم کی طرف اور اپنے اسلاف کی سیرت و نمونہ کی طرف آنا ہوگا اور وہ اس عہد میں وہ کردار ادا کریں گے جو ان کے اسلاف نے ادا کیا جس کی اس وقت دنیا کو سخت ضرورت ہے اور وہی اس عہد کا سب سے بڑا خلا ہے:-

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ اِيمَانَكُمْ — اور خدا ایسا نہیں کہ تمھارے ایمان کو
اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ — یوں ہی کھو دے، خدا تو لوگوں پر بڑا
رَّحِيمٌ (سورۂ بقرہ۔۱۴۳) — مہربان (اور) صاحبِ رحمت ہے۔

لیکن بہر حال یہ اہلِ دعوت و حمیّت دینی کا فرض ہے کہ یہ حقائق اور یہ تأثرات ان قائدین ممالک اسلامیہ و عربیہ، اہلِ اقتدار، اہلِ قلم اور اہلِ فکر تک پہنچائے جائیں۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ[1]

---

[1] یہ مضمون اسلوب کے فرق اور تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ پہلے عربی میں لکھا گیا تھا، اس کو اس موضوع کے مخاطبین تک پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

INDEX

اشاریہ

"کاروانِ زندگی حصہ پنجم ۵"

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

ع

(ن)

طبقات وخاندان

کتابیات

مقامات

(ب)

(پ)

(ت) (ٹ)

(ج) (چ)

متفرقات

مساجد و معابد:

جامعات، مدارس و دیگر تعلیمی ادارے:

تحریکات، جماعتیں، سوسائٹیاں اور کمیٹیاں:

عقائد، نظریات، مذاہب و قضایا:

علمی، تحقیقاتی و نشریاتی ادارے اور کتب خانے و مطابع:

اجلاس، سمینار و کانفرنسیں:

حوادث، جنگیں، اہم وتاریخ ساز واقعات: